لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات

ڈاکٹر محمد نوشاہی

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

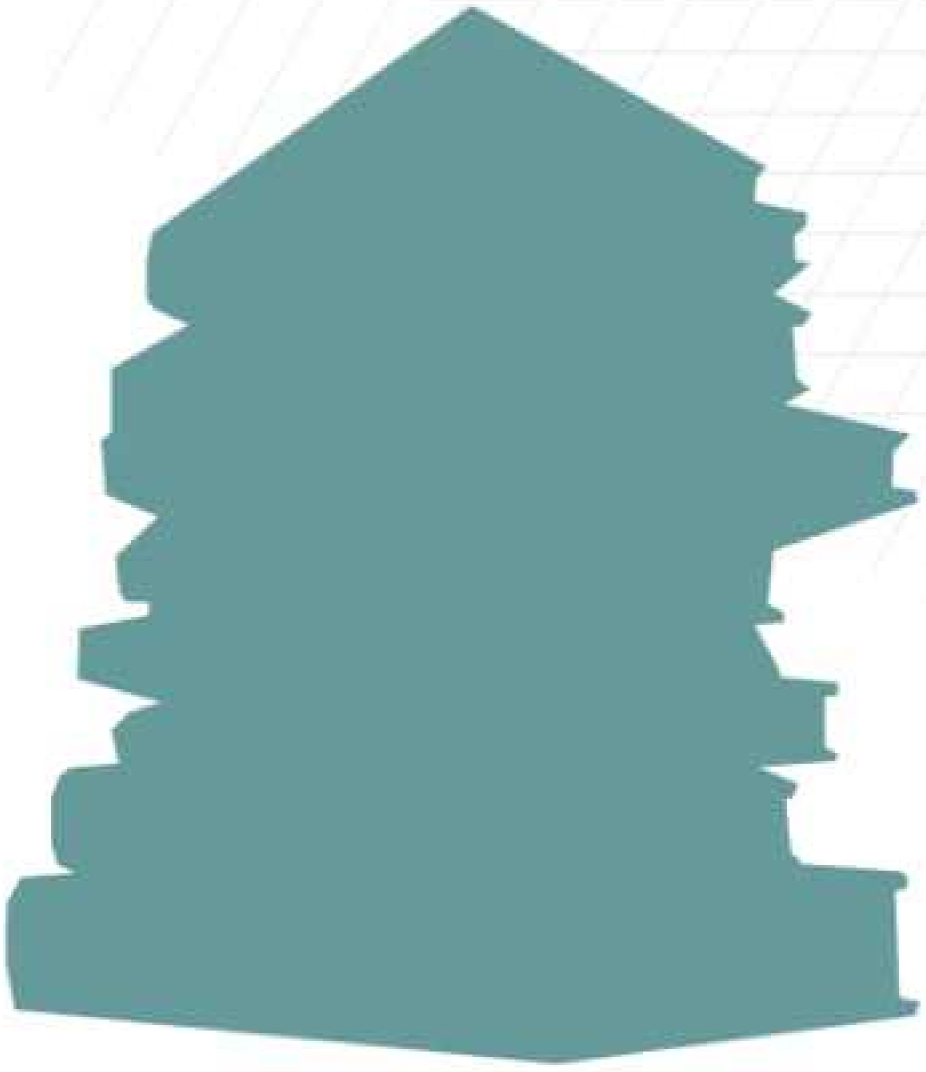

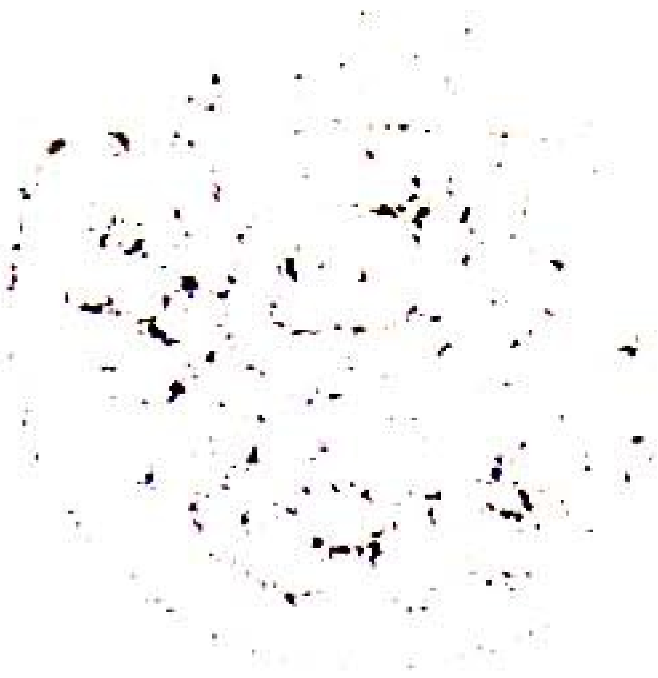

لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۴۷

جملہ حقوق محفوظ

130143

دسمبر ۱۹۹۳ء

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی
جنرل سیکرٹری
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
۹۳۔۷ این سمن آباد لاہور

مطبع: ظفر سنز پرنٹرز
شمع پلازہ فیروز پور روڈ لاہور

تعداد اشاعت: ۵۰۰

صفحات: ۳۳۶

قیمت: ۴۰ روپے

نوٹ: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے اس کتاب کے مالی وسائل مہیا کرکے اس کی اشاعت کو ممکن بنایا۔

برادرِ مشفق جناب مشفق خواجہ کے نام

[illegible]

پیش لفظ

سوانح تاریخ اور ادب و ثقافت اس کتاب کے عناصر اربع ہیں۔ ان عناصر کو اس حسن و خوبی سے یک جان کر دیا گیا ہے کہ کبھی خیال آتا ہے یہ سلسلہ سوانح ہے اور کبھی یہ تاثر ملتا ہے کہ ادبی اور ثقافتی زندگی کی جھلک ہے۔ یہ اس پر ہنگام دور کی تصویر ہے جب مسلمان درماندہ و پس ماندہ ہو چکے تھے۔ لیکن علم و ہنر کی کرنیں اس اندھیرے میں بھی کہیں کہیں جھلملاتی کرتی نظر آتی ہیں۔ تاریخ کو سوانح کے پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ خاصا مشکل کام ہے۔ تاریخ اور سوانح ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں ان دونوں کو مرکز توجہ میں رکھنا کافی مشکل ہے۔ اس میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ سوانح نگاری صرف اسباب و علل کا تجزیہ یعنی کہ تاریخ نہ بن جائے اور اگر سوانح سے شخصی عنصر نکل جائے تو سوانح اور شجرہ نسب میں زیادہ فرق نہیں رہتا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس فرق کو اچھی طرح سے سمجھا دیا ہے اور نہایت قابلیت سے سوانح نگاری اور تاریخ کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ لیکن ان کے سامنے کسی ایک عظیم ہستی کی زندگی نہیں تھی بلکہ انہیں چشتی خاندان کی اُردو خدمات کا احاطہ کرنا تھا۔ مان لیا کہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تحقیق و ژرف نگاہی کا حق ادا کر دیا ہے اور انہیں اس کے صلہ میں ڈاکٹریٹ مل گئی ہے۔ لیکن میرے جیسے قاری کو تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ آخر اُردو کی خدمات ہی کیوں؟ پنجابی کی خدمات کیوں نہیں؟ اور پھر سیاسی خدمات کیوں نہیں؟

یہ اس لئے نہیں شامل کی جاسکیں کہ تحقیقی مقالے کے تقاضے بڑے معین اور چوکھٹے واضح ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نوشاہی صاحب محض یہ کتاب لکھ کر سرخرو ہو گئے۔ اصل قرض تو ابھی ان کے ذمہ ہے۔ اس کتاب سے تو انہوں نے یہ نشاندہی کی ہے کہ ان کے پاس معلومات کے بھرپور خزینے ہیں اور وہ تصنیف و تحقیق کی اعلیٰ صلاحیت کے مالک ہیں۔ ذاتی طور پر تو مجھے ان سے اٹھارویں اور ابتدائی انیسویں صدی کے پنجاب کی سیاسی، ادبی، علمی اور معاشرتی تاریخ اور شخصیات پر ایک نہیں کئی کتابوں کی توقع ہے۔ بسم اللہ وہ عشاقِ سینہ چاک کے زمرہ میں شامل ہوئے ہیں ان کے ذوق و جنون کو کئی دشت بے نام دعوت دے رہے ہیں۔ دیکھیں اب نئے مردانگن شوق کا کون حریف ہوتا ہے۔؟ پنجابی اہل علم و اہل قلم حضرات نے اپنی تمام تر تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتیں اُردو کے لئے وقف کر رکھی ہیں اور اپنی مادری زبان اور ثقافت کے بارے میں مجرمانہ بخل سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس تناظر میں پنجابی ادب و ثقافت اور تاریخ پر کام کرنے والوں کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اوّلین تاثر یہ ملتا ہے کہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے چشتی خاندان کے ممتاز افراد کا تذکرہ رقم کیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست سہی لیکن زیرِ نظر کتاب کا احاطہ وسیع تر ہے اور اس کا مرکزی نقطہ چشتی خاندان کی اُردو خدمات ہیں۔ مگر اس کتاب کا پس منظر بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس کا پیش منظر۔

چشتی خاندان پنجاب کی سیاسی اور علمی سٹیج پر اس وقت نمودار ہوا جب پنجاب کے مسلمان صوبیداروں کی قوت مسلمانوں کے باہمی نفاق، سکھوں کی روز افزوں فوجی برتری اور غیر ملکی حملوں سے پامال ہو چکی تھی۔ عام طور پر تاریخ دان سیاسی مدوجزر کی عکاسی میں مصروف رہتے ہیں اور عوام کے درد اور کرب سے بے اعتنائی برتتے ہیں مگر

مگر اس کتاب کے سیاسی پس منظر میں ہمیں پنجاب کے عوام کی دُکھ بھری تصویریں نظر آتی ہیں۔ نادر شاہ نے پنجاب اور دہلی میں قیامت برپا کر دی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی اہمیت مسلم ہے۔ جس کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کو مرہٹوں کے اقتدار سے نجات ملی اور عارضی طور پر سکھوں کی طاقت بھی کمزور ہو گئی۔ مگر احمد شاہ ابدالی اور اس کے عمال نے غریب عوام پر قافیہ حیات تنگ کر دیا۔ لاہور اور دہلی میں قتل عام کا تذکرہ تو بیشتر کتابوں میں ملتا ہے مگر عوام کے ردعمل کی جھلک کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ کاوش اس لحاظ سے گرانقدر ہے کہ ڈاکٹر نوشاہی نے پنجاب کے عوام کی داستان الم کی تصویر مختلف ادبی حوالوں سے مرتب کی ہے۔

پنجاب کے عوام کی نفرت اور غم و غصے کا اظہار عصری ادب سے ہوتا ہے۔ نادر شاہ نے لاہور میں قتل و غارت کا بازار تو گرم نہ کیا لیکن اتنا بھاری تاوان وصول کیا کہ نواب زکریا خان کی حکومت مالی طور پر دیوالیہ ہو گئی۔ اس نامساعد واقعہ کا ذکر مولوی ضیاالحق چشتی نے یوں کیا ہے:

نادر آمد بہند در یکدم — کرد بر خلق ظلم و جور و ستم
سالِ تاریخ او دو تا آمد — غمِ عام است و نیز چند قدم

اس میں "غم عام" کی ترکیب قابل غور ہے۔ بعد میں احمد شاہ ابدالی نے بھی لاہور کو خوب لوٹا جس کی وجہ سے عام لوگ حملہ آوروں سے سخت نفرت کرنے لگے۔ جس کی جھلک تحائفِ قدسیہ کے مصنف پیر کمال لاہوری کے اشعار میں ملتی ہے۔ جس میں غارتگروں کو سوروں کے ریوڑ سے تشبیہ دی جو شاداب کھیتوں میں گھس آیا ہے۔ عصری ادب میں ماحول کو یادگر زندہ کر دکھانا کوئی معمولی بات نہیں اور اس مقصد کے لئے تاریخ گوئی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مثلاً نواب عبدالصمد خان متوفی ۱۱۳۹ھ

کی تاریخ وفات مولوی ضیا الحق چشتی نے نہایت نادر انداز میں کہی ہے ۔ "صمد ماند عبدالصمد نہ ماند" ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ادب اور تاریخ کو یوں یک جان اور ہم آہنگ کر دیا ہے کہ کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ تاریخ ادب کی کتاب ہے اور کبھی یہ خیال آتا ہے کہ یہ تاریخی ادب کا مرقع ہے ۔

چشتی خاندان کی سوا دو سو سالہ تاریخ میں یکے بعد دیگرے کئی اہلِ علم، شاعر، ادیب اور مؤرخ پیدا ہوئے ۔ ان کے ادبی کارنامے اس کتاب کا موضوع ہیں مختلف شخصیات کی بوقلموں خصوصیات کا موازنہ اور محاکمہ کرتے وقت تحقیق کا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور ایسے نادر مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے جو بیشتر ریسرچ سکالروں کی نظر سے اوجھل ہیں ۔ اس ضمن میں مولوی احمد بخش یکدل کا روزنامچہ خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ یہ روزنامچہ گویا مولوی یکدل کی آپ بیتی اور چالیس مختصر برسوں کی غیر رسمی تاریخ ہے ۔ اس میں سیاسی، معاشی، خاندانی اور رسمی حالات کے علاوہ بازار کے نرخ بھی درج ہیں ۔ یہ عصری تاریخ کا گرانمایہ ماخذ ہے ۔ بیاض یکدل شگفتہ شاعری کا مجموعہ ہے ۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے مولوی یکدل کو چشتی خاندان کا معنوی مورث اعلیٰ قرار دیا ہے ۔ اگرچہ دیگر اہلِ کمال کے تذکرے بھی علم و حکمت کے خزینے ہیں لیکن میں مولوی محرم علی چشتی کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ مرحوم انیسویں صدی کے اواخر میں پنجاب کے ممتاز سیاسی راہنما کی حیثیت سے ابھرے ۔ پہلے وہ سر سیّد احمد خان کی تعلیمی تحریک سے بددِل ہو گئے پھر سید امیر علی سے رابطہ قائم کیا اور لاہور میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور اسے ایک متحرک اور فعال تنظیم بنا دیا ۔ ۱۸۸۸ء میں جب سید امیر علی نے آل انڈیا مسلم پولیٹیکل کانفرنس کی تجویز پیش کی تو سر سید احمد خان اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے لیکن محرم علی چشتی سیّد

امیر علی کے پرجوش حامی اور سرگرم معاون ثابت ہوئے۔ محرم علی چشتی اور سید احمد خان کے درمیان اس مسئلہ پر نزاع بڑی سنگین صورت اختیار کر گیا۔ ذاتی رنجشوں سے قطع نظر ان کی جنگ دو متصادم اصولوں کی آویزش تھی۔ سرسید احمد خان سیاست کو مسلمانوں کے لئے شجر ممنوعہ سمجھتے تھے اور چشتی اپنے قائد امیر علی کی طرح سیاست کو معاشی اور تعلیمی ترقی کے لئے ناگزیر قرار دیتے تھے۔ راقم الحروف نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب (POLITICAL BIOGRAPHY OF SYED AMEER ALI) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے محرم علی چشتی کے سیاسی کردار کے علاوہ ان کی علمی اور ادبی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب کی یہ گرانقدر کاوش تاریخ و ادب کے ماہرین اور شائقین کے حلقوں میں داد و تحسین پائے گی۔

اسلام آباد — (ڈاکٹر) محمد یوسف عباسی

مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۹۰ء

فہرستِ مطالب

مقدمہ	۱۲
باب اول ـــــ تاریخی اور سیاسی پس منظر	۱۹
باب دوم ـــــ خاندانِ چشتی کا علمی و ادبی ماحول	۸۳
الف : ہمعصر مؤرخین	
ب : معاصر اخبارات و مطالعہ	
ج : ہم زماں شاعری اور نثر	
باب سوم ـــــ خاندانِ چشتی	۱۲۳
باب چہارم ـــــ چشتی خاندان کے اہم مصنّفین	۱۵۹
باب پنجم ـــــ خاندانِ چشتی کی اہم اردو تصانیف	۲۱۷
باب ششم ـــــ چشتی خاندان کے ادبی و تہذیبی اثرات	۲۷۷
ماٰخذ و مصادر	۲۸۹
ضمائم	
۱۔ انتخاب از تحفۂ یکدل	۲۹۹

۲۔ انتخاب از بیاضِ یکدل ۳۰۷

۳۔ انتخاب از تحقیقاتِ چشتی ۳۱۴

۴۔ انتخاب از یادگارِ چشتی ۳۱۹

۵۔ اہم دستاویزات کے عکس ۳۲۱

مقدمہ

لاہور کے چشتی خاندان پر میرے تحقیقی سفر کی داستان بہت طویل ہے۔ مولوی نور احمد چشتی کی تصنیف "تحقیقاتِ چشتی" کا مطالعہ میں نے ۱۹۶۰ء میں اپنے والد صاحب قبلہ کے ارشاد پر کیا تھا اور اُسی وقت سے اس اہم علمی کارنامے کی عظمت میرے دل پر نقش تھی۔ ۱۹۶۸ء میں مجلس ترقیِ ادب لاہور کی ملازمت کے دوران اسی مصنف کی ایک گمنام کتاب "یادگارِ چشتی" کی ترتیب و تدوین کا کام میرے سپرد ہوا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ مولوی نور احمد چشتی اور ان کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی مستند ماخذ دستیاب نہیں ہے۔ تلاش و جستجو کی لمبی مسافت طے کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں اس کا مقدمہ لکھا گیا اور ۱۹۷۵ء میں یہ کتاب چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔

مولوی نور احمد چشتی اور ان کے خاندان کے سوانحی کوائف سوائے تحقیقاتِ چشتی میں شامل مصنف کے خود نوشت چند نکات کے مطبوعہ صورت میں کہیں دستیاب نہ تھا۔ اتفاق سے میری ملاقات اس خاندان کے ایک ایسے فرد سے ہو گئی جسے اس خاندان کے بارے میں معلومات کا جیتا جاگتا خزانہ کہا جا سکتا تھا۔ یہ بزرگ مولوی نور احمد چشتی کے بھائی مولوی محمد علی پُردل چشتی کے پڑپوتے مولوی مسعود علی چشتی تھے۔ خدا نے ان سے بصارت چھین کر انہیں بصیرت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ غیر معمولی ذہانت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی شخصیت کے بھی مالک ہیں،

صمیم القلب، کریم النفس اور دریا دل، ایسے خوش وضع انسان کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ انہوں نے اپنا سارا علمی خزانہ میرے حوالے کر دیا۔ چونکہ کئی سال پہلے بصارت سے محروم ہو گئے تھے، لہٰذا ان کا پورا کتاب خانہ سالہاسال سے بند رہنے کے سبب حوادثِ گرد و خاک کی نذر ہو چکا تھا۔ میں کامل دو ماہ زہر آلود گرد و خاک ہٹا کر اوراقِ بوسیدہ اور مخطوطات آب دیدہ کا مطالعہ کرتا رہا۔ نتیجۃً مجھے اس قدر مواد مل گیا کہ اس سے نہ صرف یہ کہ میں یادگارِ چشتی کا مقدمہ لکھنے کے قابل ہو گیا بلکہ وہ اس قدر زیادہ تھا کہ میں نے اس خاندان کی اردو خدمات پر مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

یادگارِ چشتی کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد میں نے اس خاندان پر وسیع تر تحقیقی کام کے لیے پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے کی اجازت چاہی۔ میرے خاکے کو منظور کرتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی نے مجھے مقالہ لکھنے کی اجازت دے دی لیکن جب نئی صورت حال کے مطابق کام شروع ہوا تو اندازہ ہوا کہ میرے پاس اب بھی میری ضرورت کے مقابلے میں مواد بہت کم ہے۔ لہٰذا از سرِ نو خاندانِ چشتی کے متعلقین اور بستگان سے رجوع کیا گیا۔ اس دفعہ میرے پرانے ہمدرد مولوی مسعود علی چشتی صاحب نے اپنے کتاب خانے کی مزید چھان بین کرنے کی اجازت کے ساتھ ایک اور شخصیت کی طرف بھی رہنمائی کی جن کے پاس چشتی خاندان کے اسلاف کا علمی ذخیرہ تھا۔ چنانچہ میں محترمہ پروفیسر قرۃ العین چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ اس خاندان کی بعض اہم دستاویزات تو ان کے پاس موجود ہیں لیکن ان تک رسائی ممکن نہیں۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے نصب العین کے ساتھ پیوستہ رہا۔ چنانچہ پانچ سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد اب میں اس بات کو وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ چشتی خاندان کے بارے میں جس قدر مواد میرے پاس ہے کسی اور کے پاس موجود نہیں ہے۔ مولوی مسعود علی چشتی صاحب کے وسیلے سے اس خاندان کے باعثِ ممتاز بزرگ مولوی احمد بخش یکدل کے چالیس سالہ روزنامچے "بیاضِ یکدل" کا انتخاب ملا تھا جسے مصنف کے پوتے اور مولوی مسعود علی صاحب کے دادا مولوی

حامد علی چشتی صاحب نے تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ مولوی نور احمد چشتی کی دو ایک نایاب کتابیں بھی دستیاب ہوئیں لیکن تلاش نو کے ساتھ یکدل کی بیاضوں کے مواد کی تفصیل اور اس خاندان کے تقریباً تمام علمی اور ادبی آثار پر دسترس ہو گئی۔ بے شمار نے نام اور ان کے ادبی آثار دستیاب ہوئے۔ گویا پہلے اگر مواد کی کمی مسئلہ تھی تو اب مواد کی فراوانی مشکل پیدا کر رہی تھی کہ نظم و ترتیب کے وقت کن کن پہلوؤں کو نظر انداز کیا جائے۔

چشتی خاندان کا ایک بہت بھاری علمی و ادبی ذخیرہ مرحوم مولوی محرم علی چشتی ایڈیٹر رفیقِ ہند لاہور کے فرزندِ ارجمند مولوی ابراہیم علی چشتی کی وفات کے بعد گرامی قدر م۔ش صاحب کے پاس آ گیا تھا۔ م۔ش صاحب نے بزرگواری کا ثبوت دیا اور ازراہِ ادب پروری مجھے اس ذخیرے سے استفادہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اخبار "رفیقِ ہند" کے متعدد فائل اور مولوی محرم علی چشتی کے بارے میں معلومات ان کے پاس موجود تھیں۔ میں نے ان میں سے اکثر کے مکمل فوٹو سٹیٹ حاصل کر لیے۔ غرضیکہ اسی حاصل شدہ مواد کو بروئے کار لاتے ہوئے مولوی ضیاء الحق چشتی سے مولوی منصور علی چشتی تک خاندان کے اہم مصنفین کے اردو ادب سے متعلق کارہائے نمایاں پر مشتمل زیرِ نظر مقالہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ مقالہ اس خاندان کی سوا دو سو سالہ ادبی کاوشوں کی مکمل داستان ہے۔ اردو ادب کے فروغ کے سلسلے میں اس خاندان کی ان ــــ کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

زیرِ نظر مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں انیسویں صدی کے لاہور کے سیاسی اور معاشرتی ماحول کو پس منظر میں رکھ کر وسیع تر مفہوم میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مروجہ تاریخوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے مخطوطات کو بھی استعمال کیا گیا ہے جو نہ صرف پہلی مرتبہ دنیائے تحقیق سے متعارف ہو رہے ہیں بلکہ اپنے استناد اور وثوق کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔ مثلاً مولوی احمد بخش یکدل، فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید غلام محی الدین نوشاہ ثانی کی بیاضیں اور مولوی احمد بخش یکدل کی تصنیف تحفۂ یکدل اور سید احمد شاہ بٹالوی

کی تاریخ پنجاب وغیرہ۔ اس سے اس دور کی غیر جانبدار تصویر ہمارے سامنے آگئی ہے۔

دوسرے باب میں "چشتی خاندان کے علمی و ادبی ماحول" پر بحث کرتے ہوئے، نہ صرف اس دور کے اہم خطی مآخذ مثلاً فقیر سید عزیز الدین کے اور مولوی احمد بخش یکدل کے روزنامچوں کو سامنے رکھا گیا ہے بلکہ پیر غلام دستگیر نامی کی بار ارزش کتاب "تاریخ جلیلہ" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جس میں لاہور کے پیر خاندان کی اردو خدمات پر بالواسطہ بحث کی گئی ہے۔ یہ خاندان لاہور میں چشتی خاندان کا دوست اور معاصر تھا۔ اس سلسلے میں بعض بے حد معروف اور اہم ناموں کے بارے میں پہلی مرتبہ مستند تحقیقی مواد پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً علی الدین بن مفتی خیر الدین ــ مصنف عبرت نامہ کے بارے میں، جن کی تصنیف تاریخ پنجاب پر اہم دستاویز ہے لیکن ان کے حالات پر کسی کو دسترس نہیں۔ ایسی اور شخصیات بھی مقالے میں نظر آئیں گی۔

تیسرا باب خاندانِ چشتی کے سوانحی کوائف پر مشتمل ہے۔ اس باب کے تقریباً تمام مآخذ خطی اور غیر مطبوعہ ہیں۔ چشتی خاندان کے متعدد افراد کو خوش قسمتی سے روزنامچے لکھنے کا شوق تھا چنانچہ ان روزنامچوں سے جو اپنے عہد کی جامع تفسیر ہیں، اس خاندان کے بارے میں سیر حاصل معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ یہ روزنامچے بہت مفصل ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کا روزنامچہ بیس جلدوں میں، مولوی حامد علی چشتی کا روزنامچہ اٹھارہ جلدوں میں اور سب سے مختصر مولوی ممتاز علی چشتی کا روزنامچہ جو اردو میں ہے اور معقول ضخامت رکھتا ہے۔ ان بزرگوں کی روحیں شاد ہوں کہ ان کی کاوشوں سے ان کے سوانح کی ترتیب میں پورے طور پر استفادہ کر لیا گیا ہے اور یہی ان کی آرزو تھی۔

چوتھے باب میں چشتی خاندان کے اہم مصنفین کو زمانی ترتیب کے ساتھ اہم ادبی اور تاریخی مآخذ کی مدد سے تلاش کیا گیا ہے اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پانچواں باب چشتی خاندان کی اہم اردو تصانیف پر تنقید اور تبصرے کے لیے وقف ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر تصنیف کو اس کے ہمعصر ادب کی روشنی میں سمجھا اور پرکھا جائے۔ تصانیف کی تلاش اور بازیابی خود ایک بہت بڑا مرحلہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے توفیق دی اور یہ مرحلہ

کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ بہت کم تصانیف مطبوعہ ہیں ورنہ اکثر و بیشتر قلمی ہیں۔ قلمی نسخوں کی قرأت متون کی صحت کا اطمینان ایک بہت مشکل کام ہے۔ خدا نے آسان کر دیا۔ الحمدللہ!

چھٹا باب چشتی خاندان کے تہذیبی اثرات کا ہے۔ یہ بہت وسیع مفہوم اور مضمون ہے۔ اسے اشارتاً بیان کرنے اور مختصراً احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ معلوم اور مکشوف مواد کی روشنی میں اس سے زیادہ پھیلانا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ مقالے کی ضخامت اور موضوع کا تقاضا بھی یہی تھا۔

مقالے کی تدوین اور تکمیل کے سلسلے میں اپنے دیرینہ کرم گستر اور استاد گرامی قدر جناب ڈاکٹر وحید قریشی کی رہنمائی کا شکر گزار ہوں۔ پنجاب اور لاہور کے ادبی موضوعات پر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اپنی ذات میں ایک مکتبِ تحقیق ہیں اور استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ڈاکٹر صاحب محترم کی رہنمائی میسر آئی۔ یہی میری دیرینہ آرزو تھی جو خدا نے پوری کی۔

اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں میرے گھر والوں اور میرے اہلِ خاندان نے جو اخلاقی اور عملی اعانت مجھے بہم پہنچائی اس سے میرے لیے کام کی ہر منزل آسان ہو گئی۔ میں اپنی مرحوم اہلیہ ڈاکٹر ممتاز گوہر اور اپنے عزیز فرزندان نوید گوہر اور فرید گوہر تینوں کا سپاس گزار ہوں۔

جناب مولوی مسعود علی چشتی، محترمہ پروفیسر قرۃ العین چشتی، جناب م۔ش اور جناب ظفر الدین صدیقی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے حتی الامکان میری مدد فرمائی اور مجھے مطلوبہ مواد فراہم کیا۔

میں استاد بزرگوار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور جناب ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا بھی سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس مقالے کو سراہا اور میری محنت کا صلہ مجھے عطا فرمایا۔

اسلام آباد

گوہر نوشاہی

[illegible]

باب اوّل

تاریخی اور سیاسی پس منظر

اٹھارویں صدی کا لاہور ایک ایسے پُر آشوب دور کا شاہد ہے جس نے اس تاریخ ساز شہر کو پوری ایک صدی تک سیاسی اعتبار سے افراتفری، بدامنی اور عدمِ استحکام میں مبتلا رکھا۔ مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال کے ساتھ ہی پنجاب میں دہشت گردی کا دور شروع ہو گیا تھا اور دہلی کی مرکزی حکومت میں خانہ جنگیوں اور ضعفِ سیاست کے باعث اتنا دم نہیں رہا تھا کہ وہ پنجاب کو غاصبوں اور اجنبی حملہ آوروں سے بچا سکے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے فوری بعد بندہ بیراگی نے پنجاب کا رخ کیا۔ ستلج اور بیاس کے دوآبے کے متعدد شہروں کو لوٹنے کے بعد وہ لاہور پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ شاہی فوجوں نے سرہند کے قریب اسے شکست دے کر لوہ گڑھ کے قلعے میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا؛ جہاں سے موقع پاتے ہی وہ فرار ہو گیا۔ بہادر شاہ کی موت یعنی ۱۷۱۲ء کے بعد مغل شہزادوں کی خانہ جنگیوں نے بندہ بیراگی کی عسکری قوت کو تنظیمِ نو کا موقع دیا۔ چنانچہ بندہ بیراگی کوہستانی پناہ گاہوں سے نکلا، پہلے سرہند کو آگ لگائی، پھر بٹالہ اور کلانور پر یورش کی۔ یہ زمانہ مغل بادشاہ فرخ سیر کا ہے۔ فرخ سیر نے اس یورش کو دبانے کے لیے نواب عبدالصمد کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ بندہ بیراگی کی گرفتاری اسی جوانمرد کے ہاتھوں ہوئی[1]

اس زمانے میں لاہور کے ممتاز خاندانوں میں ایک خاندان اپنے علمی اور روحانی شرف و

کے باعث خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس خاندان کے تمام افراد اپنے نام کے ساتھ چشتی لکھنے کو اپنے لیے نشانِ امتیاز تصور کرتے تھے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی ضیاء الحق چشتی، نواب عبدالصمد کی مدبّرانہ انتظامی صلاحیتوں اور اہلِ لاہور کے درمیان ان کی ہر دلعزیزی کے شاہد ہیں اور ان کے تاثرات اس دور سے متعلق بعض تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح میاں آفرین لاہوری بھی جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک درویش بھی تھے، نواب عبدالصمد خاں کے مدّاحوں میں سے تھے۔ بندہ بیراگی کی گرفتاری پر آفرین لاہوری نے شعر کہا ؂

بندہ را عبدالصمد خاں بند کرد

آفریں ، صد آفریں ، صد آفریں [۲]

نواب عبدالصمد خان ۱۱۳۹ھ میں فوت ہوئے۔ مولوی ضیاء الحق چشتی نے مادۂ تاریخ موزوں کیا:

"صمد ماند عبدالصمد نماند" [۳]

نواب عبدالصمد خان کے بعد اس کے بیٹے زکریا خان کو وزیر الممالک کی کوشش سے محمد شاہ بادشاہ کی طرف سے اعز الدولہ نواب زکریا خاں بہادر جنگ کا خطاب اور لاہور کی نظامت عطا ہوئی۔ کچھ مدت کے بعد انہیں سیف الدولہ کا موروثی خطاب اور صوبہ دار ملتان کا عہدہ بھی عطا ہو گیا۔ نواب زکریا خان کے دورِ حکومت کا اہم واقعہ پنجاب پر نادر شاہ درّانی کا حملہ ہے۔ یہ واقعہ ۱۷۳۹ء میں رونما ہوا۔ پنجاب کے غیور اور وطن پرست عوام نے نادر شاہ کے حملے کے خلاف جس غم و غصے اور نفرت کا اظہار کیا، اس کا اندازہ اس دور کی بعض تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ عوام تو ایک طرف اس دور کے صوفیا اور اہل اللہ نے بھی نادر شاہی حملے کو فتنۂ دجال سے تشبیہ دی ہے۔

مولوی ضیاء الحق نے نادر شاہ کو منحوس اور چندقدم کہا اور اس واقعۂ نامبارک کا مادۂ تاریخ مندرجہ ذیل موزوں کیا ہے:

نادر آمد بہند در یکدم کرد بر خلق جور و ظلم و ستم

سالِ تاریخ او دو تا آمد "غمِ عام" است و نیز "چند قدم"[۱۱۵۱ھ]

لاہور پر نادر شاہی حملے کی ایک اور تاریخی شہادت پیر کمال لاہوری کی تصنیف "مثنوی تحائفِ قدسیہ" سے ملتی ہے۔ اس کے مطابق لاہور کے چند درویش اپنے مرشد حضرت شہیر قلندر لاہوری (متوفی ۱۱۶۹ھ) کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ اس وقت نادر شاہ پنجاب میں داخل ہو چکا ہے اور لاہور پر اس کا حملہ یقینی نظر آرہا ہے۔ اسی محفل میں حکیم ضیا جو لاہور کے نامور طبیبوں میں سے تھے، حضرت شہیر قلندر سے نادر شاہی حملے کے بارے میں آپ کا ردِ عمل دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: اللہ سے لو لگاؤ۔ نادر شاہی قتل و غارت سے لاہور محفوظ رہے گا۔ تحائفِ قدسیہ کے متعلقہ اشعار درج ذیل ہیں:

چو آمد شاہ نادر سوی پنجاب ضیا کردہ سوال از ذات خوش ناب

کہ یا ہادی بلای آمدہ پیش چہ خواہد گشت حالِ خلقِ دلریش

بفرمودہ کہ خبر این غم ندارید امان گر دید با حق دل سپارید[۱۲]

نواب زکریا خان نے بیس لاکھ روپے اور ایک سو ہاتھی[۱۳] دے کر نادر شاہ سے اہلِ لاہور کی عزت و آبرو خرید لی۔ زکریا خان کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ شاہِ دہلی نے اس کی درخواست کے باوجود اسے کسی قسم کی فوجی بلکہ اخلاقی کمک بھی روانہ نہیں کی تھی۔ نادر شاہ نے اس رقم کو تاوان کے نام پر وصول کیا اور دہلی میں قتلِ عام کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ واقعہ شوال ۱۱۵۱ھ/ ۶۔ فروری ۱۷۳۹ء کا ہے۔

لاہور میں نادر شاہ کا پڑاؤ شالامار باغ کے قریب تھا۔ ایک روز جبکہ بادشاہ شالامار باغ کی سیر میں مصروف تھا، نواب زکریا خان نے اپنے استاد مولوی محمد ابراہیم چشتی بن مولوی ضیاء الحق چشتی کو شاہ کی خدمت میں پیش کیا اور ان کے علم و فضل کی تعریف کی۔ مولوی صاحب نے اس موقع پر اپنا لکھا ہوا ایک قطعۂ تاریخ پیش کیا۔

پنجاب پہ نادر شاہی حملے نے مغلیہ سلطنت کے زوال کو بے نقاب کر دیا اور "مغلِ اعظم" کی سیاسی طاقت کا بھرم توڑ دیا۔ نادر شاہ کی ایران کو مراجعت پنجاب میں مغلیہ حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں پورا پنجاب سکھوں کی تخریبی سرگرمیوں کی زد میں آ گیا۔

زکریا خان اہلِ لاہور کے درمیان جو محبوبیت رکھتا تھا، وہ اس کے جانشینوں کو نصیب نہ ہوئی۔ نواب زکریا خان سیف الدولہ کی وفات ۱۲۔ جمادی الاول ۱۱۵۸ھ کو ہوئی۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ بطور تعمیر موزوں کیا:

حیف صد حیف کہ شہر لاہور ۔۔۔ زیر و بالا شد و افسر معدوم
رونق از عرصہ پنجاب برفت ۔۔۔ گریہ ہا کرد کلان و معصوم!
گشت امروز بجا را ویران ۔۔۔ صد شرف داشت لہانور بہ روم
دامن لطف جناب ناظم ۔۔۔ امن ما داد زہر چغد و بوم
روز سہ شنبہ جمادی الثانی ۔۔۔ خاک بیگم پورہ کردش منظوم

سالِ او از سرِ ابجد گفتہ
ہاتفم، خان بہادر مرحوم

۱۱۵۸ھ

نواب زکریا خان کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ خان ناظم لاہور مقرر ہوا لیکن اس کے چھوٹے بھائی شاہ نواز خان حاکم ملتان نے اس کے عہدے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھائی سے باپ کی جائیداد کا حصہ طلب کیا۔ شالامار کے قریب دونوں فوجوں میں جھڑپ ہوئی جس میں یحییٰ خان کو شکست ہو گئی۔ شاہ نواز خان نے فتح کی سرشاری میں مرکزی حکومت سے منظوری حاصل کیے بغیر ہی اپنی نظامت کا اعلان کر دیا۔ یحییٰ خان بھی شاہ نواز خان کی قید سے فرار ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ شاہ نواز خان نے مرکز کی سرزنش کے خوف سے اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لالچ میں

130143

افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو لاہور پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ ابدالی کے آنے سے پہلے قمر الدین خان وزیر نے شاہ نواز خان کو غلطی کا احساس دلاتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کے مقابلے پر رضامند کر لیا۔

لاہور میں داخل ہونے سے پہلے احمد شاہ ابدالی نے لاہور کے ایک روحانی بزرگ سید صابر شاہ چشتی کو اپنا سفیر بنا کر شاہ نواز خان کے پاس گفت و شنید کے لیے روانہ کیا[۷]۔ مولوی احمد بخش یکدل نے صابر شاہ کو احمد شاہ ابدالی کا مرشد لکھا ہے۔ شاہنواز خان نے سفارت کے آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے صابر شاہ کی جرأت مندانہ گفتگو پر اسے قتل کروا دیا۔ احمد شاہ ابدالی یہ سن کر غضبناک ہو گیا۔ یکدل نے لکھا ہے:

"چون این خبر جانکاہ بگوش احمد شاہ دوران آشنا شد، گریبان پارہ کرد۔ ہمانوقت فی الحال بر دو لب راوی پیوند کردہ لشکر را کہ اذن دادہ حکم بغاوت و قتل لاہور داد"[۸]

شاہنواز خان نے شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کی۔ لاہور کے عمائدین نے بارہ لاکھ روپیہ، چند ہاتھی اور چند نفیس لاہوری کانیں نذر کر کے بادشاہ سے پناہ حاصل کی[۹]۔ احمد شاہ نے اہلِ لاہور کو خوب لوٹا۔ بیگم پورہ کی دولت مالِ مفت سمجھ کر سمیٹی اور اہلِ لاہور کو مالی بحران اور اقتصادی فاقہ کشی میں مبتلا کرتا ہوا دہلی کی طرف کوچ کر گیا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے سیر المتاخرین، عبرت نامہ، تاریخِ مظفری، بیانِ واقع، تاریخ احمد شاہی اور تاریخ حسین شاہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے لاہور سے جاتے ہوئے جملہ خان کو جو قصور کے افغانوں میں سے تھا، لاہور کا ناظم مقرر کیا[۱۰]۔ مولوی یکدل نے اس سلسلے میں میر مومن خان کا نام لیا ہے، جو قرینِ صحت نہیں ہے[۱۱]۔ یکدل نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ احمد شاہ ابدالی جب لاہور سے نکل کر چک رام داس پہنچا تو اس نے وہاں کے معبد کو بارود سے اڑا دیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے علاوہ سکھوں کے قتلِ عام کا حکم دے کر اس شہر کو قبرستان میں بدل دیا[۱۲]۔ پنجاب پہ

احمد شاہ کے حملے نے لوگوں کے دلوں میں اس مسلمان بادشاہ کے احترام کا کیا نقش چھوڑا، اس کی ایک جھلک پیر کمال لاہوری کی تصنیف تحائفِ قدسیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ نادر شاہ درانی کے ضمن میں لاہور کے درویشوں کی جس محفل کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، اسی محفل میں حکیم ضیا اپنے مرشد سے احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بارے میں بھی استفسار کرتے ہیں جس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں:

"میں نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ سُور ہمارے کھیتوں میں گھس آئے ہیں اور میں نے انہیں مار کر بھگا دیا ہے"۔

تحائفِ قدسیہ کے متعلقہ اشعار درج ذیل ہیں:

چوں از احوال احمد شاہ پرسید	بفرمودہ کہ این خود عبث گردید
چہ شد تکلیف بسیار از امان جان	بہ پیر سید آن حکیم نیک از جان
بفرمودہ کہ شب در خواب دیدم	کہ خوکان در زراعت من دویدم
برون کردم از آن جا آن ستم کار	ہمی بینند تعاقب بارہا بار
چنین شد کوچ کردہ دوم روزی	درون شاہدرہ شد خانہ سوزی

احمد شاہ ابدالی دہلی کی طرف پیشقدمی کر رہا تھا کہ قمر الدین خان وزیر نے کرنال کے قریب اس کا راستہ روکا۔ قمر الدین خان کا پلّہ جنگ میں بھاری تھا لیکن احمد شاہ ابدالی کے گولہ انداز جاسوسوں نے حیلہ سازی سے وزیر کی جان لے لی[۱۳]۔ میدانِ جنگ ہاتھ سے جاتا تھا کہ قمر الدین خان وزیر کے دلیر بیٹے میر منّو نے شجاعت اور مردانگی سے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور احمد شاہ ابدالی کو حیلہ وفن کے باوجود شکست کا سامنا ہوا۔ چنانچہ بادشاہ اپنے لشکر کو سمیٹتا ہوا قندھار روانہ ہو گیا۔ میر منو کو اس جوانمردی کے عوض بادشاہ دہلی سے معین الملک، رستمِ ہند کا خطاب اور لاہور کی نظامت عطا ہوئی۔ بعض مؤرخین نے اس لڑائی کا محلِ وقوع کرنال کی بجائے سرہند کے قریب لکھا ہے[۱۴]۔ یہ واقعہ ۱۷۴۸ء کا ہے۔

میر منو نے اپریل ۱۷۴۸ء کے وسط میں ناظم لاہور کا عہدہ سنبھالا۔ اس نے دیوان کوڑا مل کو اپنا نائب مقرر کیا اور آدینہ بیگ کو جالندھر دوآب کی فوجداری پہ مستقل رکھا۔ یہ دونوں شخصیتیں سرہند کی لڑائی میں میر منو کے شانہ بشانہ تھیں۔ سرہند کی شکست کی خفت مٹانے کے لیے احمد شاہ ابدالی نے لاہور پہ دوبارہ حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میر منو کے لیے لاہور کی نظامت پھولوں کی سیج ثابت نہ ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد پنجاب میں سکھوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور انہوں نے جسا کلال کی سرکردگی میں امرتسر کے نزدیک اپنا ایک قلعہ بھی بنایا تھا۔ چنانچہ میر منو نے لاہور میں پاؤں جماتے ہی سکھوں پہ یلغار کی۔ ان کے قلعے کو تباہ کر دیا اور ان کی تنظیم بالکل منتشر ہو گئی۔ اس کے بعد میر منو لاہور کے نظم و نسق کو درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ادھر احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۸ء میں لاہور کی طرف پیشقدمی کی۔ ادھر محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ مغلیہ سلطنت کا وارث ہوا۔ احمد شاہ آئینِ حکمرانی سے عاری اور حسنِ تدبیر سے خالی تھا۔ میر منو نے امداد کے لیے مرکز کو خط لکھا لیکن درخواست صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اب میر منو دو محاذوں پہ نبرد آزما تھا۔ ایک سکھوں کی بغاوت، نقضِ امن اور قتل و غارت اور دوسرے احمد شاہ ابدالی کے حملے کا خوف۔ میر منو نے پنجاب کے چار محال کا مالیہ ابدالی کو دینے کے معاہدے کے ساتھ صلح کر لی اور دیوان کوڑا مل کو سکھوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے پہ مامور کیا۔ سکھ بھلا داد و ستد کے کھرے کیسے ہو سکتے تھے؟ میر منو احمد شاہ ابدالی کے ساتھ گفت و شنید کے لیے سودھرہ گیا تو سکھوں نے موقع پا کر لوٹ مار شروع کر دی۔ چنانچہ ابدالی کی روانگی کے بعد میر منو پھر سکھوں کی تادیب کی طرف مائل ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی نے چار محال کے مالیے کی ادائیگی میں میر منو کی طرف سے سستی کو سبب ٹھہرا کر ۱۷۵۱ء میں پھر لاہور پہ حملہ کر دیا۔ میر منو نے مرکز کو اطلاع دی لیکن مغلیہ دربار کے سازشی ماحول کو میر منو کا یہ اقدام پسند نہ تھا کہ ابدالی کو چار محال کا مالیہ پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ مرکز سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور میر منو کو تن تنہا اس استیصالی قوت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ پنجابیوں اور افغانوں کے

درمیان اہم ترین جنگ تھی۔ اس جنگ میں بھیکاری خان کا کردار اور کوڑامل اور میر منّو کی شجاعت عوام پر واضح ہوگئی۔ حتیٰ کہ احمد شاہ ابدالی بھی میر منو کی شجاعت پر عش عش کر اٹھا۔ اس جنگ میں ابدالی کی فتح ہوئی اور اس "دین دار" بادشاہ نے لاہور کے گلی کوچوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ تاریخ اس کے بیان سے لرزہ بر اندام ہے۔

فتح کی خوشی میں ابدالی نے لاہور میں سکھوں کے دو کلہ مینار بنائے۔ چنانچہ بکدل کا بیان ہے:

"احمد شاہ (ابدالی) در گزر چوک نخاس متصل مزار حضرت شیخ کاکو چشتی
شہید نبیرۂ موج دریا فرزند گنج شکر رحمہم اللہ بر لب مسجد ارادت خان
کہ بلند است نشستہ و متصل مزار شیخ مغفور از مغارق مو بسران دو
مینارِ کلان ساختہ مشاہدۂ تاصیل کفار می نمود۔"[۱۵]

راجہ کوڑامل کے مارے جانے کے بعد دراصل میر منو کا حوصلہ پست ہوگیا تھا اور اس نے افغانی حملہ آور سے صلح کی درخواست کر دی تھی۔ احمد شاہ ابدالی اس کی شجاعت سے اس قدر متاثر تھا کہ اسے اپنے سامنے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میر منو گراں بہا جواہرات، ایک کروڑ روپیہ نقد، تین سو حلقہ کمان لاہوری، پانچ سو عمدہ بندوقیں، دو سو ایرانی تلواریں، اکیس عراقی گھوڑے اور گیارہ ہاتھی لے کر بادشاہِ افغانستان کے سامنے پیش ہوا۔[۱۶] بادشاہ نے تاجرانہ طریقہ سے رقم وصول کی اور میر منو کو اپنی طرف سے لاہور کا ناظم مقرر کر دیا۔ اس طرح اہلِ لاہور احمد شاہ ابدالی کی رعایا بن کر ایک طرف خطرے سے باہر ہوئے اور دوسری طرف میر منو کو سکھ غارت گروں کی سرکوبی پر توجہ دینے کا موقع ملا۔ چنانچہ میر منو نے سکھوں کی وہ تادیب کی کہ وہ اس کے نام سے کانپنے لگے۔ اس زمانے میں پنجابی کے یہ مصرعے سکھوں کی زبان پر عام تھے:

میر منو ساڈی داتری اسیں اوہدے سوئے
جوں جوں سانوں وڈدا اسیں دونے دونے ہوئے

یا

میر منو دے سویے

اتوں اتوں لا پرسے ہیٹھوں دونے ہویے

اب ہر سال احمد شاہ ابدالی پنجاب پر حملے کے لیے نہیں بلکہ بظاہر سکھوں کی تخریبی سرگرمیوں سے اہلِ پنجاب کو بچانے اور جذبۂ اسلام سے سرشار ہو کر جہاد کے لیے پنجاب کا رخ کرتا تھا۔ اس کارِ ثواب میں قندھار میں اس کے خالی خزانے کی کمی بھی پوری ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے یہ دولت صرف کفار کی جیبوں سے ہی اکٹھی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہر حملے پر تقریباً تمام اہلِ پنجاب کا خون پسینہ نچوڑ لیا جاتا تھا۔ پنجابی کا یہ مصرعہ جو اس زمانے میں زبان زدِ عوام تھا، اہلِ پنجاب کی بے بسی کا اظہار کرتا ہے ؏

کھادا پیتا لاہے دا باقی احمد شاہے دا

احمد شاہ ابدالی پنجاب پر حملہ کرتا تو سکھ بکھر جاتے یا پہاڑی پناہ گاہوں میں چھپ جاتے لیکن جونہی بادشاہ واپس جاتا، جمع ہو کر مسلمانوں کو لوٹ لیتے اور لاہور کے گرد و نواح کو ویران کر دیتے تھے۔ معین الملک میر منو کے زمانے میں پنجاب پر دو سلطنتوں کا دعویٰ تھا۔ مغل بادشاہ اسے اپنی حکومت میں اور افغان بادشاہ اسے اپنی حکومت میں سمجھتے تھے۔

یہ تو میر منو کی مدبرانہ سیاست تھی کہ ظلم کے ان دو پاٹوں کے درمیان اہلِ لاہور کو پسنے سے بچائے رکھا۔ میر منو ۱۷۵۳ء میں شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے پھسل کر ہلاک ہو گیا۔ اہلِ لاہور نے کئی روز تک اپنے اس محبوب رہنما کا ماتم کیا۔ نخاس محلے میں اس کا صندوق سپردِ خاک کیا گیا اور اس پر ایک گنبد تعمیر ہوا۔

بیدل نے لکھا ہے:

"تا در قیدِ حیات بود بنابر جود و سخاو خلق، خوشی و رنگِ تسخیرِ قلوبِ جہانی ریخت"[۱۷]

مولوی شبیر محمد فرزند حافظ صلاح لاہوری نے مندرجہ ذیل تاریخ کہی:

بر کابِ براق برق شتاب ۔۔۔ پورِ میر وزیر عالی جاہ
عالم و عادل و معین الملک ۔۔۔ غازی و اہلِ سنت و خوش راہ
چون بنظم جہان باقی رفت ۔۔۔ در لاہور گشت واویلاہ
ہاتف اندر خطاب او تاریخ ۔۔۔ سیدا ہند گفت و رستم شاہ[۱۸]

احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۸۶ھ بمطابق ۱۷۷۲ء میں وفات پائی۔ اس کے ناک میں ناسور پیدا ہوگیا تھا۔ ملا عبدالغفار خان نے وفات کی تاریخ اس کے بیٹے تیمور شاہ کی خدمت میں پیش کی جو مندرجہ ذیل ہے:

از سال احمد شاہ دین ابدالی و غازی لقب
ہاتف بگوشم آمدہ، کشور ستانِ قدم بگفت[۱۹] (کذا)

۱۱۶۱ھ یعنی ۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۱۸۶ھ بمطابق ۱۷۷۲ء تک احمد شاہ ابدالی نے بعض مؤرخین کے بقول پنجاب پر دس حملے کیے[۲۰] ۔ اور یکدل کے بیان کے مطابق:

"در مرز پنجاب احمد شاہ چاردہ بار آمد و نوبتی چاردہ ماہ اقامت کرد و شش بار ہندوستان توجہ فرمود"۔[۲۱]

اس دوران میں پنجاب کی یہ حالت تھی کہ عالی گوہر کے زمانے میں لاہور کو "خراب آباد" کا نام دیا جاتا تھا۔ پنجاب میں آہستہ آہستہ مغل اور افغان دونوں بادشاہوں کا نفوذ ختم ہو گیا۔ میر منو کی وفات کے بعد نظامتِ لاہور میں غداروں اور سازشیوں کی من مانیاں برسرِ عام نظر آتی ہیں۔ میر منو کی بیوی مغلانی بیگم، میر مومن خان، بھکاری خان، آدینہ بیگ غرضیکہ ہر صاحبِ اثر حاکم نے لاہور کی تباہی اور پنجاب میں مسلمان حکومت کے زوال میں حصہ لیا۔ دوسری طرف خود احمد شاہ ابدالی اور اس کے جانشینوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اب اہلِ پنجاب کے پاس لٹوانے کو کچھ نہیں رہا، مسلمان

امراء کی بجائے سکھ سرداروں پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ ۱۷۶۲ء میں جب احمد شاہ ابدالی لاہور سے قندھار روانہ ہوا تو کابلی مل نام کے ایک ہندو کو لاہور کا ناظم مقرر کیا۔ ابھی بادشاہ اٹک نہیں پہنچا تھا کہ بھنگی سرداروں نے حملہ کر کے کابلی مل کو شکست دی اور سرہند کے حاکم کو قتل کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

افغانی بادشاہ جب وطن روانہ ہوا تو اس کے تقریباً ایک ماہ بعد سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۶۶ء میں ابدالی نے جب لاہور پر حملہ کیا تو تین سکھ سردار گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ لاہور میں موجود تھے جو افغانی بادشاہ کی آمد کا سن کر فرار ہو گئے۔ اسی واقعے کے بارے میں پنجاب میں یہ شعر زبان زدِ عوام ہوا:

سوبے دی سوبھا گئی، گجر دا گیا مال

لینے نوں دینا آیا، ترتوں ہوئے کنگال

۱۷۶۷ء میں سرہند کے قریب کابلی مل کے بھتیجے پھولکیاں مثل کے سردار امر سنگھ کو ابدالی بادشاہ کی طرف سے خلعت، علم، راجۂ راجگان کا خطاب اور سرہند کی صوبے داری عطا ہوئی۔ اس کی تفصیل درق الزمان میں موجود ہے۔ اس کے مطابق امر سنگھ نے احمد شاہ ابدالی کو راجگی کے خطاب اور خلعت کے عوض ایک لاکھ روپیہ پیش کیا۔ امر سنگھ کو یہ سودا مہنگا نہیں پڑا۔ کیونکہ اس نے نذر کے ساتھ ہی بادشاہ کو راضی کر لیا کہ سہارنپور اور متھرا کے قرب و جوار سے جو سکھ قید کیے گئے ہیں، چھوڑ دیے جائیں۔ اس نیکی کے بدلے سکھوں نے اسے "بندی چھوڑ" کا خطاب دیا[۲۲] جو ابدالی کے دیے ہوئے راجۂ راجگان کے خطاب سے زیادہ اس کے لیے قیمتی تھا۔ امر سنگھ، کابلی مل کی غیر حاضری میں حاکم لاہور رہا۔ سکھ سرداروں لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے قلعے کے مسلمان باغبانوں کو انعام و اکرام کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا اور قلعے کی دیوار میں سوراخ کر کے اندر داخل ہو گئے[۲۳]۔ امر سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا اور شہر پہ دوبارہ تینوں حاکم گجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ حکومت کرنے لگے۔ گویا اس زمانے میں لاہور ایک ایسی گردن تھا جس پہ تین تلواریں لٹک رہی تھیں۔

احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا جس نے ۱۲۰۷ھ میں فالج اور لقوہ کے مرض سے وفات پائی۔

تیمور شاہ کے بعد اس کا بیٹا زمان شاہ تخت پر بیٹھا۔ مولوی شیر محمد لاہوری نے ایک کی وفات اور دوسرے کی تخت نشینی کو ایک ہی مادۂ تاریخ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ موزوں کر دیا:

دو نقش چہ جانگاہ و چہ دلخواہ نشست
خورشید برآمد زافق ماہ نشست

از گردش مہر و ماہ تیمور ز تخت
برخاست و نواب زمان شاہ نشست[۲۴]

تخت کے اعداد ۱۱۰۰ میں سے تیمور کے اعداد ۶۵۶ خارج کر دیے جائیں تو باقی ۴۴۴ بچیں گے۔ ان میں زمان شاہ کے ۷۶۳ اعداد جمع کرنے سے وفات اور تخت نشینی کا سال ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے۔

تیمور شاہ اپنے باپ کے مقابلے میں بے حد نرم دل اور صلح جو تھا۔ اس کے دور حکومت میں پنجاب افغانی آشوب سے محفوظ رہا اور بادشاہ نے بھی زیادہ وقت اپنے ملک کے حالات سنوارنے میں صرف کیا۔ اس عرصے میں سہ حاکمانِ لاہور بغیر کسی مخالفت کے لاہور پر حکومت کرتے رہے۔ اس زمانے میں پنجاب میں برائے نام مغلوں یا افغانوں کا سکہ رائج تھا، اصل حکومت سکھوں کی تھی جو مختلف ریاستیں قائم کر کے پنجاب کے گوشے گوشے میں مطلق العنان حاکموں کی طرح رہتے تھے۔ ان ریاستوں کو مثلوں کا نام دیا گیا تھا۔ یہ مثلیں بارہ کی تعداد میں بیان کی جاتی ہیں۔ ہر مثل عموماً سکھ سرداروں کے جتھوں یا ناموں پر مشتمل ہوتی تھی۔

شاہ زمان نے تخت نشین ہوتے ہی پنجاب پر حملے کا ارادہ کیا۔ اس نے پہلے ۱۷۹۵ء میں پنجاب کا رخ کیا لیکن قلعہ رہتاس سے ہی واپس چلا گیا۔ ۱۷۹۸ء میں وہ آخری بار لاہور آیا۔ سہ حاکمان شہر چھوڑ کر فرار ہو گئے اور وہ بلا روک ٹوک شہر پر قابض ہو گیا۔ اسی دوران اسے اپنے بھائی شاہ محمود کی بغاوت

کی خبر ملی جس پہ وہ یکدم واپس چلا گیا۔ واپسی پہ شاہ زمان ایک تو جلدی میں تھا اور دوسرے سیلاب کے باعث دریائے جہلم پہ واقع کشتیوں کا پُل ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے بادشاہ کی بارہ توپیں دریا میں گم گیئں۔ جنہیں سکر چکیہ مثل کے سردار رنجیت سنگھ نے نکلوا کر کابل بھیج دیا۔ شاہ زمان کے لاہور سے نکلتے ہی سہ حاکمان نے دوبارہ لاہور پہ قبضہ کر لیا لیکن اس کے باوجود شاہ زمان نے رنجیت سنگھ کو اس خدمت کے صلے میں لاہور پہ حکومت کا پروانہ بھیج دیا۔

عزیز الدین وکیلی فوفلزئی نے لکھا ہے کہ رنجیت سنگھ اور شاہ زمان کے درمیان دوستی اور اطاعت کا رشتہ بہت عرصے سے استوار تھا اور یہ اقدام شاہ زمان کی مدبرانہ اور دوراندیش حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا فوفلزئی کا بیان یہ ہے:

> "در حین ورود موکب ہمایونی در پشاور چون قبل از آن عزم داشت مانند راجہ امر سنگھ شخصی را ازان طایفہ لقب مہاراجہ بخشد، درین فرصت استرضائے خاطر خطیر شہنشاہِ زمان بدین قرار یافت، تا رنجیت سنگھ را کہ چند بار در لاہور بحضور اعلیحضرت موصوف بشرف رکاب بوسی حاضر شدہ .....
> لازم فرمود کہ از میان نفرِ زعیم مشہور موجودہ سکھاں آن جوان صاحب رشادت و فراست را در قطار آنہا امتیاز بخشیدہ بحکومت لاہور و بلقب مہاراجہ سرگباشی سرفراز فرماید"[۲۵]

فوفلزئی کی عبارت میں رسمی اور مبالغہ آمیز باتیں زیادہ ہیں، ورنہ نہ تو رنجیت سنگھ اس زمانے میں اتنا اہم تھا کہ اسے تمام سکھ مثلوں میں صاحبِ رشادت و فراست سمجھا جاتے اور نہ ہی شاہ زمان کے فرمان یا سندنامے میں ایسی جان تھی کہ سہ حاکمانِ لاہور اُسے چوم کر آنکھوں سے لگاتے اور رنجیت سنگھ کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ وہ تو رنجیت سنگھ کی خوش بختی تھی کہ لاہور کی سیاست میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جنہوں نے رنجیت سنگھ کے ستارۂ بخت کو چمکا دیا اور اس کے سر پہ حکمرانی کا تاج رکھ دیا۔ البتہ اس سندنامے کی موجودگی میں رنجیت سنگھ دوسروں کے مقابلے میں لاہور کا

قانونی راجہ تھا۔

لاہور کے آخری نام نہاد مسلمان ناظم داؤد خاں کو اکابرینِ لاہور کے جس گروہ نے سہ حاکمانِ لاہور یعنی لہنا سنگھ، گوجر سنگھ اور سوبھا سنگھ کے حق میں دستبردار ہونے کا مشورہ دیا تھا، ان میں میاں محمد عاشق، سید محمود شاہ، حافظ قادر بخش تاجر، لالہ مہاراج اور مہر محکم دین کے نام تاریخ میں ثبت ہو چکے ہیں[۲۶]۔ ان کو اس خدمت کے عوض عرصہ دراز تک وظائف اور انعام و اکرام ملتے رہے۔ ان حاکموں میں سے لہنا سنگھ نسبتاً انصاف پرور آدمی تھا۔ اس کی حکومت میں ہر مذہب و ملت کے آدمی کو یکساں سمجھا جاتا تھا۔ لہنا سنگھ اسلامی تہواروں خصوصاً عیدالاضحیٰ پر مسلمان قاضیوں، مفتیوں اور اماموں کی دستار بندی کرواتا تھا اور انہیں مددِ معاش کے لیے رقوم بھی دیا کرتا تھا۔

سہ حاکمانِ لاہور کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں میں وہ دم خم نہ تھا۔ وہ مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ شاہ زمان کے حملے کے بعد لاہور کے حاکم مسلمانوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور انہیں شاہ زمان کا جاسوس سمجھا جاتا تھا۔ شک کی بنا پر قید و بند کی اذیتیں مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑتی تھیں اسی قسم کا الزام میاں محمد عاشق کے داماد میاں بدر دین پر لگایا گیا اور اسے قید و بند میں ڈال دیا گیا۔ اسی حوالے سے لاہور کے مسلمان زمینداروں خاص طور پر ارائیوں اور باغبانوں کو سزا اور بے عزتی کے شکنجے سے گزارا جا رہا تھا۔ چنانچہ اہلِ لاہور نے ان مظالم سے تنگ آ کر پہلے نظام الدین خاں والیِ قصور سے لاہور پر حملہ کرنے کی درخواست کی، اس نے کوشش کی لیکن بر وقت مخبری کے سبب سہ حاکمان ہوشیار ہو گئے اور نظام الدین خاں کا منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

اس کے بعد عمائدینِ لاہور نے رسول نگر جا کر رنجیت سنگھ کو دعوت دی کہ وہ لاہور پر حملہ کرے اس کے ساتھ ہی اُسے اپنی اور اہلِ لاہور کی حمایت کا یقین دلایا۔ رنجیت سنگھ تو اشارے کا منتظر تھا، فوراً آمادہ ہو گیا اور اپنی ساس سدا کور سے مدد حاصل کر کے لاہور کی طرف کوچ کیا۔ رنجیت سنگھ کی آمد کے وقت بقول گریفن لاہور سہ حاکمان کی بے توجہی کا اس قدر شکار تھا کہ بعض جگہوں سے ویرانہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ یکدل کا بیان ہے:

"تشغلان روزانه در شهر می گردیدند و ابواب لاہور، کشمیری، خضری، زکی، اکبری
موری را خاکریز کردند و صرف مستی و ٹکسالی و لوہاری و شاہ عالمی و موچی و بھاٹی
وا بودند۔ در روشنائی دروازه داخل ارک واز مستی الی زکی سر بسر مسمار و
حدود اکبری جمله ویران و خراب واز ٹکسالی الی بھاٹی بیابانِ لق و دق۔
علماء و شرفاء یک لخت غریب الوطن شدند۔ سوای قوم ہنود یا از بقال،
اروڑه و بزاز و زرگر و بعضی از اہل حساب واز ممتونان بجز کلال و خوجه و
قین و درود گر و چابک و کفش دوز کسی از مشائخ عظام و مغول و افاغنه
و سادات عظام درین شہر نماند که مو بسران تعظیم ہر یکی بخاک برابر و
خانمان تاراج کرده جلا دادند۔"[27]

رنجیت سنگھ کو جن عمائدین نے خط و کتابت کر کے بلایا تھا، ان میں میاں محمد عاشق، مولوی محمد سلیم، میر امیر بخش مشہور نقو شاہ رئیس لاہور، مہر محکم دین باغبان رئیس نو کوٹ، عابد خان اٹاری والا، محمد عظیم، حافظ محمد، مہر شادی کٹار بند، احمد خان بھنڈر لاہوری اور میاں جان محمد شامل تھے۔ انہوں نے محمد عظیم باغبان کو یہ پیغام دے کر رنجیت سنگھ کے پاس روانہ کیا کہ حملے کی صورت میں لوہاری دروازہ کھلا رکھا جائے گا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ ۱۵۔ صفر ۱۲۱۵ھ بمطابق ۱۵۔ خرداد ماہ ۱۸۵۶ بکرماجیتی (بمطابق ۹۔ جولائی ۱۸۰۰ء) کو لوہاری دروازے سے واردِ لاہور ہوا۔ تینوں حاکموں نے راہِ فرار اختیار کی۔

رنجیت سنگھ خود محمد عاشق اور محمد سلیم کے پاس گیا اور انہیں ہر طرح کی تسلی دی اور دلاسا دے کر اپنی سرپرستی کا یقین دلایا۔ مہر محکم دین کو نو کوٹ کی جاگیر، سونے کے کڑے[28] اور بابا کا خطاب دیا گیا۔ اس کے علاوہ اسے لاہور کا مدار المہام یعنی چیف ایڈمنسٹریٹو بھی مقرر کیا گیا۔[29] اس کے بعد وہ قلعہ، شہر کی فصیل اور شالامار کی تعمیر اور مرمت کی طرف راغب ہوا۔ پھر شہر کے نظم و نسق اور امن و امان بحال کرنے پر توجہ دی۔ رعایا کے دل سے خوف و ہراس دور کیا اور انہیں شخصی آزادی کی ضمانت دی۔ رنجیت سنگھ نے جلد ہی ارد گرد کے چھوٹے چھوٹے راجوں اور جاگیرداروں کو اپنا تابع بنا لیا اور یکم بیساکھ سمت ۱۸۵۸ مطابق اپریل ۱۸۰۱ء

کو لاہور میں ایک دربار منعقد کیا جس میں اپنے لیے سرکار کا لقب اختیار کیا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے سردار فتح سنگھ اہلووالیہ سے امرتسر میں پگڑی تبدیل کی اور دونوں میں بھائی چارہ قائم ہوا۔ اسی سال ۱۸۰۲ء میں ہی بھنگیوں سے امرتسر خالی کرایا اور ان کے مقبوضات الحاق کر لیے۔ ۱۸۰۵ء میں مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہلکر ساٹھ ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادہ فوج کے ہمراہ امرتسر میں وارد ہوا۔ اس کے تعاقب میں انگریزی فوج تھی، مہاراجہ نے ہلکر سے ملاقات کی اور اپنے سیاست مندانہ طرزِ عمل سے اگر ایک طرف اسے انگریزوں کے ساتھ صلح پر آمادہ کر کے اپنی سرحدوں سے مرہٹوں اور انگریزوں کی یلغار کا خطرہ دور کیا تو دوسری طرف ہلکر سے حکمرانی اور کشورکشائی کے بہت سے اصول بھی سیکھے۔ اس ملاقات سے رنجیت سنگھ نے ہلکر کی زبانی انگریزوں کی سیاست اور عسکری تنظیم کے قصے سنے اور سید احمد شاہ بٹالوی کے بقول اسی دن سے رنجیت سنگھ کے دل میں انگریزوں کی طاقت کے خوف نے جگہ حاصل کر لی۔ سید احمد شاہ کی متعلقہ عبارت درج ذیل ہے:

"در سمت ۱۸۶۲ (۱۸۰۵ء) مرہٹہ جسونت رای از فرنگیان گریختہ با جمعیت شصت ہزار سوار و یک لک پیادہ بہ پنجاب آمد و بیرونِ شہر انبرت سر ڈیرہ انداخت۔ و متعاقب او یکی از امرای فرنگ جرنل لیک نام داشت، ..... نیز در رسید، و در دوآبہ بست بر کنار دریای بیاہ مقابل جلال آباد فرود آمدہ وکیلان طرفین باہم آمد و رفت نمودہ باہم سخنِ مصالحہ درمیان آوردند۔ و عرصہ دو ماہ درین میان بگذشت۔ و رنجیت سنگھ در امرتسر با راجہ جسونت رای ملاقی شدہ بسیاری از قواعد ریاست و ملک گیری، از برفت واقعات و حکایاتِ محاربات با فرنگی شنیدہ بغایت تعجب نمود۔ واز آن روز باز بیم و ہراسِ فرنگیان در دل رنجیت سنگھ مستحکم شد۔"[۳۰]

۱۸۰۶ء میں لدھیانہ اور گھونگر کے اضلاع پر قبضہ کیا۔ ۱۸۰۷ء میں کاہنہ سنگھ کی جاگیر واقع چونیاں قصور اور رگوگیرہ الحاق کر لی گئی۔ اسی سال نارائن گڑھ، دوپی، مرنڈ، زیرا وغیرہ کی ریاستیں جو فیروزپور

کے گرد و نواح میں تھیں، چھین لی گئیں۔ ۱۸۰۸ء میں انگریزوں نے مٹکاف کی سرکردگی میں ایک مشن روانہ کیا جس کا مقصد مہاراجہ کو اپنے اور انگریزوں کے درمیان سرحدی حدود کے تعین اور احترام کی طرف توجہ دلانا تھا۔

اسی سال سرہند کے سکھوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف سرکارِ انگریزی سے حفاظت کی درخواست کی۔ ۱۸۰۹ء میں مہاراجہ اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدے پہ دستخط ہوئے جس کی رو سے ستلج کے اس پار مہاراجہ اور دوسرے کنارے پر انگریزی حکومت کے زیرِ حمایت راجہ ہوں گے اور مہاراجہ ان کی جاگیروں پہ قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

مہاراجہ نے اپنی مشرقی سرحدوں سے مطمئن ہو کر مغرب اور شمال کی طرف فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور جہاں بھی پہنچا، فاتح بن کر چھا گیا۔ قصور، ملتان، کشمیر وغیرہ سب زیرِ نگین آ گئے۔

مہاراجہ نے سیاسی اعتبار سے پنجاب کو ایک ایسا قلعہ بنا دیا جس کی دیواروں کو اگر مہاراجہ کے نااہل (جانشین اور انگریز کی شاطرانہ حکمتِ عملی کمزور نہ کرتی تو پنجاب کو شاید کبھی انگریزی حکومت کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ مہاراجہ نے اپنی وفات یعنی ۱۸۳۹ء تک تقریباً چالیس سال حکومت کی۔ اس عرصے میں لاہور پورے ہندوستان میں عروس البلاد کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس دور کے تمدنی کوائف الگ حصے میں پیش کیے جائیں گے؛ سیاسی اعتبار سے دربارِ لاہور، ہندوستان بھر میں سب سے بڑی طاقت سمجھا جاتا تھا جس سے انگریز بھی خطرہ محسوس کرتے تھے۔

رنجیت سنگھ کی وفات سے بہت سال پہلے ہی انگریزوں نے پنجاب میں تخریب کارانہ سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ مہاراجہ نے انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ تو کر لیا تھا لیکن اسے ان کی دوستی پہ کبھی بھی سو فیصد اعتماد نہ تھا، چنانچہ ابھی انگریزوں اور مہاراج کے درمیان معاہدے کو دس سال ہی گزرے تھے کہ ۱۸۱۵ء میں انگریزوں کے پنجاب میں ایک اقدام کے خلاف مہاراجہ نے اپنے عمائدین کے خفیہ اجلاس میں انگریزوں کی نیت پہ شبہ کرتے ہوئے اپنے احساسات کا جو اظہار کیا وہ خالصہ دربار کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ ۱۸ مئی ۱۸۱۵ء کو دینا نگر میں منعقدہ دیوڑھی میں رنجیت سنگھ نے بھائی گوربخش سنگھ

وصنا مالوائی اور بعض دوسرے عمائدین کو تنہائی میں کہا:

"ظاہرہ چناں دریافت شد کہ ہر چند فیما بین سرکار و صاحبانِ انگریزیہ بہادر دوستی دلی است، لیکن از طرفین صرف ظاہر داری بکار می برد۔ لہٰذا بجای خود ہمیں تجویز می داشتم کہ اگر بین ما و صاحبان انگریز بہادر سوال و جواب نوع دیگر بعمل خواہد آمد گورکھا را طلبیدہ رفیق خود خواہم کرد۔ مگر نام بردہ چیزی عذر در سرکار کند قلعہ کانگڑہ با دشان دادہ او شان را رفیق خود کردہ خواہند شد"۔[۴۱]

ظاہر ہے یہاں گورکھا سے مراد جسونت رائے ہلکر ہے جو اس زمانے میں انگریزوں کا بد ترین دشمن تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی ابتدائی فتوحات کے بعد ہی کثرتِ مے نوشی اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا تھا۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں جرأت مند اور جری تھا۔ اس نے عیش کوشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس سبب سے پہلے ۱۸۲۶ء میں وہ سخت بیمار ہوا۔ درباری طبیبوں کے علاوہ یورپین ڈاکٹر مرے نے بھی علاج کیا۔ اس کے بعد ۱۸۳۳ء کے آخر میں مہاراجہ پر فالج کا شدید حملہ ہوا جس کی تفصیل مولوی احمد بخش یکدل کے روزنامچوں میں موجود ہے[۴۲]۔ یکدل کے مطابق سوکھاری رائے سا کستھ کی زبانی جو بیماری کی حالت میں مہاراجہ کے طبیبوں کو مشورے دیا کرتا تھا، یکدل کو معلوم ہوا کہ مہاراجہ اسہال کے مرض میں مبتلا ہے۔ چونکہ یکدل کے نزدیک افیونی کے لیے اسہال مہلک ہوتے ہیں اور مہاراجہ افیون کا عادی تھا اس لیے یہ مرض، فالج کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ سوکھاری رائے نے یہ اطلاع بھی دی کہ مہاراجہ کے بازو سے لے کر ٹانگ تک شدید درد ہے اور فقیر عزیز الدین نے مالش تجویز کی ہے حکماء اگرچہ مہاراجہ کو نہیں بتا رہے لیکن فی الحقیقت مہاراجہ پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے[۴۳]۔ یہ مرض روز بروز بڑھتا گیا اور مہاراجہ صاحبِ فراش ہو گیا۔ طبیبوں نے جان کی بازی لگا کر علاج کیا جس کے نتیجے میں رنجیت کو خاصا افاقہ ہوا اور وہ دوبارہ امورِ سلطنت انجام دینے لگا۔ طبیبوں نے مہاراجہ کو سختی سے منع کیا کہ وہ

آیندہ شراب نہ پیے۔

مہاراجہ کی بیماری اگر ایک طرف خالصہ دربار کے نامور حکمران کے لیے موت کی پہلی گھنٹی تھی تو دوسری طرف ارکانِ سلطنت کے لیے پنجاب کی آیندہ قسمت کے لیے سوچ بچار کا موقع فراہم کر رہی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ کی بیماری کے ساتھ ہی اندرونی اور بیرونی سازشوں کا عمل شروع ہو گیا۔ ایک طرف انگریزوں نے مہاراجہ کے عمایدینِ سلطنت پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور خود مہاراجہ کے پوتے نونہال سنگھ سے دوستانہ راہ و رسم بڑھائے تو دوسری طرف داخلی امور کے ذمہ دار ارکان نے انتظامِ سلطنت میں خلل اندازی شروع کر دی اور امورِ سلطنت میں ضعف پیدا ہو گیا۔ اس سلسلے میں یکدل نے بعض دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً جمعدار خوشحال سنگھ نے انگریزوں کے ایما پر کشمیر میں خانہ ویرانی شروع کی۔ مہاراجہ کی مرضی کے خلاف ہزاروں کشمیریوں کے گھر بے چراغ کر دیے[۲۴]۔ ملک کے داخلی حالات میں بدنظمی کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے یکدل نے لکھا ہے:

"امروز از ضعف حکومت معاینہ شد۔ کہ در شہری رفتم و دیدم کہ یک سپاہی سکھ بر اسپ سوار است و دواں دواں می آید مردم ہراسیدند۔ پیش قربوس او صرہ پنجہزار دینار بود کہ از پچھی ہٹہ از دوش صرافی دو گھڑی روز باقی ماندہ برداشت و اسپ دوا میند۔ در چار سوی گٹی نشستہ بودم و بالای چوکی ہمراہ یکی گفتگو می کردم کہ ناگہاں آن سوار گذشت"[۲۵]۔

مہاراجہ نے انگریزوں کے ساتھ اپنے دوستانہ معاہدے کی ہمیشہ پابندی کی لیکن انگریزوں کا دل مہاراجہ اور مہاراجہ کی سلطنت کی طرف سے صاف نہ تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ مہاراجہ کے پوتے کنور نونہال سنگھ کو انھوں نے اپنے جال میں پھنسایا ہوا تھا۔ جونہی مہاراجہ نے آنکھیں بند کیں، انگریزوں نے کنور نونہال سنگھ کو اپنے تاجدار باپ کے خلاف گستاخانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی شہ دی۔

مہاراجہ پر فالج کا دوسرا حملہ ۱۸۳۸ء کے موسم سرما میں ہوا۔ اس سال سرکار انگریزی کا فوجی مرکز افغانی مہم کے لیے فیروزپور میں قائم ہوا۔ گورنر جنرل آکلینڈ لاہور میں مہاراجہ سے ملنے آیا۔ اسے علم تھا

کہ طبیبوں نے مہاراجہ کو شراب منع کر رکھی ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے ہمراہ ولایتی شراب لایا اور خود پینے کے ساتھ مہاراجہ کو عمداً کثرت سے پلائی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ فالج کا یہ حملہ ۱۸۳۷ء میں نونہال سنگھ کی شادی کی تقریب میں کثرتِ شراب نوشی کے سبب ہوا۔ کنور نونہال سنگھ کی شادی پر انگریزی حکومت کی نمایندگی انگریزی حکومت کے کمانڈر انچیف ہنری فین کر رہے تھے۔ وہ بھی بھاری مقدار میں ولایتی شراب مہاراجہ کے لیے تحفے میں لائے تھے۔ شراب نوشی کی نجی محفل میں ہنری فین نے مہاراجہ سے اس قدر بے اعتدالی کرائی کہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔

بہرحال انگریزوں یا مہاراجہ کے دیگر حریفوں کی چالیں کامیاب ہوئیں اور مہاراجہ مختلف ہندو اور مسلمان مذہبی مقامات پر ۲۵ لاکھ روپیہ خیرات بھیجنے کے بعد بستر چھوڑ کر زمین پر لیٹ گیا اور بالآخر ۵ اہاڑ سمت ۱۸۹۶ مطابق ۱۱ر جولائی ۱۸۳۹ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔[۴۶]

مہاراجہ کے عہد کا اہم واقعہ سید احمد شہید کا جہاد تھا جو ۱۸۲۹ء میں رونما ہوا اور انگریزوں کے ایما پر اور بعض ناعاقبت اندیش عناصر کی غداری سے ناکام ہو گیا۔[۴۷]

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی باپ کی سیاسی پالیسیوں کا احترام کیا۔ اس کا زمانۂ سلطنت بہت مختصر ہے۔ کھڑک سنگھ ویسے بھی ارادے کا مضبوط اور امورِ جہانداری کے لیے موزوں نہ تھا۔ تاہم اس نے اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کو مجروح نہیں ہونے دیا چنانچہ مہاراجہ کی وفات کے تقریباً تین ماہ بعد ہی مہاراجہ کھڑک سنگھ نے شملہ میں گورنر جنرل آکلینڈ کی مزاج پرسی کے لیے خیر سگالی وفد روانہ کیا جس میں دیگر عمائدین کے علاوہ سردار لہنا سنگھ سردار ارجن سنگھ، رائے گوبند اور فقیر سید عزیز الدین قابلِ ذکر تھے۔ اس ملاقات میں آکلینڈ نے ان سرداروں کی خوب آؤ بھگت کی اور دل کھول کر ان سے راز اگلوائے۔ اس ملاقات میں جن موضوعات پر گورنر جنرل کی طرف سے سوالات ہوئے، ان کا تعلق زیادہ تر سید احمد شہید کے جہاد میں سکھوں کی فوجی حکمت عملی، ڈیرہ کی جنگ میں افغانوں کے خلاف کس طرح لڑائی کی گئی، شب قدر اور جمرود کے ہنگامے کی تفصیلات وغیرہ سے تھا۔ اس کے علاوہ پنجاب میں عدالتوں کا طریقِ انصاف اور معاشرتی زندگی میں

طوائف نوازی پر سوالات کیے گئے۔ ہر سوال اپنے اندر ایک واضح سیاسی مفہوم لیے ہوئے تھا۔ اسی ملاقات میں گورنر آکلینڈ نے سید احمد شہید کو شرارت پیشہ کہا جس کے خلاف سیاسی نزاکتوں کے پیشِ نظر فقیر سید عزیز الدین بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ اس ملاقات کی مکمل تفصیلات فقیر سید عزیز الدین کی سیاسی ڈائری میں موجود ہیں۔[۴۵]

راجہ دھیان سنگھ کے ہوسِ اقتدار، نونہال سنگھ کی سرکشی اور درباری امراء کی باہمی سازشوں نے مہاراجہ کھڑک سنگھ کو تخت سے کنارہ کشی پر مجبور کیا اور تمام امورِ سلطنت نونہال سنگھ کے ہاتھ میں آ گئے جس نے باپ پر ظلم و ستم روا رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ کھڑک سنگھ جب کنارہ کش ہو کر قلعہ بند ہوا تو بیٹے نے سخت بخار کی حالت میں اس پر ٹھنڈا پانی ڈلوا دیا۔ مہاراجہ کی وفات کے چند روز پہلے نونہال سنگھ اور دارالمہام دھیان سنگھ جب مہاراجہ سے ملنے گئے تو انہوں نے نونہال سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے کنور! تو چچڑ ہے"۔ یعنی ناخلف ہے۔

اس کے علاوہ بہت سے سراپ دیے اور کہا کہ تجھے سلطنت نصیب نہیں ہوگی۔

مہاراجہ کھڑک سنگھ کی دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۴۰ء میں مہاراجہ کھڑک سنگھ کی وفات پر باپ کی ارتھی جلا کر جب کنور نونہال سنگھ بادشاہت کے نشے سے مخمور استھان سے واپس آ رہا تھا تو سلامی کی توپوں کی گھن گرج کے باعث شاہی قلعہ کی دیوار سے ایک پتھر گرا اور سیدھا نونہال سنگھ اور اس کے دوست اودھم سنگھ کے اوپر آن پڑا۔ راج کنور بے ہوش ہو گیا اور قلعے تک زندہ جانا نصیب نہ ہوا۔ اس واقعے کی تاریخ کنھیا لال نے ۵۔ نومبر ۱۸۴۰ء درج کی ہے۔[۴۶]

نونہال سنگھ کی وفات کے بعد کچھ دیر اس کی والدہ رانی چند کور نے انتظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر راجہ دھیان سنگھ کے ایما پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک بیٹے کنور شیر سنگھ کو بٹالہ سے بلایا گیا۔ شیر سنگھ مہاراجہ ہی کے زمانے سے بٹالہ کا حکمران تھا۔ راجہ شیر سنگھ نے حکمتِ عملی سے لاہور کا تخت حاصل کیا۔ مہارانی چند کور کو کنیزوں کے ہاتھوں مروا ڈالا۔ انتظامِ سلطنت جرأت اور مردانگی کے

ساتھ انجام دینے لگا۔ مہاراجہ شیر سنگھ کی تخت نشینی کے واقعے کو اس دور کے ممتاز اردو شاعر مولوی غلام حسین خرم نے نظم کیا ہے۔[۱۲]

راجہ شیر سنگھ سرداران سندھانوالیہ کے ہاتھوں قتل ہوا اور پنجاب میں قانونی اور با استعداد راجوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ بیدل نے ایک جگہ لکھا ہے:

"شیر سنگھ ششم ماگھ سمت ۱۸۹۷ آمدہ بود و باز غرّہ اسوج سمت ۱۹۰۰ کشتہ شد۔ نونہال سنگھ را خدا گشت و چند کور را کنیزاں کشتند۔"[۱۳]

۲

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پنجاب میں خون کی جو ہولی کھیلی گئی، اس کا محلِ وقوع لاہور تھا۔ جن مورخین نے ان خونی مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان میں مولوی نور احمد چشتی، ان کے والد مولوی احمد بخش یکدل اور مفتی غلام سرور لاہوری قابلِ ذکر ہیں۔ نامی گرامی سکھ سردار حصولِ اقتدار کے لیے بساطِ سیاست پر آتے تھے اور معمولی پیادوں کی طرح پٹتے اور کٹتے چلے جاتے تھے۔ ایک طرف انگریزی کی شاطرانہ چالیں اور دوسری طرف راجہ دھیان سنگھ کی ہوسِ اقتدار، ناعاقبت اندیش سکھ فوج اپنے سرداروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہی تھی۔ تاریخِ پنجاب کے عمیق مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ دھیان سنگھ اور اس کا خاندان نہ قوم پرست تھا نہ وطن پرست۔ یہ دربار لاہور کے اہم ترین رکن ہونے کے باوجود درپردہ انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ خالصہ سلطنت کے خاتمے اور پنجاب پر انگریزوں کے قبضے میں راجہ دھیان سنگھ اور اس کے بھائی گلاب سنگھ کی خود غرضی اور موقع پرستی کا ہاتھ تھا۔ نونہال سنگھ کی اپنے باپ کھڑک سنگھ سے بدسلوکی، نونہال سنگھ کا عروج زوال، رانی چند کور اور راجہ شیر سنگھ کی فتح و شکست، کشمیر کی ویرانی اور دربار لاہور سے علیحدگی سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ انگریز اس ساری صورتحال سے بے خبر نہیں تھے بلکہ وہ دستِ غیب بن کر ہر

چال اور ہر حرکت و عمل میں برابر شریک نظر آتے ہیں۔

راجہ دھیان سنگھ کے ہاتھ میں رنجیت سنگھ نے مرتے دم کھڑک سنگھ کا ہاتھ دیا تھا۔ اس وقت کے بعد سے اپنی موت تک راجہ دھیان سنگھ اپنے آپ کو لاہور دربار کا امین اور بادشاہ گر سمجھتا رہا۔ جب تک راجہ کھڑک سنگھ قابو میں رہا، دھیان سنگھ اس کے گُن گاتا رہا لیکن جب اس نے ذرا سی من مانی کرنی چاہی، دھیان سنگھ نے فوراً کنور نونہال سنگھ کو باپ کے خلاف بھڑکا دیا اور یہاں تک گستاخ کر دیا کہ اس نے نہ صرف باپ کے جیتے جی اس سے حکومت چھین لی بلکہ اسے جس بے دردی اور بے رحمی سے موت کے منہ میں دھکیلا وہ تاریخ پنجاب کا ایک عبرت ناک واقعہ ہے۔ نونہال کی اچانک موت پر راجہ دھیان سنگھ نے رانی چندر کور کو صرف اس لیے گدی پر بٹھایا کہ وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان اپنے ہاتھ میں رہے گا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ رانی سندھانوالیہ سرداروں کی طرف جھک رہی ہے تو بٹالے سے راجہ شیر سنگھ کو لاہور پر قبضہ کرنے کی دعوت دے دی اور آخر کار لاہور اور اہلِ لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجا کر راجہ دھیان سنگھ نے رانی کو راجہ شیر سنگھ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس موقعہ پر دوسرے بھائی راجہ گلاب سنگھ نے قلعے کی ساری دولت لوٹ لی اور راجہ شیر سنگھ کے ہاتھ کوہِ نور ہیرے کی نحوست کے سوا کچھ نہ آیا۔ راجہ شیر سنگھ اچھا سیاست دان ہو یا نہ ہو وہ علم دوست اور اہلِ علم و ادب کا دوست تھا۔ نثار علی نکہت اور مولوی غلام حسین خرم کی شیر سنگھ کے دربار سے وابستگی کے شواہد موجود ہیں مولوی غلام حسن خرم نے راجہ شیر سنگھ کی تخت نشینی کا واقعہ ایک نہایت خوبصورت تضمین میں پیش کیا ہے جس کی بنیاد حافظ شیرازی کی ایک فارسی غزل ہے۔ یہ تضمین خرم کے دیوانِ اشعار میں موجود ہے جس کا مخطوطہ مضحکاتِ خرم کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ نظم اس جگہ تاریخِ پنجاب کے ایک اہم ماخذ کے طور پر درج ذیل کی جاتی ہے:

لکھا راجہ[۴۲] نے جب نامہ وٹالے[۴۳] طرف کا ملہا

کیا ہے بادشاہ[۴۴] اور شاہزادے[۴۵] کوچ منزلہا

تم اب تشریف لاؤ ہے تمہارا بخت شاملہا
الا یا ایہا الساقی اور کاسا و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولی افتاد مشکل ہا

کہیں امرا کی مسند راج کی رانی[46] کو می باید
کہا راجہ نے عورت بادشاہی کو نمی شاید
مناسب ہے بلانا شیر سنگھ کو خوب می آید
ببوی نافۂ کاخر صبا زان طرہ بکشاید
ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

سنا جب شاہِ عالم[47] نے کہ رانی راج می جوید
ڈملے سے چڑھے اس دم کے دست از صلح می شوید
کہا راجہ کے گفتہ پر دلم بسیار می پوید
بمی سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

غرض جب قلعہ بند امرا ہوئے لاہور میں باہم
درون بندوق بیرون توپ سے عالم ہوا برہم
کیا سرداروں نے آپس میں اسدم یہ سخن محکم
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

شہ قلعہ کشا پھر سنگوروں کیں فضل تھا شامل
ہوئے فتح و ظفر سے قلعۂ لاہور میں داخل

غضنفر[۷۸] سنگھ پار ستلج کے پکارے درد سے گھائل
شب تاریک و بیم موج و گرداب چنین حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

غرض جب شاہِ عالم کو ہوئی فتح و سعید آخر
کئی امرا ملے اور کئی پڑے قیدِ شدید آخر
جمعدار اس گھڑی بولا کہ جب نیکی ندید آخر
ہمہ کاری زخود کامی بہ بدنامی کشید آخر
نہاں کی ماند آں رازی کزو سازند محفلہا

بڑے اقبال سے ہے بادشہ لاہور کا حافظ
مری ستگور ہوئے اس بادشہ کے جابجا حافظ
ارے خورم تم چلو دربار میں کہہ کر خدا حافظ
حضوری گر ہمی خواہی از دغائب حافظ
متیٰ ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا[۷۹]

۱۸۔ جنوری ۱۸۴۱ء (۵۔ ماگھ سمت ۱۸۹۷) کو مہاراجہ شیر سنگھ تخت پر بیٹھا[۸۰] اور ۱۲۔ دسمبر ۱۸۴۲ء کو سرداران سندھانوالیہ نے مہاراجہ اور اس کے وزیر اعظم راجہ دھیان سنگھ کو قتل کر دیا۔ اس روز تین اہم قتل ہوئے۔ مہاراجہ، وزیر اعظم اور راج کنور پرتاپ سنگھ۔ قاتل سردار اجیت سنگھ سندھانوالیہ تھا۔ نونہال سنگھ اپنے باپ کھڑک سنگھ کے اور شیر سنگھ اپنی منہ بولی ماں چندر کور کے سراپ سے کیفرِ کردار کو پہنچا۔ اب لاہور دربار کا راج، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام نہاد بیٹے دلیپ سنگھ تک پہنچا۔ یہ برائے نام مہاراجہ اپنی ماں رانی جنداں اور اپنے ننھیالی رشتہ داروں کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا تھا۔ ان اقتدار کے بھوکوں سے سلطنت چھیننا انگریزوں کے لیے مشکل نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس دیرینہ منصوبے کو

عملی شکل دی جس کا نقشہ غالباً انہوں نے ۱۸۰۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کرنے کے ساتھ ہی تیار کر لیا تھا۔ سکھوں کے سامنے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے تھے جن کے پیش نظر معاہدہ شکنی اور جنگ کے سوا ان کے لیے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ورنہ ۱۸۴۴ء کے قریب انگریزوں کو پنجاب کی سرحد پر ۳۲ ہزار فوج جمع کر دینے کی کیا ضرورت تھی[۵۱]۔ مفتی علی الدین نے لکھا ہے کہ:

"سکھوں کے ستلج عبور کرنے کی خبر لارڈ ہارڈنگ کو دفعتہً اور غیر متوقع طور پر ملی۔ (مفتی کے بقول) سکھوں نے اکیس ہزار فوج اور بھاری توپ خانے کے ساتھ ستلج کو عبور کیا تھا اور ۱۹۔ دسمبر ۱۸۴۵ء کو دوپہر کے وقت موضع مدکی کے قریب جنگ شروع ہوئی اور حیرت کا مقام یہ ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کی "بے خبر" اور "غیر متوقع" فوج نے ایک ہی حملے میں سکھوں کے جم غفیر کو پسپا کر دیا۔ اس حملے کی کمان فیلڈ مارشل گف کے سپرد تھی جو اس زمانے میں انگریزی فوج کے کمانڈر انچیف تھے[۵۲]۔"

۱۹۔ دسمبر ۱۸۴۵ء سے ۱۰۔ فروری ۱۸۴۶ء تک سکھ اور انگریز آپس میں دست و گریباں رہے اور بالآخر پانچ جنگوں میں شکست دے کر انگریز سکھوں کے دارالحکومت لاہور میں ڈاکٹر محمد باقر کے بقول ۲۰۔ فروری ۱۸۴۶ء کو فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوئے[۵۴]۔ سید محمد لطیف نے لاہور میں انگریزوں کے داخلے کی تاریخ ۲۲۔ فروری ۱۸۴۶ء بیان کی ہے[۵۵]۔ لیکن مولوی احمد بخش یکدل جن کا یہ چشم دید واقعہ ہے، اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"۲۲۔ فروری ۱۸۴۶ء، ۱۲ پھاگن سمت ۱۹۰۲ (مطابق) ۲۴۔ صفر المظفر ہجری روز شنبہ بہ میانمیر رسیدند و روز سہ شنبہ داخل قلعہ شدند[۵۶]۔"

اس اعتبار سے انگریزوں کے قلعہ لاہور میں داخلے کی تاریخ ۲۵۔ فروری ۱۸۴۶ء مطابق ۲۷۔ صفر المظفر ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۵ پھاگن سمت ۱۹۰۲ منگل کے دن قرار پاتی ہے۔

مفتی علی الدین نے اس واقعے کی تاریخ ۲۲۔ فروری ۱۸۴۶ء بیان کی ہے لیکن یہ جنگ بندی اور

اعلان اور انگریزوں اور دربار لاہور کے درمیان صلح نامے کی ترتیب کی تاریخ ہے۔[۵۷]

مفتی علی الدین نے یہ بھی لکھا ہے کہ راجہ گلاب سنگھ نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو بروئے کار لاکر انگریزوں سے سکھوں کا قصور معاف کروا دیا اور ایک طرف رانی جنداں یا مہاراجہ دلیپ سنگھ سے دربار لاہور کی وزارتِ عظمیٰ اور دوسری طرف انگریزوں سے خیر خواہی کا خطاب حاصل کیا اور انگریزوں اور دربار لاہور کے درمیان ایک چار نکاتی صلح نامے پر دستخط ہوگئے۔ یہ اوائل مارچ ۱۸۴۶ء کا ذکر ہے۔ اس عہد نامے کے ذریعے انگریزوں نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ساری فوجی طاقت اور اقتصادی طاقت پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کی رو سے مہاراجہ دلیپ سنگھ پر لازم تھا کہ وہ مبلغ ڈیڑھ کروڑ روپیہ نانک شاہی تاوان جنگ کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو ادا کرنے جس میں سے مبلغ پچاس لاکھ روپیہ نقد اور باقی جلد از جلد ادا کرنے کی قید تھی۔ اس کے ساتھ ہی راجہ اس بات پر مجبور تھا کہ لاہور دربار کا تمام سامانِ حرب یعنی توپ خانہ اور دیگر اسلحہ سرکار انگریزی کے ہاتھ فروخت کردے اور اس کی رقم باقی ماندہ ایک کروڑ روپے میں سے وضع کرلی جائے۔ راجہ گلاب سنگھ نے معاہدے کے بعد چاہا کہ انگریزی فوج لاہور سے نکل جائے لیکن گورنر جنرل ہارڈنگ نے یہ عذر کیا کہ جب تک مہاراجہ کی طرف سے معاہدے کی تمام شقوں کی تصدیق نہیں ہو جاتی، انگریزی فوج لاہور میں ہی رہے گی۔ چنانچہ ۸ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدۂ لاہور کی تمام شرطوں کی مہاراجہ دلیپ سنگھ کی طرف سے تصدیق کے بعد گورنر جنرل نے لاہور پہنچ کر سر ہنری لارنس کو لاہور میں اپنا ریذیڈنٹ مقرر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ریذیڈنٹ کی حفاظت کے لیے لاہور میں انگریزی فوج کا ایک دستہ بھی مستقل رکھنا ضروری قرار دیا گیا۔

۲۷ فروری ۱۸۴۷ء سے ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء تک انگریز مہاراجہ دلیپ سنگھ کے نام نہاد سرپرست اور حکومت پنجاب کے مفادات کے امین رہے۔ اس دوران میں لاہور میں انگریز اپنی فوجی قوت بڑھاتے رہے۔ ۲۹ مارچ کو امانت داری کا یہ ڈرامہ ختم ہوگیا۔[۵۸] لارڈ ڈلہوزی نے فیروز پور کیمپ سے پنجاب کی رعایا کے نام بطور اشتہار ایک فرمان جاری کیا جسے سن کر پنجاب کے بے بس عوام خون کے آنسو پی کر رہ گئے۔ اس فرمان کا خلاصہ مفتی علی الدین کی کتاب عبرت نامہ اور ڈاکٹر محمد باقر کی انگریزی تصنیف

تاریخِ لاہور میں موجود ہے۔ اس فرمان کی رو سے سرکار انگریزی اور دربار لاہور کے درمیان ۱۸۰۹ء میں دستخط شدہ عہد نامہ لغو قرار دے دیا گیا اور تمام ملک پنجاب کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ فوجی طاقت تو لاہور میں پہلے ہی انگریزوں کے پاس تھی۔ ۱۸۴۶ء کے صرف ایک انگریزی فوجی دستے نے ۱۸۴۹ء میں دو لاکھ کی تعداد اختیار کر لی تھی۔[۵۹] اس صورت میں اہلِ پنجاب کے لیے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو معزول کر کے انگریزی حکومت کی سرپرستی میں لے لیا گیا اور اس کی "مفسدہ پرداز" ماں رانی جنداں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ اہلِ پنجاب نے دلیپ سنگھ کی معزولی اور حکومت پنجاب کے خاتمے کا سوگ منایا اور معاصر شعراء نے دردناک تاریخیں موزوں کیں۔[۶۰] یوں پنجاب کا ایک اہم سیاسی دور ختم ہو گیا۔

معاشرت اور تمدنی ماحول

انیسویں صدی کا پنجاب، معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار نظر آتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے ضعف اور مرکز کے عدم استحکام نے پنجاب میں جس جاگیردارانہ نظام کو جنم دیا اس میں تمدنی اقدار کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اہلِ پنجاب نہ صرف تہذیبی اور تمدنی انحطاط کا شکار ہوئے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی انہیں ایک ایسے آشوب کا سامنا کرنا پڑا جس میں اہلِ پنجاب کئی اعلیٰ انسانی اقدار سے بھی محروم ہو گئے۔ یوں تو یہ سلسلہ اورنگ زیب کی وفات سے پہلے یعنی اٹھارویں صدی میں ہی شروع ہو چکا تھا[۶۱] لیکن انیسویں صدی میں اس کے نقوش بالکل واضح ہو چکے تھے۔ نادر شاہ کے حملوں نے اگر مغلیہ سلطنت کی سیاسی کمزوری کو بے نقاب کیا تھا تو احمد شاہ اور اس کے جانشینوں کے حملوں نے پنجاب میں مسلمانوں کے تہذیبی اور سیاسی وقار کی جڑیں بھی کھوکھلی کر دیں۔ اہلِ پنجاب کی معیشت بالکل تباہ ہو گئی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں پنجاب کے ایک شاعر شاہ مراد لاہوری نے احمد شاہ کے پوتے شاہ زمان کے لاہور پر حملے کے بارے میں تاثرات یوں بیان کیے ہیں:[۶۲]

زہے شاہے کہ از کابل بلاہور   چوں وحشی آمد و دیوانہ ساں رفت

نمی زیبد مراد را شاہ گفتن ۔۔۔ چہ شد گر نام سلطانی بہ آں رفت
نہ ذوق سکہ نے پروائے خطبہ ۔۔۔ نہ اندیشہ کہ سود آمد زیاں رفت
براہِ غارت و تاراجِ پنجاب ۔۔۔ چوں دزد آہستہ تر آمد دواں رفت
ز دست جور آں غولِ بیاباں ۔۔۔ عجب حالت بجانِ شہریاں رفت
زمانی بر زمینی کس نیا سود ۔۔۔ زِ عالم راحت و امن و اماں رفت
کجا در بتکدہ ناقوس ماندی ۔۔۔ کہ اکثر از مساجد ہا اذاں رفت

اسی نظم میں پیر مراد شاہ لاہوری نے اہلِ پنجاب کی زبوں حالی اور شاہ زمانی لوٹ مار اور قتل و غارت سے پیدا ہونے والی تباہی اور ویرانی کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے اور شاہ زمان کے لاہور سے واپس جانے کا سال ۱۲۱۱ھ بیان کیا ہے۔ اہلِ لاہور کی بیچارگی اور سپاہِ درانی کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

نہ از مردانیاں آمد بعالم ۔۔۔ ہر آں جوری کہ از درانیاں رفت
بہر یک بود یک منزل مقامی ۔۔۔ چوں وقت کوچ شد غارت کناں رفت
بپاسِ زندگاں بر دن بیک سو ۔۔۔ کفن اکثر ز جسمِ مردگاں رفت[۶۳]

شاہ مراد لاہوری نے فارسی کے علاوہ اردو زبان میں بھی ایک شہر آشوب لکھا ہے جس میں شہر لاہور کی عظمت اور زیب و زینت بیان کرتے ہوئے آخر میں احمد شاہ اور شاہ زمان کے ہاتھوں اس کی ویرانی اور تباہی کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ نظم اٹھارویں صدی میں لاہور کی معاشرتی زندگی پر بہترین دستاویز ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہ نظم پوری یہاں درج کر دی جائے:

شہر لاہور قبۂ اسلام ۔۔۔ روشن آفاق میں ہے جس کا نام
خوبی اس کی بھی شہرۂ آفاق ۔۔۔ حسن کا اس کے تھا جہاں مشتاق
اصفہاں ہے جو ایک نصف جہاں ۔۔۔ خوبیوں میں نہ تھا کچھ اس سے کلاں
دور و نزدیک تھا یہی مشہور ۔۔۔ اپنے نزدیک تھا بہت سا دور

تھا عمارت سے یہ قوی بنیاد ربعِ مسکوں میں افتخارِ بلاد
تھا بہشتِ بریں بروئے زمیں عجب انساں تھے اس مکاں کے مکیں
ایک سے ایک تھے دو صد چنداں سب ملائک صفت ولے انساں
اولیاء و مشائخ و سادات علماء اک سے اک ستودہ صفات
شاعر و شعر فہم و شائقِ شعر طبع موزوں، فہم لائقِ شعر
شہر تھا یہ کہ کانِ علم وادب کان کیا بلکہ جانِ علم و ادب
کیا بہار اس کی میں کروں تحریر شہر تھا یا مرقعِ تصویر [۶۴]
گلعذاروں پہ حسن کی تھی بہار گل تھے ہر ایک کے گلے کا ہار
کھینچتے تھے دکھا کے رخ، دل کو خانہ خانہ میں تھے کماں ابرو
عقل قبضے میں کس کے رہتی تھی جاں ہو قرباں دل سے کہتی تھی
خوبرو تھے حیا سے سب موصوف اور عاشق وفا سے تھے معروف
راہرو تھے سبھی طریقت پہ تھا قدم "منظر الحقیقت" پر
اشک آبادیٔ جہاں تھا یہ الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ
سو زمانے نے ایسی زشتی کی خوبی اس قطعۂ بہشتی کی
کوئی اس میں پڑا جو بوم قدم [۶۵] ہے اب اس کا وجود اشک عدم
ہے مکاں کو شرف مکینوں سے نہ کہ دوں ہمتوں کمینوں سے
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے مکھیوں کی غرض دہائی ہے!
"زر تو شاہِ زماں سدھارے لے مکھیوں کو گئے اجارے دے"
"اسی صورت سے آ کے احمد شاہ تھا گیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ [۶۶]

ایک طرف افغانوں کی غارت گری اور دوسری طرف سکھوں کی لوٹ مار اور مسلم کشی؛ پورا پنجاب

بالعموم اور لاہور بالخصوص اس تباہی کی زد میں تھا۔ اس زمانے میں لاہور سے گزرنے والے بعض غیر ملکی سیاحوں نے بھی اس ویرانی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ شہر کے گرد و نواح میں ویرانے کثرت سے دکھائی دیتے ہیں جن میں ہُو کا عالم ہے اور کوئی متنفس نظر نہیں آتا۔

اس دور کی معاشرتی اور تمدّنی ابتری کا نقشہ مولوی احمد بخش یکدل نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"یاد دارم کہ چوں کشتیِ مغلیہ و سلطنت چغتائیہ غرق شد و برہم خورد جدّ شریف بندہ و اجداد تمام شرفا و سادات عظام و علمائے کرام وغیرہ ہر گروہ سفید پوشان قلم پرست چہ ہندو چہ مسلمان جامۂ سوگواری پوشیدند، از آنکہ مسلط مو بسران یعنی سکھان دہقان مزاج زانو برہنہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھنگہ خور و بعدہٗ مال مردم خوار و آتش زن و دزد، شدہ شدہ سلطنت شد۔ آن بزرگان بعضی روانۂ شاہجہان آباد و حیدر آباد و لکھنؤ و مکہ و مدینہ و مصر و روم و شام و بعضی بخراسان و بہاولپور و حیدر آبادِ سندھ و آنانانی کہ قوت نداشتند و شرفا بودند، در ہمین لاہور بگوشہ نشستہ بعض بافندگی و بعض صلہ چینی و بعضی معماری و بعضی سبد بہ داری و بعضی معلمی و بعضی زرہ فروشی و بعضی گدائی دیہات۔ ہمیں طور خلقی افتادہ ماند و حیران و پریشان، تا آنکہ درہمان غم از جہاں رفتند"۔[۷۰]

اس افراتفری، بدامنی اور کس مپرسی کے ماحول میں اہلِ لاہور جس تہذیبی اور اخلاقی زبوں حالی کا شکار تھے، اس کا اہم تقاضا یہ تھا کہ ظلم و استبداد کی ان طاقتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے، جو پنجاب پر تین سکھ حکمرانوں کی شکل میں مسلط تھیں۔ چنانچہ اہلِ لاہور نے رنجیت سنگھ کو قبضے کی دعوت اس لیے نہیں دی تھی کہ انھیں خیر و سلامتی کی انقلاب آفریں تبدیلیوں کی توقع تھی بلکہ اس لیے کہ ممکن ہے نظامِ سیاست کی تبدیلی خیر و سلامتی کی کوئی نوید لے کر آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضے کے فوری بعد یہاں کے معاشرتی اور تمدنی نقشے میں بعض اہم اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا

کردیں۔ بکھرل کا کہنا ہے کہ رنجیت سنگھ نے لاہور میں داخل ہوتے ہی اہل شہر کے بے جان اور مایوس جسموں میں زندگی کی ایک تازہ لہر دوڑا دی۔ چنانچہ لکھا ہے:

"در ترمیم قلعہ و فصیل شہر و شالامار کہ تمام منہدم شدہ بود ہمت گماشتہ مردم لاہور از اہلِ کسب را کہ از مدتِ مدید در بیکاری و فرصنداری مضمحل شدہ نفس شماری می کردند، جانی تازہ در قالب دمید و شبانگاہ کہ نوبت در ہر محلہ بندوق بدست بودہ شب بسحر آوردہ از خوفِ دزدان روز نمی آسودند، در عہد غفلت باستراحت پرداختند۔ رنجیت فیل سوار، بعد ہر ہفتہ بسیر اسواق مرہ ہای دہ ہزار روپیہ بدست بر آمدہ بر عایا می انداخت و ہر یکی را بلباس سفید و عمارات بیوت و دکاکین باسلوب خوش موکد میشد و تمام دزدانِ موسر جوق در جوق آمدہ نوکر شدہ باسپ و سلاح و دو شالہ گرامند و اسپ ولایتی و حلقۂ طلا ممتاز گردیدہ، باعث امن و امانِ خلق اللہ شدند و ترتیب دفتر و ضع ولایت پسندیدہ ہر یکی از اہل قلم را بقلمدان ہای و خلعتِ ثمین و مشاہرۂ کثیر ارجمند ساخت۔ جملہ اہل بیشہ سرگرم کار و بخوشنوشتی و گرم جوشی و عشرت لیل و نہار منصور شدہ و شکرانہ ہا بدرگاہ کردگار گزاردند"[۴۶]

رنجیت سنگھ کے اس اقدام نے نہ صرف اہلِ لاہور کے ستم زدہ دلوں کی تالیف کی بلکہ وہ تھوڑی دیر کے لیے رنجیت سنگھ کے ذاتی کردار اور نصب العین کو بھی فراموش کر گئے جس میں تعصب، خود غرضی اور موقع پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ زمانے کے نشیب و فراز اور حصولِ اقتدار کی جدوجہد نے نہ صرف رنجیت سنگھ کو مردِ آہن بنا دیا تھا بلکہ اس مادر زاد بے سواد کے اندر بعض ایسے جوہر بھی پیدا کر دیے تھے جو ایک مہاراجہ کے واقعی شایانِ شان ہوتے ہیں۔ معاملہ فہمی، تدبر، موقع شناسی، قوتِ فیصلہ، سیاسی سوجھ بوجھ اور مردم شناسی غرضیکہ بے شمار خوبیاں تھیں جن کے اظہار کا موقع اسے سلطنت پنجاب کے استحکام کے بعد میسر آیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کو جن اصولوں پر از سر نو ترتیب دیا۔ اس میں ہر چند کہ اس کے فرقہ وارانہ اور مذہبی تعصبات کو امتیاز حاصل تھا اس کے باوجود ان میں کسی حد تک مساوات اور اہلِ شہر کے معاشرتی اور شخصی حقوق کا تحفظ موجود تھا۔ اس حکمتِ عملی نے اہلِ لاہور کو نہ صرف جینے کی امید دلائی بلکہ ان میں احساسِ اپنائیت بھی پیدا کر دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اہلِ پنجاب اور بالخصوص اہلِ لاہور کے لیے احساسِ اپنائیت کوئی معمولی نعمت نہیں تھا۔

۱۸۰۹ء میں مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہلکر کی ملاقات کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی سلطنت کے لیے جو انتظامی ڈھانچہ پسند کیا اس میں مغلیہ طرزِ حکومت کا اثر موجود تھا بلکہ بعض مورخین نے تو اسے مغلیہ طرزِ حکومت کا بے روح چربہ قرار دیا ہے۔ ہلکر کی ملاقات نے جہاں مہاراجہ کو انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھانے کی طرف متوجہ کیا وہاں اس میں خود اعتمادی اور کشورکشائی کی ایک نئی روح بھی پیدا کر دی۔ مہاراجہ، ہلکر کی شخصیت کا بے حد احترام کرتا تھا اور اسے اپنا آئیڈیل تصور کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی اسے ہلکر کے ساتھ تشبیہ دیتا تو مہاراجہ بہت خوش ہوتا۔ مثال کے طور پر ۱۸۱۲ء میں ایک موقع پر ثابت خاں افغان نے مہاراجہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مہاراجہ سپاہ نوازی اور جوہر شناسی میں راجہ جسونت راؤ ہلکر کی طرح ہے۔ جس پر مہاراجہ بے حد خوش ہوا۔ خالصہ دربار کے سرکاری ریکارڈ سے کرنل گیرٹ اور جی۔ ایل۔ چوپڑا نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں ترجمہ کیا ہے:

"That dignitory that the late Maharaja Jaswant Rao Hulkar Bahadur was a true patron of Soldiers like him, and that now the most High God seemd to have created the noble Sarkar to act like him. This pleased the noble Sarkar."[67]

مہاراجہ کے دوستوں اور مخالفین دونوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ نہ صرف محض سپاہ اور لشکر کی حد تک ہی جوہر شناس نہیں تھا بلکہ وہ زندگی کے جس شعبے میں بھی کوئی جوہرِ قابل دیکھتا جتنی المقدور اور

حسبِ استعداد اس کی قدردانی ضرور کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اس کی ابتدائے سلطنت سے لے کر وفات تک برابر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۳۔ اکتوبر ۱۸۱۲ء کو مستری میر محمدی کے بارے میں بتایا گیا کہ اس نے گولہ پھینکنے کی ایک نئی جرثقیل ایجاد کی ہے۔ مہاراجہ نے اسے انعام کے ساتھ پشمینے کی ایک عمدہ شال بھی عنایت کی۔[۶۶] ۲۸ ستمبر ۱۸۱۴ء کو جلال قالین باف کے فن سے متاثر ہو کر اسے بنارس کا بنا ہوا کمخواب کا ایک دوپٹہ بطور انعام دیا گیا۔[۶۷]

اسی طرح قاضی فقیر اللہ کے علمی تقدس کے پیش نظر ۱۸۱۱ء میں عید الاضحیٰ کے موقع پر انعام کے علاوہ انہیں پشمینے کی گراں قیمت شال پیش کی گئی۔[۶۸]

مہاراجہ کی حکمتِ عملی نے لاہور کی معاشرت میں جس خوشحالی کی لہر دوڑائی اس میں ظاہری چمک دمک اور شان و شوکت زیادہ تھی۔ مقصد شاید یہ تھا کہ لوگ بجائے ظاہرداری کی طرف رہے اور لوٹ کھسوٹ اور معاشرتی ناانصافیوں پر نہ جائے جو مہاراجہ کے دور کا خاصہ تھیں اور جن میں مہاراجہ کا ذاتی کردار مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

رنجیت سنگھ کی متنوع شخصیت نے اس دور کے پورے معاشرتی نظام کو یک رنگی سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اس دور کا پورا معاشرہ کسی نہ کسی اعتبار سے ان انسانی برائیوں کو ضرور اپنائے ہوئے تھا جو رنجیت سنگھ کی ذات اور اس کے ہم کارانِ حکومت کی شخصیت میں موجود تھیں۔ اہلِ لاہور اس دور کی ظاہری خوشحالی میں مست نظر آتے ہیں۔ ماضی میں انہوں نے افغانوں اور سکھوں کے اس قدر مظالم دیکھے تھے کہ انہیں معمولی سے معمولی رعایت بھی بہت بڑا انعام نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس دور کے مصنفین نے انیسویں صدی کے آغاز میں لاہور کی معاشرت کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ چند ایک مثالیں بے محل نہ ہوں گی۔

مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقاتِ چشتی بسنت کے دن، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حضرت مادھو لال حسین کے دربار پر حاضری کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں:

"جب اس طرح فوج جم جاتی تو بوقت دو بجے سواری مہاراجہ کی قلعہ سے نکلتی اور تمام مخلوقات جو منتظرِ دیدارِ سرکار ہوتے تھے، جب توپوں کی آواز اور ننگ سلامی

سننے تو ہشاش بشاش ہو کر خندہ زن ہوتے۔ جب مہاراجہ کی سواری میلہ میں آتی تو یہ لطف ہوتا تھا کہ اب اس کی یاد میں چشم آب ہوتی ہے۔ کم از کم ساٹھ ستر ہاتھی اور چار پانچ سو گھوڑے بازین ہائے مرصع و تمام ڈیرہ سواران مارماری اور دو رجمنٹ پیدل اور رول جلو میں ہوا کرتی تھیں اور شاہ سے گدا ایک ہر شخص بسنتی پوش ہوا کرتا تھا بلکہ در و دیوار بسنتی نظر پڑتے تھے اور مہاراج مٹھیاں روپوں کی بھر بھر کر تصدق کرتے اور پھینکتے ہوئے تا مزار پُر انوار حضرت مادھو لال حسین کے پہنچتے اور بعدہٗ سواری سے اتر کر پیادہ بہ ارادت تمام مع رؤسائے عالی مقام پیر برہنہ خانقاہ کے دروازے سے اندر جاتے۔ پھر تُفنگ سلامی کی ہوتی۔ پھر گیارہ سو روپیہ نقد مع دو شالہ بسنتی خانقاہ پر نذر چڑھا کر جبیں سائی کے بعد رونق افزائے خیمہ شاہی ہوتے تھے۔ وہاں عرش سے فرش تک تمام بسنتی اشیاء موجود و حاضر ہوتی تھیں۔ پھر حسب معمول خود، یعنی ایک روز دسہرہ اور دوسرے روز بسنت تمام ملازمین سے نذریں اعلیٰ نذر مراتب لیکر با خلعت ہائے فاخرہ ہر ایک کو سرفرازی بخشتے تھے اور پھر عطر و عبیر اگال بطور شروع جشن ہولی اڑتا تھا۔ پھر لالہ رُخانِ حور وِش یعنی طوائفانِ لاہور و امرتسر جو حسب الحکم اس روز وہاں حاضر ہوا کرتی تھیں، مجرائے شاہانہ ادا کر کے نوبت بنوبت بتقریب تفریح طبع سرکار ناچ میں مشغول ہو کر بانعامات گوناگوں سرفراز ہوا کرتی تھیں اور جو نذر کا روپیہ واشرفی اس روز مہاراج کی خدمت میں جمع ہوتا وہ بتقریب انعام یوم بسنت خدمت گاران کو تقسیم ہو جاتا تھا بلکہ ماسوا اس کے ایک ایک ماہ کی تنخواہ تمام فوج سواری و پیادہ کو بطور انعام تقسیم ہوتی تھیں۔ جس وقت غروبِ آفتاب قریب ہو جاتا تو پھر سواری مہاراج کی بوضع سابقہ برآمد ہوا کرتی تھی اور اس طرح روپیہ پھینکتے ہوئے داخلِ قلعہ ہوتے تھے۔[۲۳]

مولوی نور احمد چشتی کے والد مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے بھی اپنی بیاضوں میں عہدِ رنجیت سنگھ کے بعض جشن واردن کا ذکر کرتے ہوئے خواص اور عوام کی ان میں والہانہ شمولیت کا حال بیان کیا ہے ۔ مہاراجہ کی عیش پرستی نے مسر لیپل گرفن کے بقول لاہور کے بازاروں کو گناہوں سے بھر دیا تھا مہاراجہ اور اس کے امراء سرِعام رنگ رلیاں مناتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسر لیپل گرفن نے اس زمانے کے لاہور کو بکاڈلی سرکس سے تشبیہ دی ہے[۴۴]۔ مہاراجہ نے اہلِ لاہور کے گرد امن و خوشحالی کا ایک ایسا حصار قائم کر دیا تھا جس کے باہر انہیں دیکھنے کی خواہش ہی نہیں تھی۔ لوگ اس ہنگامہ اور عیش و نشاط سے کس قدر خوش تھے اس بات کا اندازہ بعض معاصر ادبی شہادتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ مہاراجہ کی قائم کی ہوئی یہ رسمیں یوں تو خالصہ دور حکومت کے آخر تک کسی نہ کسی صورت میں نظر آتی ہیں لیکن مہاراجہ اور اس کے ایک جانشین مہاراجہ شیر سنگھ کے دور میں ان کو جو عروج حاصل تھا، تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مولوی غلام حسین خورم، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کا ایک اہم اردو شاعر ہے اور مہاراجہ شیر سنگھ کے دربار میں اسے خاص طور پر رسائی اور اہمیت حاصل تھی۔ خورم کے دیوان میں ہولی[۴۵] پر مندرجہ ذیل نظم اس دور کی معاشرت اور طرزِ زندگی کی دلچسپ تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ خورم لاہور میں ہولی کے جشن کا یوں ذکر کرتا ہے:

خصوصی بلدۂ لاہور ہے خوشی کا مکان
عجیب شہر ہے دنیا میں اک بہشت نشان
خلائق اس میں ہے دن رات چین سے گزران
جب آئیں ہولی کے دن سارے لوگ پیر و جوان
دکھائیں ایک عجائب بہار ہولی میں

کہیں اکھاڑے جوانوں کے بندھے جاتے ہیں
کہیں جوان وہاں گاتے ہیں بجاتے ہیں
وہ اپنے شوق سے سُر تال سے ملاتے ہیں
نہ پوچھو ہم سے عجب اک سماں بناتے ہیں!

عجب اکھاڑوں کی ہوتی بہار ہولی میں

ملے والوں کی ہوتی ہے ان دنوں میں جنگ
گلال اپنے کو پھینکے ہیں ڈالتے ہیں رنگ
بجانے ڈھولکی، طنبور اور ستار مچنگ
بجانے گانے سے کرتے ہیں راگ رنگ کا ڈھنگ

جگہ جگہ میں کریں یہ شمار ہولی میں

عجب بہار سے ہوتا ہے عیش ہی سالم
تمام خلق ہے ان روزوں میں پڑی بے غم
خوشی تو ہوتی بہت اور فکر ہوتی کم
تو اپنے ذوق سے خورسند ہوا رے خورم

ترے یہ خمسے کی ہوگی بہار ہولی میں[56]

اس خمسے میں خورم نے سوانگوں، نوٹنکیوں، بہروپیوں اور بازی گروں کا ذکر کر کے جشنوارے کی ہنگامہ پرور اور گہما گہمی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین ایسی رنگ رلیوں اور ہنگاموں کے بے حد شوقین تھے۔ خالصہ عہد میں اہلِ لاہور اکثر عیش و نشاط کے ایسے مواقع میں شریک نظر آتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ خود عیش و نشاط کا بے حد دلدادہ تھا، طوائفوں، اہلِ سرود اور بازاری طبقوں کے لوگوں کو اس کے عہدِ حکومت میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ موراں طوائف کے نام پر سکہ ضرب ہوا تھا جس کا نام موراں شاہی رکھا گیا۔ امرتسر کی طوائف گل بیگم مہاراجہ کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ مہاراجہ اپنی سپاہی اور فوجی مہموں سے جو کچھ لوٹ مار کر کے لاتا اس کا ایک اہم حصہ عیش و نشاط اور رنگ رلیوں پر صرف کر دیتا تھا۔ اس دور میں بازاری اور رذیل طبقے کو جو اہمیت حاصل تھی شاید اس کے پیشِ نظر مولوی احمد بخش یکدل نے رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت کو "کنجر شاہی" کا نام دیا ہے۔

رنجیت سنگھ سے لے کر دلیپ سنگھ تک خالصہ عہد کی نصف صدی کا لاہور معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے مختلف طبقوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں اشراف بھی تھے اور ارذل بھی۔ طبقہ اعلیٰ میں امرائے سلطنت، نامور سردار، روٴسا، ایلچی اور ہر مذہب و ملت کے علماء اور فضلاء شامل تھے۔ اسی طرح ادنیٰ طبقے میں کاسب، متخدمین اور دیگر اہلِ حرفہ کا نام لیا جاتا تھا۔

ایبٹسن نے ۱۸۸۱ء میں مردم شماری کی جو رپورٹ مرتب کی تھی اس کی رُو سے لاہور مختلف پیشوں اور کاموں کے اعتبار سے ذاتوں اور گوتوں کا جنگل نظر آتا ہے۔ معاشرت کا یہ نقشہ انیسویں صدی کے آغاز میں بھی یونہی تھا۔ اس دور کی معاشرتی زندگی کا بہترین مرقع مولوی نور احمد چشتی کی تصنیف "یادگارِ چشتی" ہے جس کو اس دور کی معاشرتی زندگی کا اہم ترین آرگن کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی احمد بخش یکدل کے روزنامچوں میں اس دور کی معاشرت کی جو جھلکیاں ملتی ہیں، ان کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں کہ خالصہ عہد میں لاہور اپنی معاشرتی اور تمدنی شان و شوکت اور زیب و زینت کے اعتبار سے عروس البلاد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اہلِ فن کی تعداد مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے دورِ حکومت میں کم نہ تھی۔ ہر چند کہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کا زمانہ اہلِ فن کی قدردانی اور ہمت افزائی کا دور نہیں تھا، پھر بھی اس دور میں لاہور کا اہلِ علم اور اہلِ ہنر کا مرکز ہونا حیرت انگیز ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ خود جاہل اور ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اہلِ علم کے منصب کو نہیں پہچانتا تھا، تاہم چونکہ اسے کشور کشائی اور شہامت میں نبوغ کا درجہ حاصل تھا اس لیے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے ہر میدان کے صاحبانِ فن اسے اچھے لگتے تھے اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایسے لوگ اس کی مملکت میں موجود رہیں اور اس کی شہرت کا باعث بنیں لیکن ان کی سرپرستی کے بارے میں وہ کبھی نہیں سوچتا تھا۔

خالصہ حکومت کی سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی۔ اس حوالے سے خالصہ دورِ حکومت میں مسلمانوں کو تہذیبی برتری حاصل تھی۔ سکھ دور کے تمام وزراء اور عمائدین فارسی زبان کی تعلیم سے آراستہ تھے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دوسری اہم زبان "اردو" بھی عام تھی۔ درس و تدریس کا سارا انتظام مسلمان علماء کے

بانئو میں نھا یہی وجہ ہے کہ سکھوں کی مسلمانوں کے ساتھ سخت نفرت اور ریشہ دوانیوں کے باوجود سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان استاد اور شاگرد کے رشتے سے عزت و احترام کا ایک تعلق موجود تھا مسلمان علماء نے درس و تدریس کے ذریعے سکھوں کی وحشت و بربریت کو اس حد تک نہ بڑھنے دیا کہ وہ مسلمانوں کی ہلاکت کا سبب بن جاتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین سکھ مذہب کے پیرو کار ضرور تھے لیکن عقاید کے اعتبار سے وہ مذہبی کم اور توہم پرست زیادہ تھے۔ یہ توہم پرستی انہیں ہمیشہ ایک انجانے خوف میں مبتلا رکھتی تھی اور وہ اس خوف پر قابو پانے کے لیے ہمیشہ مندروں کے پروہتوں، گوردواروں کے گیانیوں اور مزارات کے مجاوروں کے محتاج رہتے تھے۔ یہ توہم پرستی محض خالصہ دربار تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس دور کا پورا معاشرہ اس روحانی اور نفسیاتی مرض میں مبتلا نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں پنجاب جس سیاسی اور معاشرتی صورتحال سے دوچار تھا، اس کے نتیجے میں توہم پرستی کے خیالات کا اس سرزمین میں پھلنا پھولنا ایک قدرتی امر تھا۔ گوردواروں اور مندروں کو لاکھوں روپے کا چڑھاوا بھیجنے کا سبب مہاراجہ اور اس کے جانشینوں کا مذہبی اشتیاق نہیں بلکہ توہم پرستی کا نتیجہ تھا۔ مہاراجہ کی مسلمان صوفیا اور اہل اللہ کی نسبت عقیدت بھی اسی زمرے میں آتی ہے

خالصہ حکومت کے دور میں لاہور کی معاشرت بے شمار سماجی واحدوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ سماجی واحدے ذاتوں اور گوتوں کی شکل میں خاندان بنا کر رہتے تھے اور اپنے رسم و رواج، عادات و خصائل عقاید حتیٰ کہ لباس اور طرزِ گفتگو کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر کی تفصیل مولوی نور احمد چشتی نے اپنی گرانقدر تصنیف "یادگارِ چشتی" میں درج کر دی ہے۔ چشتی نے جن ذاتوں اور گوتوں کو قابلِ ذکر سماجی اکائیاں تسلیم کرتے ہوئے ان کے آدابِ معاشرت کی تفصیل دی ہے اور ان کے تولد و تناسل کے دستور بیان کیے ہیں ان میں شیخ، نائی، چابک سوار، کلال، گگے زئی، میراثی، راجپوت، خوجہ، باجوہ، گوجر، ارائیں، دبّہ گر، بہشتی، نان بائی، کاری گر، شال کوب، گاٹرہ باف، جولاہے، چھپربند، سید، مغل، رنگریز، ٹھٹھیرا، مہتر، دھوبی، ملاّ، آہن گر، سنار،

قرابتی، طاباف، خراسی، بھلیرا، درزی، گُڈی والا (پتنگ ساز)، کنجنی، موچی، کھڈیہ اور تارکش قابلِ ذکر ہیں۔[۶۹]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے لاہور کی معاشرتی تشکیل میں ادنٰی سے ادنٰی اور اعلٰی سے اعلٰی طبقے کے افراد کو بھی اہمیت حاصل تھی۔

فوقیت کے اعتبار سے ان طبقوں کو مندرجہ ذیل ترتیب میں دیکھا جا سکتا ہے:

۱۔ امرا اور عمائدینِ سلطنت

۲۔ شرفاء اور اہلِ علم

۳۔ پیشہ ور اور کاسب

۴۔ تاجر

۵۔ اہلِ حرفہ

۶۔ کاشت کار

لاہور میں اکثریت مسلمان رعایا کی تھی لہٰذا مسلمانوں کو پابندیوں کے باوجود خالصہ حکومت کی طرف سے بعض مراعات بھی حاصل تھیں۔ سکھ سرداروں کی مسلم دشمنی اور مخالفت کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ اور راجہ شیر سنگھ مسلمان علماء قاضیوں اور مفتیوں کا احترام کرتا تھا اور ان کی فرمائشوں کو حتی الوسع تسلیم کر لیتا تھا۔ مثال کے طور پر ۱۸۴۰ء میں رنجیت سنگھ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جب گامے شاہ نے عاشورے کے دن تعزیہ تیار کیا تو مہاراجہ نے گامے شاہ کو مع تعزیہ زندہ جلا دینے کا حکم دیا لیکن لاہور کے قاضی مسیح الدین نے مہاراجہ سے گامے شاہ کی جان بخشی کی سفارش کی تو اسے فوراً مان لیا گیا۔ یہ سب باتیں ایک طرف لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خالصہ عہد میں سوائے سکھوں کے کسی قوم کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ مہاراجہ اس قدر خود غرض تھا کہ اپنی قوم کے مفاد کے سامنے بڑے سے بڑے اصول کی قربانی دے سکتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ، اس کے جانشین اور اس کے عمائدینِ سلطنت بے حد عیش پرست اور

بست اخلاق تھے۔ ان اخلاق سوز حرکات کا مظاہرہ وہ برسرِ عام کرتے تھے اور عوام الناس کو بھی گناہوں کی ترغیب دیتے تھے۔ رنجیت سنگھ اور اس کے امراء شراب کے نشے میں چور بازاری عورتوں کے جمِ غفیر میں لاہور کی سڑکوں پر نمودار ہوتے تھے اور ان کے شاہی جلوس شان و شوکت کا کم اور گناہگاری اور مردم آزاری کا زیادہ مظاہرہ کرتے تھے۔ لوٹ کھسوٹ اور چور بازاری کا دور دورہ تھا۔ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین تمام پنجاب سے دولت لوٹ کر لاتے اور لاہور میں جشنِ فتح رنگ رلیوں کی صورت میں مناتے تھے۔ شہر میں بے شمار ایسی اخلاقی برائیاں پھیل گئی تھیں جن کی ذمہ داری زیادہ تر خالصہ حکومت پر عاید ہوتی تھی۔ مثلاً فسق و فجور، چور بازاری، رشوت، شراب خوری اور ڈاکہ زنی وغیرہ۔ اس دور کے اہلِ قلم نے ان واقعات کی جو تصویریں بنائی ہیں تاریخ کا بہترین سرمایہ ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کا مندرجہ ذیل شعر اپنے اندر کس قدر تلخی لیے ہوئے ہے:

قاضی بہ رشوہ راضی مفتی بہ حیلہ سازی

ملّا بہ ..... بازی، یاراں چگونہ بازد[۱]

اسی طرح مولوی غلام حسین خرم کا مندرجہ ذیل مخمس بھی اس معاشرتی صورتِحال کا عکاس ہے:

جہاں میں رنگ ہے دیکھا عجب خدائی کا لیا ہر ایک نے اب رنگ بے وفائی کا

نہیں کسو میں رہا طور آشنائی کا تمام خلق نے سیکھا ہے ڈھب برائی کا

مٹا ہے خلق میں اب نام تو بھلائی کا

نہ کوئی دوست کسو کا نہ کوئی یار بنے نہ کوئی میت کسو کا نہ دوستدار بنے

نہ کو رفیق کسو کا نہ غمگسار بنے مگر جو اپنے ہی مطلب کا یار غار بنے

گدا نے پھر لیا تاج بادشاہی کا

جو ہیں نجیب تو کم ذاتوں کے بنے نوکر فقیر زادہ تو گھر بنا بد دست در زر

جولاہہ، دھوبیا سپاہی بنا تیغ دہنر سپاہی زادہ تو بیچے ہے گھاس لے سر پر

جگت میں پیچ ہے بڑا بنا کمہار کا

کتاباں پڑھتے ہیں دھوبی جولاہے کے فرزند　　قرآن حفظ کرے ساگ والی کا دلبند
حدیث فقہ سے کنجڑ بنا ہے دانش مند　　نجومی نائی ہے گدڑی فروش دولتمند
پڑا ہے علم میں فرزند نانبائی کا

ہوئے ہیں تیلی تنبولی تو شہر میں ارکان　　بزاز بانیے لاتے ہیں اپنے گھر دیوان
اصیل ڈوبے ہیں کم ذات ہیں بلند مکان　　گدا کا بیٹا ہے دولت سے مست اور شادان
امیرزادے نے کاسہ لیا گدائی کا

نجیب نسل جو سید ہیں بھوکے مرتے ہیں　　مشائخوں کے گھرانے میں فاقے پڑتے ہیں
قریش، مغل سدا غم کا سانس بھرتے ہیں　　کسائی کو نجڑے، کنجڑ بہار کرتے ہیں
کلال پہن لیا جامہ پارسائی کا

چمار موچی نواس درزی خاصے ہیں.　　جو جوتی گانٹھتے ہیں وہ خلق کے خاصے ہیں
گدائی کرتے ہیں جو شیخ کے نواسے ہیں　　شریف قوم بہت بھوکے ہیں پیاسے ہیں
کھٹیک ٹیا بنا چوہدری خدائی کا

پڑے ہیں خالی مکاں مسجدوں کے سر تا سر　　خراب و خستہ ہے محراب گر پڑا منبر
گدا تو رہتے ہے مسجد میں ناچتا بندر　　. کلال خانے میں عشرت کا ساز ہے بہتر
قمارخانے میں جلوہ ہے دلربائی کا

زمانہ سخت ہے نازک سماں خدا کی اماں　　بڑوں کی قدر نہیں خورد خود بخود ہیں کلاں
رذالہ صاحبِ عزت، شریف عزیزہ گھار　　غریب صاحبِ دیواں، امیر بے دوکاں
لیا ہے خلق نے اب رنگ خود نمائی کا

اٹھا ہے ملبش جہاں میں صدا ہے ماتم کی　　ہوا بدل گئی اب دنوں میں عالم کی
چڑھی ہے بدلی زمانے میں محنت و غم کی　　تو رکھ لے لاج خدایا عقیدۂ خورم کی
نہ کیجو حال خراب ایسے مرتضائی کا

یہ نظم اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس میں شہر کے تمام معاشرتی گروہوں کو جس طرح ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے، اس سے خورم کی فنکارانہ مہارت اور شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز یہ مخمس اپنے عہد کی معاشرتی زبوں حالی اور عوامی کس مپرسی کو بھی پورے طور پر بے نقاب کر رہا ہے۔

اس دور کے دکھی عوام اپنی روحانی تسکین کے لیے بزرگانِ دین کے مزارات پر جاتے ہیں اور اس کفر والحاد کی دنیا سے منہ موڑ کر اہل اللہ کے دامانِ تصور میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'یادگارِ چشتی' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں لاہور کا ہر شہری کسی نہ کسی تقریب سے بزرگانِ دین کے مزار پر حاضری دیتا تھا اور انہیں وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے اس طاغوتی دور کے خاتمے کی دعا کرتا تھا۔

لاہور میں حضرت مخدوم علی ہجویری عرف حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مرجعِ خلائق تھا جہاں ہر وقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ حاضر ہو کر قرآن خوانی اور یادِ خدا میں مشغول رہتے تھے۔ اس دور میں مزار داتا گنج بخشؒ مسلمانوں کا سب سے بڑا تہذیبی مرکز تھا۔ اس کے ساتھ لاہور کے مسلمان اسلامی تہوار بھی دھوم دھام سے منا کر اپنی مذہبی شناخت برقرار رکھتے تھے۔ مثلاً معراج شریف، شب برات، رمضان عیدین، محرم اور آخری چہار شنبہ کے جشن خوب دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ سکھوں کی شر انگیزیاں کبھی کبھی آڑے آتیں لیکن مسلمان ان کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مسلمانوں کے برعکس ہندو اور سکھ بھی اپنے تہوار بڑی شان و شوکت سے مناتے تھے جن میں حکومت کی طرف سے پوری پوری پشت پناہی ہوتی تھی۔

خالصہ عہد میں معاشرے کی طبقاتی اور گروہی تقسیم کے باوجود عوام الناس کے ذہنوں میں نسلی یا طبقاتی تعصب نہیں تھا۔ ساری قومیں اور گروہیں آپس میں گرمجوشی اور امن و آشتی سے رہتی تھیں۔ خالصہ عہد میں اگر اربابِ سیاست دانستہ طور پر کی شر انگیزیاں ایک طرف کر دی جائیں تو عوامی سطح پر کسی گروہی جھگڑے یا فساد کا نشان نہیں ملتا۔ اس دور کے اہم مورخین اور وقائع نویس مثلاً مورخ احمد بخش یکدل، مفتی علی الدین، سید احمد شاہ بٹالوی، مولوی نور احمد چشتی، اونا تھ اکبری، لالہ سوہن لعل سوری اور مفتی غلام سرور لاہوری کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں لاہور کا معاشرتی نظام کا ایک وسیع تر انسانی

معاشرے کی خوبیاں لیے ہوئے تھا۔ مسلمان مصلحین نے اپنے غیر مسلم شاگردوں کے ذریعے معاشرے میں انسانی رواداری کی فضا پیدا کر دی تھی۔ امرا اور عمائدینِ سلطنت غریب سے غریب شہری کی خوشی اور غم میں ایک عام آدمی کی طرح شریک ہوتے تھے۔ خالصہ دربار کے عالی رتبہ وزیر دیوان دینا ناتھ نے ایک انگریز کو بسنت کے روز پگڑی رنگنے پر پانچ روپے دینے چاہے تو اس نے بڑی بے تکلفی سے انکار کر دیا اور زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جس پر راجہ دینا ناتھ نے کمال خندہ پیشانی سے پشمینے کا ایک گراں قیمت چوغہ اسے دے کر راضی کیا۔

اسی طرح دیوان بھوانی داس کی داڑھی کا خط بناتے ہوئے جب ولی محمد حجام نے چندر بھان برہمن کا یہ شعر پڑھا:

زنار را کہ بر کتفِ خود نہادہ ام

ہستم سگ رسولؐ رسن در گلوئے من

تو اس نے مسکرا کر کہا: "میاں ولی محمد! آپ کے پیشے کسب سے زیادہ منبر موزوں تھا۔ تاکہ آپ اس پر کھڑے ہو کر وعظ کیا کرتے"۔[۱۸]

اور میاں ولی محمد کی بزرگی اور احترام کو محسوس کرتے ہوئے ان سے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ حالانکہ میاں ولی محمد نے دیوان بھوانی داس کو "سگ" سے تشبیہ دی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی جابر و ناملائم شخصیت کے باوجود بے وجہ کسی پر ظلم نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے اہلِ شہر میں احساسِ امنیت موجود تھا۔ مہاراجہ کے حکم سے سزائے موت پانے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس نے اپنے چالیس سالہ دورِ حکومت میں چند ایک کے ناک اور کان کٹوانے کے علاوہ عوام میں سے کسی کو سنگین سزا نہیں دی۔ وہ عوام کی زندگی اور طرزِ بود و باش سے بے خبر نہ تھا۔ چونکہ مہاراجہ اپنی ذاتی زندگی میں تہذیب و شائستگی کا کوئی معیار نہیں اپنا سکا تھا للذا وہ عوام الناس کے تہذیبی اور تمدنی جذبات کو نہ تو محسوس کرتا تھا اور نہ اس کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت تھی۔ اس کے باوجود وہ تہذیبی

احساس اور شعور سے بے بہرہ نہیں تھا اور اس کا سبب شاید اس کا وہ وسیع تجربہ تھا جو ملک گیری کی برسوں پر محیط کوشش کے نتیجے میں اسے حاصل ہوا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد خالصہ حکومت کو اگر کوئی بہتر حکمران ملا تو وہ راجہ شیر سنگھ تھا۔ افسوس ہے کہ اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور اسے اپنی رعایا کے لیے بہتر کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور راجہ شیر سنگھ دونوں اپنی پُر جلال اور جابر شخصیتوں کے ساتھ ساتھ احساسِ جمال سے بھی بہرہ مند تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ رقص و موسیقی کا نہ صرف بازاری اور تماش بین حد تک شوقین تھا بلکہ اہلِ فن کا بھی قدردان تھا۔ چنانچہ ۹۔ جولائی ۱۸۱۲ء کو اپنے دربار میں مہاراجہ نے اس دور کے نامور نے نواز عطار خاں کو شرفِ باریابی بخشا اور اس سے بانسری کی دھن سنی۔ اس واقع کا ذکر کرنل گیرٹ نے خالصہ دربار کی دستاویز سے یوں ترجمہ کیا ہے:

اسی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ اور راجہ شیر سنگھ دونوں سفر یا کسی مہم پر جانے سے پہلے "دیوانِ حافظ" سے فال لیتے تھے جو اس زمانے کے مسلمانوں کا تمدنی دستور تھا۔ یہ اطلاع مولوی احمد بخش یکدل نے دی ہے چنانچہ انہوں نے اپنی بیاض میں مندرجہ ذیل یادداشت اشعار میں درج کی ہے:

"وقتِ تسخیرِ کشمیر نوبت دوم رنجیت سنگھ بہادر فال گرفتہ بود و اقرار ولایت کرد فتحیاب شد":

برغم زاغ سیہ شاہباز زریں بال ! در مقرنس زنگار آشیاں گیرد

"اوّل دفعہ بر تسخیرِ کشمیر رنجیت سنگھ فال جستہ، اعتبار نکردہ و باز ہزیمت خوردہ":

ایکہ درکوچۂ معشوقہ امامی گذری   برحذرباش کہ سر می شکند دیوارش

"وقت مہاراجہ شیر سنگھ وقتی کہ انگریزاں سشن آنسے طلب کردند فال از خواجہ حافظ گرفتہ بود"

پدرم روضۂ رضوان بدو گندم بفروخت   ناخلف باشم اگر من بجوی نفروشم

"شیر سنگھ وقت طوفان لاہور پیش سائیں فضل شاہ مجذوب رفتن"

یار مردان خدا باش کہ در کشتی نوح   ہست خاکی کہ بآبی نخرد طوفان را[۸۳]

مہاراجہ رنجیت سنگھ تاریخ اور سوانح کو پسند کرتا تھا۔ وقائع نگار اور مورخین کی نہ صرف حوصلہ افزائی اور عزت کرتا تھا بلکہ ان کے نزدیک رہ کر ان کی معلومات سے استفادہ بھی کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خالصہ عہد میں وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے فن نے ترقی کی۔ سوہن لعل سوری نہ صرف خالصہ دربار کے وقائع نگار خصوصی تھے بلکہ انہوں نے مہاراجہ کی فرمائش پر اپنی مشہور تصنیف عمدۃ التواریخ مرتب کی جس کے نسخے مہاراجہ کے حکم سے تیار ہوکر مہاراجہ کے دوست ملکوں میں بھی بھیجے گئے۔ اسی طرح امرناتھ اکبری کو بھی دیوان کا عہدہ دے کر وقائع نگاری پر معمور کیا گیا۔ انہوں نے ظفر نامہ رنجیت سنگھ تالیف کی۔ مہاراجہ کے اہل کار اور امرا بھی مہاراجہ کے اس شوق میں حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ اسی عہد میں راجہ گلاب سنگھ نے مولوی احمد یار مرالوی سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فتوحات سے متعلق منظوم تاریخ "رنجیت نامہ" کے نام سے لکھوائی۔ انگریز سیاحوں نے مہاراجہ کے دورِ حکومت میں پنجاب کی سیاحت کی اور مہاراجہ نے ان کو شرفِ پذیرائی بخشا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کو تاریخ نویسی کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تاریخ نویسی کا ذوق اس زمانے میں لاہور کی پوری معاشرت میں پھیل چکا تھا۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے اس زمانے کے سیاسی، تاریخی اور معاشرتی کوائف پر مشتمل اپنا روزنامچہ ۱۸۲۱ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۶۱ء تک چالیس سال بلا ناغہ لکھتے رہے۔ یہ دستاویز بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی۔ یکدل نے "تحفۂ یکدل" کے نام سے لاہور کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ بھی لکھی جو ناقص الآخر ہونے کے سبب تاریخ اختتام سے محروم ہے۔ ان کے علاوہ

مہاراجہ کے وزیر خارجہ فقیر عزیز الدین نے بھی ایک ضخیم روزنامچہ یادگار چھوڑا ہے[۸۴]۔

مسلمانوں کے دینی مراکز اس زمانے میں لاہور کی معاشرت پر بطور خاص اثر انداز تھے۔ خالصہ دربار کی طرف سے ان مراکز یا درس گاہوں کی سرپرستی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دینی اشاعت کے ان مراکز پر خالصہ عہد کے کسی حکمران نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ یہ مراکز اہلِ لاہور کے ایثار اور مذہبی جوش و ولولے کی وجہ سے بہت کامیابی سے چل رہے تھے اور حق یہ ہے کہ سکھ عہد کے اس کفرستان میں دینِ مبین کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ اہم مدارس میں ایک مدرسہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نامور وزرا فقیر نور الدین، فقیر امام الدین اور فقیر عزیز الدین نے اپنے بزرگوار والد فقیر غلام محی الدین نوشاہِ ثانی کی یاد میں بھاٹی دروازے کے اندر قائم کیا ہوا تھا جس میں اس دور کے جید علماء درس دیتے تھے۔ طلبہ کو رہائش، خوراک اور لباس کی خاطر خواہ سہولتیں حاصل تھیں۔ اس مدرسے کا نام "دربار عالی" تھا اور اسے ایک ادارے کا درجہ حاصل تھا۔ فقیر سید عزیز الدین نے اپنے روزنامچوں میں اس مدرسے کے اخراجات اور دینی کارناموں کی تفصیل دی ہے۔ خالصہ عہد کے ممتاز علمائے دین خلیفہ غلام اللہ اور مولوی غلام رسول بھی کچھ عرصہ "دربار عالی" میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ باقی مدرسے علماء کے ذاتی تھے۔ یہ مدرسے علماء کے ناموں اور شخصیتوں سے پہچانے جاتے تھے۔ اس جگہ چند ایک کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ مولوی غلام رسول و خلیفہ غلام اللہ

یہ دونوں علماء کا درس موراں طوائف کی مسجد میں تھا۔ ہزاروں طلباء اور درویش دور دور سے آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ پنجاب کے علاوہ ہندوستان اور بیرونی ممالک سے بھی طلباء اس مدرسے میں داخل تھے۔ دینی تعلیم کے علاوہ مروجہ تعلیم یعنی عربی، فارسی، فلسفہ، صرف و نحو اور طب وغیرہ کے درس میں ہر مذہب و ملت کے تشنگانِ علم شامل ہوتے تھے۔ کنہیا لعل نے لکھا ہے کہ:

"ہزاروں ہندو، مسلمان اس مدرسے میں تعلیم پاتے تھے"[۸۵]۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ، مولوی غلام اللہ کو دربار میں تعظیماً برابر کی کرسی دیتا تھا۔

۲۔ مولوی جان محمد لاہوری

ان کا مدرسہ مسجد نور ایمان والی میں تھا۔ مولوی صاحب کی وفات کے بعد ان کے لائق فرزند مولوی محمد فیض اور ان کے فاضل بھائی مولوی محمد افضل نے اس دینی خدمت کو جاری رکھا۔ مولوی جان محمد لاہوری کی تصانیف میں زبدۃ التفاسیر، رسالہ اثبات، خلافت امیر معاویہ، شرح قصیدہ بردہ، شرح قصیدہ امالی، معراج نامہ، رسالہ حرمت تمباکو اور رسالہ عدم فرضیت جمعہ وغیرہ مشہور ہیں۔ آپ ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۱ء میں وفات پائی۔[۱۸]

۳۔ مولوی غلام محی الدین بگوی

لاہور کی لال مسجد میں مدرسہ جاری کیا اور تیس سال تک درس دیتے رہے۔ ۲۰۔ شوال المکرم ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء کو وفات پائی۔[۱۹]

۴۔ مولوی غلام حسین چشتی

لاہور میں لوہاری دروازے کے اندر درس دیتے تھے۔ تفصیل آیندہ ابواب میں آئے گی۔
لاہور کی معاشرت کا یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر اس دور کے چند اہم اہل فن اور اہل ہنر کا ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے شاعری، فنون لطیفہ اور دیگر علوم و فنون میں لاہور کو پورے ہندوستان میں امتیازی حیثیت دے رکھی تھی۔ شعراء اور ادباء کا ذکر آیندہ باب میں آئے گا۔ اس جگہ بعض دوسرے اہل ہنر کا ذکر کیا جاتا ہے:

کوفت گر:

فیض اللہ، فن کوفتگری کے علاوہ بہت اچھے شاعر اور صاحب علم تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ

کی وفات پہ انہوں نے مادہ ہای تاریخ ذیل کے دو مصرعوں میں موزوں کیے جو ان کی علمی و ادبی استعداد کی نشاندہی کرتے ہیں:

۱۔ سیہ گردید خورشید جہانتاب

۲۔ چشم خورشید آمدہ زیہ کسوف[۸۸]

نقاش (مصوّر):

لاہور میں مصوّروں کے کئی خاندان تھے۔ ان میں کچھ موچی دروازے میں کچھ شاہ عالمی دروازے میں اور کچھ مزنگ میں آباد تھے۔ موچی دروازے کے نقاشوں میں محمد صلاح نقاش، ان کے بیٹے محمد ابن نقاش اور ان کے بیٹے نور محمد نقاش اپنے عہد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح اس محلّے کے ایک اور مصوّر قادر بخش نقاش نے بھی اپنے عہد میں خاصی شہرت حاصل کی تھی۔ ایک اور فنکار غلام محمد نقاش کو نور محمد نقاش نے اپنا بیٹا بنایا اور اسے فنِ مصوری کی تعلیم دی۔ یہ غالباً مزنگ یا اچھرے میں رہتے تھے۔ شاہ عالمی دروازے کے نزدیک چوہٹہ مفتی باقر کے قرب وجوار میں کریم بخش نقاش رہتے تھے جن کا مکان اس علاقے میں حویلی کریم بخش نقاش کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے موقلم کا ایک شاہکار سید سلیمان تونسوی (سنگروی) کی شبیہ راقم الحروف کے پاس ہے۔ یہ شبیہ خالصہ عہد کے نقاشی کا بہترین نمونہ ہے۔ اور اس پہ مصور کے دستخط بھی موجود ہیں۔[۸۹]

خطاط:

امام ویردی اور محمد تقی پشاوری۔ موخرالذکر فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ امام ویردی کی شخصیت خطاطی کی تاریخ میں جانی پہچانی ہے۔

مصوری، خطاطی اور صحافت یعنی جلد سازی کے یوں تو بے شمار مراکز لاہور میں موجود تھے لیکن جو شہرت مولوی محمد بخش صحاف کے کارخانے کو نصیب ہوئی وہ کسی کو نہ مل سکی۔ یہ کارخانہ مسجد وزیر خاں

سے ملحقہ دو دکانوں میں قائم تھا اور بے شمار خطاط، مصور اور صحاف اس سے وابستہ تھے جو دن رات کام کر کے تشنگانِ علم کے لیے کتابیں نقل کرتے اور اہلِ ذوق سے تذہیب، آرائش، مصوری اور نقاشی میں داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ اس عہد کے معروف دانش مند مولوی احمد بخش یکدل چشتی بھی کچھ عرصہ اس کارخانے سے وابستہ رہے۔ اس کارخانے میں تیار شدہ درسی اور علمی کتابوں میں سے بعض راقم الحروف کے کتاب خانے میں موجود ہیں:

حکاک:

مولوی حسن دین حکاک: یکدل نے ان کا شجرہ نسب درج کیا ہے جو یوں ہے:

حسن دین حکاک بن محکم دین حکاک بن محمد اعظم حکاک بن فتح محمد حکاک بن نور۔[۹۰]

اس شجرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاہور میں حکاکی کا کام کئی پشت سے ہو رہا تھا۔ حکاکی کا فن اپنی نزاکت، ظرافت اور محنت کے باعث فنونِ لطیفہ کے اہم شعبوں میں شمار ہوتا ہے۔

جس طرح پہلے بیان کیا گیا، الحاقِ پنجاب کے بعد لاہور پر انگریزوں کا مستقل قبضہ ۱۸۴۹ء میں ہوا۔ اس قبضے کے بارے میں اہلِ لاہور کا سماجی اور عوامی ردِعمل قابلِ ذکر ہے۔ اس ردِعمل کی تفصیل ہمیں پنجاب سے متعلق تاریخ کی مشہور کتابوں میں نہیں ملتی لیکن اس عہد کے بعض اہم روزنامچوں، یادداشتوں اور اخبارات سے اس کے مفصل کوائف ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولوی احمد بخش یکدل کا روزنامچہ اس لیے بالخصوص قابلِ ذکر ہے کہ یکدل ہر قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی دباؤ یا مجبوریوں سے بے نیاز تھے۔ ان کی بیاضیں ایک مورخ کی دیانت اور غیر جانبداری کا ناقابلِ تردید نمونہ ہیں۔ چنانچہ یکدل کے ہاں انگریزوں کی پنجاب میں آمد پر مندرجہ ذیل خیالات ملتے ہیں:

شہر لاہور عجب رونق داشت   جلوۂ قدرتِ حق، الحق داشت
ناگہاں چشم بدش دیراں کرد   جا بجا ساکن او حیران کرد
لودیانشس ہمہ ایران آشوب   دادہ از حسن بجنت جاروب

حسنِ بے پردۂ کھت‌انی ہا ... ملک دل کردہ بو یرانی ہا
چشمِ شاں فتنہ بکشمیر انداخت ... در دلِ یکدل ما تیر انداخت
کوچہ و سخت کمانی غمہاز ... گوشہ زلف درازی طناز
عشق و غم ہر دو نصیب این شہر ... حسن و عشق ہر دو رقیب این شہر
یارب ! ایں عیسویاں ناجنس اند ... فرد وضع اند بظاہر انس اند [91]

"انگریزاں بلائے عظیم برای مردم پنجاب۔ آمدند و صورت خارج شدن بنظر نمی آید۔" [92]

"ومن در عہد انگریزی تنہا شدہ و ہمہ مردم مشغول ہوا و ہوس شدند و امروز مردم ہمہ انگریزی خوان و پارسی ، تازی یک لخت نابود شدہ وکس را پروای علوم نماندہ و ہمہ مردم پوشاک انگریزی درخواستند و ہوس زبان انگریزی و باز پادریانِ دلیر و دین ضعف یافتہ و ہر یکی کمر بشرارت بستہ و پدر بر پسر نالش کردہ و پسر بر پدر و بازار زنا و شراب و دغابازی و دروغ و سوگند کاذب و فریب آن قدر گرم شد کہ در خانہ صدق و کذب گنجائش یک مو در موافقت نماندہ۔" [93]

لاہور میں سب سے پہلا مطبع لاہور کرانیکل تھا جسے ۱۸۴۹ء میں منشی محمد عظیم نے قائم کیا تھا لیکن لاہور کا سب سے پہلا اردو اخبار "کوہِ نور" تھا جسے منشی ہرسکھ رائے نے ۱۲۔ جنوری ۱۸۵۰ء کو ایک ہفت روزہ کی صورت میں شائع کیا۔ لالہ ہرسکھ رائے ایک تجربہ کار ایڈیٹر تھے اور "کوہِ نور" کے اجراء سے پہلے وہ "جامِ جمشید" میرٹھ کے مدیر بھی رہ چکے تھے۔ کوہِ نور ہر چند کہ عام پالیسی کے اعتبار سے انگریزوں کا ہم آواز تھا پھر بھی وہ حکومت کی انتظامی پالیسیوں کے خلاف حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتا

تھا۔ انگریزوں نے تسخیرِ پنجاب کے ساتھ ہی لاہور کو دارالحکومت قرار دیا اور شہر میں جس معاشرتی نظام کی سرپرستی شروع کی وہ اہلِ لاہور کے مشرقی ضمیر کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ ۱۸۵۱ء کی اہم خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز باشندگانِ لاہور کے مال و دولت کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹ رہے تھے اور لوٹ کھسوٹ کے اس عمل میں کسی کی عزت و ناموس بھی محفوظ نہیں تھی۔ چنانچہ ۱۱ فروری ۱۸۵۱ء کے کوہِ نور کی مندرجہ ذیل خبریں قابلِ توجہ ہیں:

"محلہ بھاٹی دروازہ (لاہور) میں ایک گورہ نے متصل خانہ بھائی رام سنگھ، ایک بیلے مانس کے گھر میں جا کر ایک عورت جمیلہ کو دبا لیا تھا۔ ایک مرد نے اور عورتوں کا شور سن کر اندر جا کر گورہ سے عورت کو چھڑایا مگر آپس میں مار پیٹ سخت ہوئی اور آخر کار گورہ بھاگ گیا۔"

"شہر کے بھنگیوں کو تاکیداً حکم ہو گیا ہے کہ ہر ایک محلہ کی خبر بلاناغہ تھانہ جات میں پہنچا دیں۔"[94]

گویا غارت گری اور غنڈہ گردی کا یہ دور برسوں پہ محیط رہا۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں جبکہ انگریزوں کو غیر رسمی طور پر لاہور میں آئے دس سال اور رسمی طور پہ آٹھ سال گزر چکے تھے۔ مولوی نور احمد چشتی نے یادگارِ چشتی تصنیف کی۔ اس کتاب میں مصنف نے ایک مقام پہ حکومت کی توجہ ان لاابالی اور غنڈہ عناصر کی طرف مبذول کرائی ہے جو لاہور کے گلی کوچوں میں شرفا کی پگڑیاں اچھالنے اور شریف زادیوں کے سروں سے چادریں کھینچنے کے لیے کھلے چھوڑ دیے گئے تھے۔[95] اس امر کی شکایت 'کوہِ نور' نے بھی کی تھی۔

لاہور کی معاشرت کو انگریز کی آمد نے بری طرح متاثر کیا لیکن اس معاشرے کا ایک بڑا حصہ انگریز سے نفرت کا برملا اظہار کرتا رہا اور یہی نفرت لاہور کے تمدنی اور معاشرتی تشخص کو واضح کرتی ہے

انگریزی عہدِ حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی پنجاب کی تاریخی شناخت کا عمل شروع ہو گیا۔ اس کی زمین سکھ عہد میں ہموار ہو چکی تھی۔ خالصہ عہد میں شروع ہونے والے تاریخ نویسی کے عمل نے ترقی کی۔

یوں بھی پنجاب کے بارے میں معلومات، مردم پنجاب کے رسم ورواج اور بود و باش سے آگاہی نئی حکومت کی اہم سیاسی ضرورت تھی۔ خالصہ عہد کے مصنفین نے تازہ حکمرانوں کی مدد کی۔ ان میں سے کچھ نے معلومات فراہم کیں اور کچھ نے انگریزوں کے ایما پر مستقل تاریخیں لکھیں۔ انگریزوں نے اس کام کے لیے بھاری صلے اور معاوضے کا لالچ دیا جس نے اس کارروائی کو تیز تر کر دیا۔ لاہور کے علاوہ پنجاب کے دوسرے شہروں سے بھی مؤرخین نے عمدہ تصانیف پیش کیں۔ فارسی، مغلیہ اور خالصہ عہد کی سرکاری اور مسلمانوں کی تہذیبی زبان تھی، اس کا اثر کم کرنے اور کچھ نئی حکمتِ عملی کے مطابق انگریزوں نے اردو کی سرپرستی شروع کی۔ انگریز افسروں کے لیے اردو کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ چنانچہ مولوی نور احمد چشتی نے جو "صاحبانِ عالی شان" کے مدرس تھے، اپنے یورپین شاگردوں کی تعداد دو ہزار کے قریب بیان کی ہے۔[۹۶]

پنجاب کا نیا معاشرتی ڈھانچہ جس میں مشرق و مغرب کے تہذیبی نظریات دست و گریباں ہو رہے تھے ابھی آغاز کے مراحل ہی میں تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا واقعہ رونما ہو گیا۔ پنجاب چونکہ اس واقعے سے کئی سال پہلے ہی انگریزوں کے قبضے میں آ چکا تھا، اس لیے یہاں آزادی خواہوں کا سدِ باب کرنا مشکل نہ تھا۔ لاہور اس وقت سر جان لارنس کی حکومت میں تھا لیکن نعرۂ آزادی کے موقع پر لارنس لاہور سے باہر تھا۔ رابرٹ منٹگمری نے واقعہ کی خبر پاتے ہی انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لیے اور فوراً میاں میر چھاؤنی اور قلعہ لاہور میں متعین دیسی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لیے۔ ان واقعات کی ایک جھلک باری علیگ نے یوں دکھائی ہے:

"۳۰ جولائی کو پرکاش سنگھ اپنی تلوار لے کر نکلا اور اپنے ساتھی سپاہیوں سے کہنے لگا کہ وہ فرنگیوں کو قتل کر دیں۔ باغی سپاہی میاں میر سے بھاگ نکلے گرفتار ہونے والوں کو توپ دم کر دیا گیا۔"[۹۷]

یکم اگست کو عیدالاضحیٰ کے روز اجنالہ کے تھانے میں آزادی خواہ مجاہدین کو جس بے دردی اور بے رحمی سے شہید کیا گیا، اس کی تفصیل دنیا میں سفاکی کا بدترین نمونہ ہے:

جب ایک سو پچاس سپاہی مارے جا چکے تو ایک جلاد غش کھا کر گر پڑا لہٰذا

جلادوں کو آرام کرنے کا تھوڑا سا وقفہ دیا گیا۔ آرام کے بعد پھر قتل کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب دو سو سینتیس سپاہی مارے جا چکے تو اطلاع دی گئی کہ باقی ماندہ سپاہی برج سے باہر نکلنے سے انکار کر رہے ہیں۔ دروازے کھولے گئے۔ وہ سب کے سب تقریباً مر چکے تھے۔ غیر شعوری طور پر بلیک ہول کے حادثے کا اعادہ ہو چکا تھا۔ بینتالیس نعشوں کو کھینچ کر باہر نکالا گیا اور دوسرے باغیوں کی نعشوں کے ساتھ سب کو ایک مشترک گڑھے میں دفنا دیا گیا"۔ [۹۸]

جنگِ آزادی میں انگریزوں کو فتح ہوئی لیکن اس کامیابی کے بعد انگریزی سیاست نے ایک نیا شعور بھی حاصل کیا۔ انہیں احساس ہوا کہ رعایا کے تعاون اور رضامندی کے بغیر اس ملک پر حکومت کرنا آسان نہیں۔ لہٰذا ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کی توجہ لاہور کے عوام کی فلاح و بہبود کی طرف کافی حد تک مبذول ہو گئی۔

۱۸۵۸ء میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل ہند اور لارڈ لارنس لیفٹیننٹ گورنر پنجاب مقرر ہوئے۔ پنجاب بھر میں اس تقرری پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ شعراء نے تاریخیں کہیں۔ امرناتھ اکبری کی مصنفہ تاریخ درج ذیل ہے:

چوں صاحبِ جان سلطنت را — شد خلعت سروری مبارک
گویند برائے ذات اقدس — ہر گونہ خوش اختری مبارک
شد از مدد جناب عیسیٰ — ہر خوبی و بہتری مبارک
بر ذات گرامیش ہمیشہ — انصاف سکندری مبارک

عیسیٰ شدہ شامل و ہمیں گفت
لیفٹیننٹ گورنری مبارک [۹۹]

لارڈ لارنس کی عام پالیسی دانشمندانہ اور کسی حد تک مسلم نواز تھی۔ لاہور میں سکھوں نے مسلمانوں

کو مذہبی، سیاسی اور تمدنی آزادی سے کافی حد تک محروم کر رکھا تھا۔ لارڈ لارنس نے اس محرومی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۴ء میں رابرٹ منٹگمری نے لاہور میں فنونِ لطیفہ کی نمائش کا افتتاح کر کے اہلِ پنجاب کے ذوقِ جمال کو مہمیز کیا۔ ۱۸۶۴ء ہی میں لاہور میں ایک عہد ساز ادبی تنظیم "انجمن پنجاب" وجود میں آئی جس کے دور رس اثرات نے لاہور کو پورے برصغیر میں علمی اور ادبی اعتبار سے نمایاں حیثیت دی اور لاہور کے گلی کوچے اردو ادب کے زمزموں سے گونج اٹھے۔

حواشی ـــــ باب اوّل

۱۔ "و بہ نادو پیر دست دعای بی تاخیر بعمر و دولت نواب بی نظیر وا زمی ساخت کہ چنین دیر بی پیر و ابتدہ پیرا سیرو دستگیر کرد" : پروفیسر شجاع الدین (مرتب)۔ ارصمری ص۱۵ چاپ لاہور
سید احمد شاہ بٹالوی : تاریخ ہندوستان ۹۱۰ ب قلمی۔ دیال سنگھ لائبریری لاہور

۲۔ مولوی احمد بخش یکدل : تحفۂ چشتی ص۴۳ قلمی

۳۔ ایضاً ص۳۔

۴۔ مولوی احمد بخش یکدل : تحفۂ یکدل ص۵۲ قلمی : یکدم کے لفظ سے ظاہر ہے کہ نادر شاہ کے حملے سے نواب زکریا خان بے اطلاع تھا۔ سید احمد شاہ بٹالوی نے اسے زکریا خان کی سستی اور بے خبری کہا ہے۔ (سید احمد شاہ بٹالوی : تاریخ ہندوستان ص۹۱ ب۔ قلمی)۔

۵۔ پیر کمال لاہوری : تحائفِ قدسیہ۔ قلمی

۶۔ میرزا مہدی خان : تاریخِ نادری ص۱۱، چاپ تبریز ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء

۷۔ محمد علی نے تاریخِ مظفری (ف ۴۷) میں سفیر کا نام شیخ عمر لکھا ہے جو احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تھا۔ مفتی علی الدین نے عبرت نامہ میں لکھا ہے کہ سید صابر شاہ سے پہلے شاہ نے بلغرا خان کو سفیر بنا کر بھیجا تھا جس کے توہین آمیز لہجے سے شاہنواز خان ناراض ہو گیا۔ عزیز الدین وکیل فوفلزئی نے درۃ الزمان میں احمد شاہ ابدالی کے بیٹوں کی جو فہرست دی ہے اس میں شیخ عمر کا نام موجود نہیں ہے (دیکھیے درۃ الزمان ص۱)؛
یکدل نے بھی احمد شاہ کے سات بیٹوں میں شیخ عمر کو شامل نہیں کیا۔ دیکھیے تحفۂ یکدل ص۵۶

۸۔ مولوی احمد بخش یکدل : تحفۂ یکدل ص۳۵ قلمی

۹۔ ایضاً ص ۳۶

۱۰۔ غلام حسین : سیر المتاخرین، مفتی علی الدین : عبرت نامہ، محمد علی : تاریخِ مظفری، عبدالکریم کشمیری بیان واقع، سید امام الدین حسینی : تاریخ حسین شاہ

Dr. M. Baqir: Lahore Past and Present P. 179, Lahore 1952.

۱۱-۱۲ مولوی احمد بخش یکدل : تحفۂ یکدل ص ۳۶ قلمی

۱۳۔ دریں اثنا خبر آمد کہ نواب قمر الدین خان با فوجی شائستہ وجمعیتی بائستہ در حدود کرنال منوجہ مقابلت است۔ . . . خبر رسید کہ شاہزادہ احمد شاہ ولی عہد محمد شاہ بطریق منقلا بدعوی دادر او مردی دادن مستعد است، نواب نجم الدولہ معین الملک فرزند نواب قمر الدین خان بمقابلہ سیوف احمد شاہی صفوف بست و ہنگامۂ توپ و بان و رہکلہ و بندوق گرم گردید، شورش از توپ اندازِ ہند ظاہر گردید کہ ہر ہدف کہ زدی خالی نرفتی۔ بر شاہ درّانی انداخت و آن بادشاہ در ظلِّ حراستِ الٰہی محروس گردید۔ . . . . چون ہنگامہ سخت پدید آمد دو گولہ انداز از دولت احمد شاہی برخصت چند روز نزد وزیر الممالک رسیدہ، نوکر شدند و مکان نشست و خاست وزیر دریافتہ دو وقت وظیفہ و نمازِ فجر معلوم کردہ زود بلشکر باز گردیدہ گولہ زدند و برپشت وزیر الممالک رسید و کارش تمام کرد۔

مولوی احمد بخش یکدل : تحفۂ یکدل ص ۳۶ و ص ۳۷ قلمی

۱۴۔ پروفیسر شجاع الدین : لاہور کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ، مقالہ مطبوعہ نقوش۔ لاہور نمبر نیز

Dr. M. Baqir: Lahore - Past and Present P.79, Lahore 1952.

۱۵۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی : تحفۂ یکدل ص ۴۲ قلمی

۱۶۔ مولوی احمد بخش یکدل : تحفۂ یکدل ص ۴۵ قلمی۔ یکدل نے اس جگہ احمد شاہ ابدالی اور میر منّو کے

درمیان ہونے والے مکالمے بھی درج کیے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

"احمد شاہ درانی بحالش نگر بستہ فرمود کہ اگر من بدست تو می آمدم چہ میکردی؟ عرض کرد در پنجرۂ آہنی نشاندہ روانہ شاہجہان آباد بحق نمک می کردم۔ احمد شاہ گفت اکنوں من برای تو چہ تجویز کنم؟ گفت اگر تاجری بفروش واگر قصای بکش و اگر بادشاہی بنواز۔ پس خود بہ دولت پایئن آمدہ بہ بغل کشیدہ فرزند فرمود و ایالت لاہور بہ میرالمعین محول وموکول داشتند"۔

۱۷۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: تحفۂ یکدل صہ ۵۴ قلمی

۱۸۔ ایضاً صہ ۵۴ (کذا)

میر منو کی وفات کے بارے میں اطلاعات متضاد ہیں۔ طہماس قلی مسکین کا بیان ہے کہ میر منو کو زہر دیا گیا تھا۔ مسکین، میر منو کے متوسلین میں سے تھا۔ اس کی غیر مطبوعہ کتاب "تذکرہ طہماس قلی مسکین" برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ اس کے بیان سے یہ بھی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ شاید یہ زہر اسے بھکاری خان کے ایما پر دیا گیا تھا۔

۱۹۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: تحفۂ یکدل صہ ۵۶ قلمی۔ یکدل نے ابدالی کی وفات ۱۱۸۱ھ لکھی ہے (در اواخر سنہ یکہزار و یکصد و ہشتاد و یک بنا سور بینی درگذشت) لیکن وکیلی فوفلزئی نے میرزا عبدالہادی عشرت منشی باشی احمد شاہ ابدالی کی موزوں کی ہوئی تاریخ درج کی ہے جس میں ابدالی کا سالِ وفات ۱۱۸۶ھ ہے۔ آخری اشعار جن سے مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے یوں ہیں:

از بہرِ وفاتِ شاہ، عشرت می جُست | تاریخ نکو از خرد باید
از لطف بمن کرد جوابی کہ بگو | فردوس زمقدمش مزین گردید

۱۱۸۶ھ

دیکھیے عزیزالدین وکیلی فوفلزئی: ورق الزمان (ورق عکسی آخیر مقدمہ) چاپ کابل ۱۳۳۷ھ

۲۰۔ پروفیسر شجاع الدین : لاہور کی سیاسی و تمدنی تاریخ : نقوش لاہور نمبر

۲۱۔ مولوی احمد بخش یکدل ؛ تحفۂ یکدل ص ۵۵ قلمی

۲۲۔ عزیزالدین وکیلی پوفلزئی : ورق الزمان ص ۱۲۲ : چاپ کابل ، ۱۳۳۷ھ

۲۳۔ مفتی علی الدین : عبرت نامہ

۲۴۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی : تحفۂ یکدل ص ۵۹ قلمی ۔ مولوی یکدل نے لکھا ہے :

تیمور شاہ کی وفات کا سن کر لاہور کے مشہور دانشمند میر نقو شاہ ان کے دادا مولوی محمد ابراہیم چشتی کے پاس آئے اور کہا : "ایہا الشیخ تیمور شہ بمرد"۔

مولوی صاحب نے کہا : "تاریخ کہنی چاہیے"۔

میر نقو شاہ نے "تیمور شہ بمرد" پر غور کیا تو یہی مادۂ تاریخ تھا یعنی تیمور شہ بمرد کے اعداد درست ۱۲۰۷ تھے ۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی نے میر نقو شاہ کو لسان العجم کہا اور بے حد تعریف کی۔

۲۵۔ عزیزالدین وکیلی پوفلزئی : ورق الزمان ص ۱۲۴ : چاپ کابل ، ۱۳۳۷ھ

۲۶۔ Dr. M. Baqir: Lahore Past and Present P. 201, Lahore 1952.

۲۷۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی : تحفۂ یکدل ص ۹۷ قلمی (کذا)

۲۸۔ ایضاً ص ۱۰۲

۲۹۔ Dr. M. Baqir: Lahore Past and Present P. 206, Lahore 1952.

۳۰۔ سید احمد شاہ بٹالوی ؛ تاریخ ہندوستان سنہ ۱۰۲۲ ، ص ۱۰۲۳ قلمی

۳۱۔ Lt. Col. H.L.O. Garrett: Events at the Court of Ranjit Singh 1810 - 1817, LHR 1935.

۳۲۔ سر لیپل گرفن نے فالج کے پہلے حملے کا سال ۱۸۲۲ء لکھا ہے لیکن مولوی یکدل کے روزنامچوں میں اس واقعے کا اندراج کاتک ۱۸۹۰ مطابق نومبر ۱۸۲۳ء میں ہوا ہے۔

سر لیپل گرفن : رنجیت سنگھ ص ۱۶۰ ؛ مولوی احمد بخش یکدل : روزنامچہ سال ۱۸۲۳ء قلمی

۳۳۔ مولوی احمد بخش یکدل: روزنامچہ بسمت ۱۸۹۰/۱۸۳۳ء ص۱۴۴ قلمی

۳۴۔ ایضاً ۱۸۳۳ء تا ۱۸۴۴ء

۳۵۔ یکدل نے اسی روزنامچے میں ایک اور مقام پر بھی رہزنی کے ایسے ایک دوسرے واقعے کا ذکر کیا ہے۔

۳۶۔ سید محمد لطیف نے تاریخ پنجاب ۳۰ جون ۱۸۳۹ء تا ریخ لاہور (انگریزی) میں ۲۷ جون ۱۸۳۹ء اور سر لیپل گرفن نے "رنجیت سنگھ" میں ۲۷ جون ۱۸۳۹ء لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔

۳۷۔ سید احمد شہید ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر شہید کر دیے گئے۔ سکھوں کے علاوہ انگریزوں نے بھی ان کی شہادت پر جشن منائے۔

۳۸۔ فقیر سید عزیز الدین: روزنامچہ سیاہی مخزونہ عجائب گھر لاہور۔ تحریر کے وقت اس کے فوٹو سٹیٹ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۳۹۔ کنہیا لال: تاریخ پنجاب ص۳۶۳ مرتبہ کلب علی خاں فائق، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ جون ۱۹۸۱ء کتاب مذکور کے نسخہ مطبوعہ ۱۸۸۱ء میں تاریخ وفات والا فقرہ نہیں ہے۔ دیکھیے کتاب مذکور فوٹو سٹیٹ مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

۴۰۔ مولوی غلام حسن خرم: مضحکات خرم قلمی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

۴۱۔ مولوی احمد بخش یکدل: روزنامچہ یکدل (بیاض) نمبر ۱۲۔ مملوکہ راقم الحروف۔

۴۲۔ راجہ دھیان سنگھ

۴۳۔ ٹبالہ

۴۴۔ راجہ کھڑک سنگھ

۴۵۔ کنور نونہال سنگھ

۴۶۔ رانی چندر کور

۴۷۔ راجہ شیر سنگھ

۴۸۔ سردار عطر سنگھ سندھانوالیہ

۴۹۔ مولوی غلام حسن خرم : مضحکاتِ خرم مخطوطہ نمبر ۲۰۰۶۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

۵۰۔ مفتی علی الدین: عبرت نامہ مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈیمی لاہور ۱۹۶۱ء ص ۵۱۰/۱

۵۱۔ Khazan Singh, History and Philosophy of Sikh Religion, Lahore, 1914, P. 313.

۵۲۔ باری علیگ : کمپنی کی حکومت : نیا ادارہ لاہور ۱۹۶۹ء۔ ص ۳۵۵

۵۳۔ 1779-1869, See Buckland, C.E. Dictionary of Indian Biography, London, 1878, P.172.

۵۴۔ Dr. M. Baqir: Lahore Past and Present, Lahore 1952 P.217

۵۵۔ S.M. Latif: History of the Panjab, New Dehli, 1964, P.882

۵۶۔ یکدل : بیاضِ یکدل (خطی) شمارہ ۱۰

۵۷۔ مفتی علی الدین: عبرت نامہ لاہور ۱۹۶۱ء۔ جلد اوّل ص ۵۴۳

۵۸۔ Major Evaw Bell, Annexation of the Punjab, Lahore 1882, P.3.

۵۹۔ مولوی احمد بخش یکدل: بیاض نمبر ۱۳ (۱۸۴۸ء تا ۱۸۴۹ء) خطی

زانگریز و فوجش گرفتم شمار — بہ نوماہ کوشش شدہ چل ہزار

سوارانِ سکھانِ شمشیر زن! — بشمشیر حرف آمدہ سوئے جنگ

ہمہ چون در آوردم اندر شمار — بقیدِ قلم گشتہ دو صد ہزار

۶۰۔ مفتی غلام لاہوری: گنجِ تاریخ لکھنؤ ۱۸۷۷ء، ص ۲۱۰ (بطور تعمیہ)

چون شہِ پنجاب از پنجاب رفت — چشمہ سان از چشمِ مردم آب رفت

عالمی در چشمِ مردم شد سیاہ — چون ز چشمِ آن غیرتِ مہتاب رفت

جملہ گل در ہجرِ او خوردند گل — بلکہ از نرگس خمارِ خواب رفت

بلبلانِ در فراقش نعرہ زدند — چون ز بستان صحبتِ احباب رفت

گفت سرورؔ از سرِ درد این سخن "نوگلے از گلشنِ پنجاب رفت"

۶۱۔ محمد اکرم غنیمت کنجاہی کی مثنوی نیرنگِ عشق اورنگ زیب عالمگیر کے ہی زمانے کی تصنیف ہے جس میں عزیز و شاہد کے تمثیلی قصے میں اس دور کے جاگیردارانہ نظام کی اخلاقی گراوٹ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

۶۲۔ شاہ زمان ۱۷۹۷ء میں لاہور پہنچا۔

۶۳۔ شاہ مراد لاہوری: دیوانِ شاہ مراد (خطی) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، بحوالہ غلام دستگیر نامی: تاریخ جلیلہ، طبع دوم لاہور ۱۹۶۰ء ص ۱۹۹

۶۴۔ اس شعر کو پڑھ کر میر تقی میر کا یہ مشہور شعر یاد آجاتا ہے:

دلّی کے نہ کوچے تھے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

۶۵۔ غالباً نادر شاہ مراد ہے۔ بیدل کے بقول شعرا نے نادر کے حملۂ ہند کی تاریخ "چند قدم" کے الفاظ سے موزوں کی تھی (مولوی بیدل: تحفۂ بیدل۔ خطی ص۵۲)

۶۶۔ بحوالہ نامی: تاریخِ جلیلہ طبع دوم لاہور ۱۹۶۰ء ص ۱۹۷

۶۷۔ مولوی احمد بخش بیدل: بیاضِ بیدل نمبر ۱۲۔ مملوکہ راقم الحروف۔

۶۸۔ مولوی بیدل: تحفۂ بیدل (خطی)۔ مملوکہ راقم الحروف۔ ص ۹۹، ۱۰۰

۶۹۔ Lt. Col. Garrett and G.L. Chopra: Events at the Court of Ranjeet Singh 1810 - 1817, Lahore 1935, P.41

۷۰۔ Ibid, P. 190

۷۱۔ Ibid, P. 30

۷۲۔ Ibid, P. 53.

۷۳۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی لاہور ۱۹۶۴ء ص ۴۲۴

۷۴۔ سر لیپل گرفن: رولرز آف انڈیا "مہاراجہ رنجیت سنگھ" (اردو ترجمہ) ص ۴۷

۷۵۔ مولوی غلام حسن خورم: مضحکاتِ خورم (قلمی) پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔ ورق ۹۸ تا ۱۰۰ اب

۷۶۔ مولوی نور احمد چشتی: یادگارِ چشتی؛ مرتبہ گوہر نوشاہی۔ ناشر مجلس ترقیِ ادب لاہور ۱۹۷۵ء

۷۷۔ مولوی احمد بخش یکدل: بیاض نمبر ۱۶

۷۸۔ پہر: پہن

۷۹۔ گاہنڈے ہیں؛ گانٹھتے ہیں (پنجابی لہجہ)

۸۰۔ مولوی غلام حسن خورم: مضحکاتِ خورم (قلمی)۔ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

۸۱۔ مولوی احمد بخش یکدل: بیاضِ یکدل شمارہ ۱۲۔ ف ۱۸۱۔:

"گفت میاں ولی محمد برای شما منبر بود تا وعظ کنند"

۸۲۔ Events at the Court of Ranjit Singh, Lahore 1935. P.78.

۸۳۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: بیاضِ اشعار (قلمی) مملوکہ راقم الحروف۔ ص ۵۴ ؤ۔ مرقومہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء
دیوانِ حافظ کے علاوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کبھی کبھی گرنتھ سے فال لیتا تھا (ستیارام کوہلی: مہاراجہ رنجیت سنگھ الہ آباد ۱۹۳۳ء۔ ص ۱۰۰)

۸۴۔ مولوی احمد بخش یکدل کے چند روزنامچے راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔ باقی ان کی اولاد کی بے اعتنائی کے سبب سے ضائع ہو چکے ہیں۔ تفصیل متعلقہ باب میں آئے گی۔ تحفۂ یکدل کا بخطِ مصنف نسخہ راقم الحروف کے کتب خانے میں ہے۔ فقیر عزیز الدین کے روزنامچے کی دو جلدیں پنجاب یونیورسٹی اور دو جلدیں مرکزی عجائب خانہ لاہور کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

۸۵۔ کنہیا لال ہندی: تاریخِ لاہور، لاہور؛ وکٹوریہ پریس ۱۸۸۴ء ص ۲۱

۸۶۔ نقوش لاہور نمبر۔ ص ۵۳۴

۸۷۔ مولوی فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ، لکھنؤ، نولکشور ۱۹۰۶ء ص ۴۸۷

۸۸۔ بیاضِ یکدل: شمارہ ۵۔ ف ۱۸۰

۸۹۔ کریم بخش ولد محمد بخش نقاش کا ذکر مولوی یکدل کے علاوہ انہی سے استفادے کے ساتھ عبدالرحمٰن چغتائی نے "لاہور کا دبستانِ مصوری" میں بھی کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کریم بخش نقاش کے والد محمد بخش، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محبوب ترین اور پسندیدہ مصوروں میں سے تھے۔ صورت گری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے موراں اور گل بیگم کی تصاویر بھی بنائی تھیں۔

۹۰۔ یکدل : بیاضِ یکدل، شمارہ ۱۳۔ ف ۱۴۶

۹۱۔ ایضاً ۱۲

۹۲۔ ایضاً ۱۳

۹۳۔ اوراق منسلک با گلستان سعدی بخط یکدل۔ مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی

۹۴۔ منشی ہر سکھ رائے : کوہِ نور۔ ۱۱ فروری ۱۸۵۱ء

۹۵۔ مولوی نور احمد چشتی : یادگارِ چشتی (مرتبہ گوہر نوشاہی) لاہور۔ مجلس ترقیِ ادب ۱۹۷۵ء ص ۱۶

۹۶۔ مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء ص ۲۷

۹۷۔ باری علیگ : کمپنی کی حکومت، لاہور۔ نیا ادارہ ۱۹۶۹ء ص ۳۸۷

۹۸۔ ایضاً : ص ۳۸۸

۹۹۔ (کذا) امرناتھ اکبری، دیوان : دیوانِ اکبری، لاہور۔ مطبع کوہِ نور ۱۸۷۳ء ص ۱۵۲

باب دوم

خاندانِ چشتی کا علمی و ادبی ماحول

الف: ہمعصر مؤرخین

جس طرح گذشتہ باب میں اشارہ کیا گیا، مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے عہد کو اگر پنجاب میں تاریخ نویسی کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس دور سے متعلق بے شمار تاریخی آثار اب تک دستیاب ہو چکے ہیں۔ یقیناً لاتعداد تصانیف ابھی تک پردۂ گمنامی میں ہوں گی۔ ان تاریخی آثار میں جو کتابیں اب تک سامنے آئی ہیں، ان میں سے قابلِ ذکر مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عمدۃ التواریخ — مصنفہ لالہ سوہن لال سوری

۲۔ ظفر نامہ رنجیت سنگھ — " دیوان امرناتھ اکبری

۳۔ رنجیت نامہ — " احمد یار مرالوی

۴۔ فتح نامہ ملتان و پشاور "یدھ" — " گنیش داس بڈھگل

یہ چاروں کتابیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاندانِ چشتی کے علمی کام کی صحیح تاریخ چونکہ اسی عہد سے شروع ہوتی ہے، لہٰذا اس تاریخی سرمائے کو خاندانِ چشتی کا معاصر سرمایہ کہنا مناسب ہوگا۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ مہاراجہ کے عہد میں لکھے گئے بعض اہم روزنامچے بھی قابلِ ذکر ہیں جن کا ذکر ہر چند کہ مقالے میں ضرورت کے تحت بار بار آئے گا لیکن یہاں بھی مختصراً ان کا حوالہ دینا نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ روزنامچہ مولوی احمد بخش یکدل چشتی :

بیس مرتب اور دو نا مرتب کل بائیس بیاضوں پر مشتمل ہے۔ تفصیل باب چہارم میں آئے گی۔

۲۔ روزنامچہ فقیر عزیز الدین ابن فقیر غلام محی الدین نوشاہ ثانی :

اس روزنامچے کی دو جلدیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور دو عجائب گھر لاہور میں محفوظ ہیں۔

۳۔ کتاب مراسلات از فقیر عزیز الدین :

مملوکہ فقیر خانہ لاہور

۴۔ روزنامچہ فقیر غلام محی الدین :

مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

۵۔ روزنامچہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ، مصنف نامعلوم :

مخزونہ مرکزی عجائب گھر لاہور

۶۔ روزنامچہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ، نوشتہ نامعلوم :

مملوکہ کتابخانہ شخصی، ڈاکٹر وحید قریشی لاہور

۷۔ تحفۂ یکدل (تاریخ لاہور) : مصنفہ مولوی احمد بخش یکدل چشتی

۸۔ رسالہ از آثار فقیر نوشہ ثانی : فقیر غلام محی الدین نوشہ ثانی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے خاتمے اور انگریزی حکومت کی فتح کے بعد انگریزوں نے پنجاب شناسی کی طرف توجہ دی۔ اس سلسلے میں جو امور بطورِ خاص توجہ کا مرکز بنے ان میں تاریخِ پنجاب کی از سرِ نو ترتیب اور تنظیم کا کام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ پنجاب کی تاریخ سے سیاسی دلچسپی کے علاوہ انگریزوں کے اعتنا کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سکھ دور کے بارے میں وسیع اور غیر جانبدار معلومات مرتب صورت میں موجود نہیں تھیں۔

جو کتابیں موجود تھیں ان میں سے بعض کی سند خود ان کے معاصرین کی نظر میں مشکوک تھی۔ مثال کے طور پر مفتی علی الدین بن مفتی خیر الدین کی کتاب "عبرت نامہ" ہر چند کہ خالصہ عہد کے بعد لکھی گئی تاہم وہ خود خالصہ عہد کے معاصرین میں سے تھے۔ مفتی صاحب نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں لکھی جانے والی کتابوں کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے:

عمدۃ التواریخ:

"لالہ سوہن لال نامی سکنہ لاہور کتابی درین ضمن نوشتہ کہ بہ تطویل انجامیدہ وبسبب ہم مذہبی دراکثر مقامات رعایت نمودہ از نفس الامر بہ کنار ماندہ ودران سوائے ایجاد و ذکر ملک گیری سنگھاں دیگر چیزی مندرج نہ نمودہ"۔

ظفر نامہ رنجیت سنگھ:

"دہم دیوان امرناتھ پنڈت کاشمیری دہلوی کتابی نوشتہ کہ آن مثل وقائع سالیانہ بعبارت مختصر ومغلق بودہ کہ مطالعہ اش در بر آوردن مطالب، شائق را بدقت می اندازد"۔

تاریخ پنجاب:

"ونیز بوٹے شاہ نامی آوان سکنہ لودھیانہ کتابی نوشتہ کہ باوصف متانت ورنگینی فقرات بسبب تطویل اکثر مطالب دران مہمل ماندہ وسامع را جز سمع خراشی ازان حاصل نیست"[۱]

سکھ دور میں لاہور دربار میں آنے والے انگریز سیاحوں کی یادداشتیں اوّل تو تعداد میں کم تھیں دوسرے ان میں سے اکثر کی اشاعت نہ ہونے کے سبب سے محققین تاریخ کے لیے ان سے استفادہ کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے پنجاب کے بارے میں وسیع پیمانے پر معلومات جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس سلسلے میں خالصہ عہد کے بعض نامور مصنفین اور تاریخ دانوں سے بھی استفادہ

کیا گیا۔ مورخین کی سرپرستی کی گئی اور ان کو تاریخِ پنجاب پر امتیازی کاموں کا معقول معاوضہ اور انعام دیا گیا۔ اس سلسلے میں تاریخ دانوں نے پوری دیانت داری سے کام لیا۔ یہاں تک کہ مولوی احمد بخش یکدل جیسے انگریز دشمن مورخ بھی انہیں تاریخی معلومات فراہم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنی یادداشتوں میں ایک جگہ لکھا ہے:

'دیروز ہمراہ حافظ ایزد بخش روانہ مکان میر عبداللہ شاہ مترجم کہ در دفتر انگریزی گرے صاحب است، شدہ رفتم و رسیدم۔ صاحب بہادر کہ نام آن معلوم نیست، امروز معلوم کردہ خواہم نوشت، نشستہ بودند ابر کرسی ہا کہ مرسوم این گروہ است و باز بسیار خلق و محبت کردہ۔ احوال رسول پور سانگرہ تمام ظاہر کردم۔ . . . . . وسیلہ میر عبداللہ مترجم بحضور صاحب بہادر گذرانیدہ مشار الیہ بسیار راضی شدہ'[2]

اس ہمکاری میں جو مصنفین پیش پیش رہے ان میں غلام محی الدین بوٹے شاہ، مفتی علی الدین، مولوی نور احمد چشتی، امین چند، سید احمد شاہ بٹالوی، مفتی تاج الدین اور مفتی غلام سرور لاہوری قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۸۴۲ء میں بوٹے شاہ نے کیپٹن مرے ریذیڈنٹ لدھیانہ کی فرمائش پر فارسی زبان میں تاریخِ پنجاب لکھی۔ ۱۸۵۴ء میں مفتی علی الدین نے "عبرت نامہ" مکمل کر کے چارلس ریکس کمشنر لاہور کو پیش کی۔ مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقاتِ چشتی ۱۸۶۴ء میں ولیم کولڈ سٹریم کی فرمائش پر تصنیف کی۔ اسی طرح سفرنامہ امین چند، تاریخِ پنجاب مصنفہ سید احمد شاہ، حالات ضلع لاہور از مفتی تاج الدین اور تاریخ مخزن پنجاب از مفتی غلام سرور لاہوری بھی "صاحبانِ عالی شان" کی فرمائش پر 'امیدِ صلہ' سے لکھی گئیں۔ یہ کتابیں محض سیاسی وقائع ہی کو پیش نہیں کرتیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کے اندر انیسویں صدی کی معاشرت، رسم و رواج اور لوگوں کے طرزِ بود و باش پر خصوصی ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بوٹے شاہ کی تاریخ سیاسی ہے لیکن مفتی علی الدین اور سید احمد شاہ کے ہاں معاشرتی اور تمدنی حالات کے لیے خاص صفحات وقف ہیں۔ مفتی علی الدین نے لالہ سوہن لال اور امرناتھ اکبری پر جو الزام لگائے ہیں، مفتی صاحب کے عہد

کی بعض دیگر تصانیف بھی ان عیوب سے پاک نہیں ۔ اگر ان سے پہلے مصنفین نے قومی تعصب اور گروہی تنگ نظری کو اپنے آپ پر مسلط کیا ہے تو انہوں نے بھی حالات و واقعات کو اپنے ولی نعمت یعنی انگریز کی عینک سے دیکھنا قابلِ فخر سمجھا ہے۔ یہاں تک کہ مفتی غلام سرور لاہوری نے تو جنگِ آزادی کو ہر جگہ مفسدہ ہی لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے علاوہ کوئی ایسا مورخ نہیں جسے صحیح معنوں میں غیر جانبدار اور حق گو سمجھا جائے۔

یوں تو ان میں سے ہر مورخ کا لاہور کے خاندانِ چشتی سے کچھ نہ کچھ تعلق تھا لیکن بعض مصنفین کے اس خاندان سے خصوصی مراسم تھے۔ چنانچہ امرناتھ اکبری مصنف ظفر نامہ رنجیت سنگھ، مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے شاگردِ خاص تھے۔ امرناتھ اکبری نے انہیں ظفر نامہ میں جگہ جگہ مخدومی، مطاعی اور استاذی کے کلمات سے یاد کیا ہے۔ اکبری کی مورخانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ستیا رام کوہلی لکھتے ہیں؛

> ' دیوان امرناتھ مہاراجہ کے مشہور دیوان راجہ دینا ناتھ کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے نہایت قابل استاد مولوی احمد بخش یکدل چشتیؒ کا شاگرد تھا۔ مولوی صاحب کو خود تاریخ کے مطالعے کا بہت شوق تھا اور یہی شوق انھوں نے اپنے اس ہونہار و قابل شاگرد میں پھونک دیا۔'[۱۴]

یقین ہے کہ امرناتھ اکبری نے مولوی یکدل کی معلومات اور مورخانہ نظر دونوں سے استفادہ کیا ہوگا۔ مولوی نور احمد چشتی، مولوی یکدل کے بیٹے تھے۔ ان کی کتاب تحقیقاتِ چشتی پر آئندہ ابواب میں بحث ہوگی۔ مفتی علی الدین بن مفتی خیر الدین، مولوی یکدل چشتی کے ہم زلف ہیں اور مولوی نور احمد چشتی کے حقیقی خالو۔ اسی طرح مفتی غلام سرور لاہوری اور مولوی نور احمد چشتی میں گہرے دوستانہ مراسم تھے اور مفتی غلام سرور نے اپنی مشہور تصنیف خزینۃ الاصفیاء کی تصنیف میں مولوی نور احمد چشتی کی کتاب تحقیقاتِ چشتی کے مسودے سے استفادہ کیا تھا۔ نیز تحقیقاتِ چشتی میں اکثر مادہ ہای تاریخ مفتی غلام سرور کے ہی موزوں کیے ہوئے ہیں۔ چشتی خاندان کے ان بستگان میں سے امرناتھ اکبری اور مفتی غلام سرور کا ذکر شعراء

کے زمرے میں بھی آئے گا جہاں ان پر مناسب روشنی ڈالی جائے گی۔ مولوی نور احمد چشتی کا تفصیلی تعارف بھی آئندہ ابواب میں الگ عنوانات کے تحت آئے گا۔ اس جگہ بے محل نہ ہوگا اگر مفتی علی الدین بن مفتی خیر الدین کے حالاتِ زندگی پر کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

مفتی صاحب کی تصنیف "عبرت نامہ" کو ۱۹۶۱ء میں پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور نے ڈاکٹر محمد باقر کے اہتمام سے دو حصوں میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو مقدمے کی تدوین کے لیے مفتی علی الدین کے حالاتِ زندگی تفصیلاً میسر نہ آسکے لہٰذا انھوں نے کتاب کے اندر مندرج چند اشارات پر ہی اکتفا کیا اور مصنف پر ایک معمولی سے نوٹ کے علاوہ قارئین کو ان کے بارے میں خاطر خواہ معلومات بہم نہ پہنچا سکے۔ میں نے مفتی علی الدین کے حالاتِ زندگی چشتی خاندان کی بیاضوں اور یادداشتوں کی مدد سے مرتب کیے ہیں، جنھیں خلاصتہً یہاں درج کرتا ہوں۔ یہ حالات پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ "عبرت نامہ" کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر ان معلومات کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے!

مفتی علی الدین بن مفتی خیر الدین[۴]

مفتی علی الدین مصنّف عبرت نامہ کے والد کا نام مفتی خیر الدین[۵]، دادا کا نام غلام محمد سادہ کار اور پردادا کا نام مفتی محمد یوسف تھا۔ ان کی والدہ کا نام صاحب جان بتایا گیا ہے[۶]۔ مفتی علی الدین کے بزرگ عہدِ درانی میں علم حاصل کر کے قضاوت کے عہدے تک پہنچے تھے۔ مفتی صاحب دو بھائی تھے۔ دوسرے بھائی ان سے بڑے تھے اور ان کا نام مفتی ابوبکر تھا۔ مفتی ابوبکر کی اولاد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ وفات ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں ہوئی۔ مولوی نور احمد چشتی نے مندرجہ ذیل تاریخِ وفات بطور تعمیہ کہی ہے

سروشم سال از روئے جبل زود
دریغا گفت و ہے ہے گفت و وائے[۷]

مفتی علی الدین کی شادی مولوی محمد بخش صحاف کی بیٹی آمنہ سے ہوئی۔ آمنہ کی دوسری بہن خیر النساء

مولوی احمد بخش یکدل چشتی کی اہلیہ تھی۔ اس اعتبار سے مفتی علی الدین، مولوی یکدل کے ہم زلف اور مولوی نور احمد چشتی کے حقیقی خالو تھے۔ مفتی علی الدین کی وفات سہ شنبہ ۹۔ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۵۔ ماہ جیٹھ سمت ۱۹۱۸ مطابق ۱۸ جون ۱۸۶۱ء کو ہوئی۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے مندرجہ ذیل تاریخ وفات کہی:

تاریخِ رحلت مفتی علی الدین

علی الدینِ خیر الدین کہ مردی بے تکلف بود
تکلف برطرف تکیہ کلامی بُد بہر حالش
محضب عمرش از پنجاہ کمتر بود واویلا
کہ شد باز قضا از پنجہ در فکرِ پر و بالش
ادب، لطف شرافت، ظاہر تسلیم و دینداری
قلم شد یکدلا حیران از تفصیلِ اجمالش
بہ اردی بہشت و بست و ششش، روز یکشنبہ
ہزار و یک صد و ہژدہ کہ ابیض شد سیہ خالش
بعمر پنج روزہ ہفت روزش بود تکلیفی!
کہ خال اختر او سوختہ دیدم چون از فالش
سروش بے تکلف در دلِ من نکتہ ای انداخت
کہ اکثر نکتہ ای بود اندرون قبل و ہم قالش
نہم از ماہ حج روز سہ شنبہ چون ز دنیا رفت
علی الدین مفتی بے تکلف، گفت از سالش

۱۲۷۷ھ

یکدل نے اس قطعے میں جو بیش بہا اطلاعات فراہم کی ہیں ان کی رو سے مفتی علی الدین کی عمر،

وفات کے وقت یعنی ۱۸۶۰ء میں پچاس سال سے کم نہ تھی۔ اس اعتبار سے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب ۱۸۱۰ء یا ۱۸۱۱ء کے قریب متولد ہوئے تھے۔ بیڈل کے بقول مفتی صاحب ایک بے تکلف انسان تھے اور "تکلف برطرف" ان کا تکیہ کلام تھا۔ وہ شرافت، دینداری اور تسلیم و رضا کا نمونہ تھے۔ مفتی صاحب صرف سات دن علیل رہ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مفتی علی الدین کے بیٹے مفتی جلال الدین ۱۸۵۹ء میں انگریزی حکومت کی طرف سے لاہور کے قاضی تھے۔ مفتی جلال الدین کی شادی قاضی مسیح الدین کی بیٹی سے ہوئی جو عہدِ رنجیت سنگھ میں قضاوت کے عہدے پر ممتاز تھے۔ مفتی جلال الدین کی وفات ۲۵ مئی ۱۸۸۷ء کو منگل کے دن ہوئی۔[۱۰]

مفتی جلال الدین کے بیٹے مفتی حفیظ الاسلام تھے جن کی شادی مولوی فضل الدین صحاف کی بیٹی بیگم عرف بیگاں سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون مولوی فیروز الدین صدیقی کی حقیقی بہن تھی جو پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم کے والد تھے۔ مفتی حفیظ الاسلام نے ۲۴ ستمبر ۱۸۹۷ء کی رات کو انتقال کیا۔[۱۱]

مفتی علی الدین کے والد مفتی خیر الدین بھی علم تاریخ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ عبرت نامہ کا ابتدائی مسودہ انہوں نے ہی تیار کیا تھا۔ مفتی علی الدین نے اس میں مزید تحقیقی مواد شامل کر کے اسے دنیائے تاریخ میں بیش قیمت بنا دیا۔[۱۲]

ب۔ معاصر اخبار اور مطابع

انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی پنجاب میں نشر و اشاعت اور ابلاغ کے ذرائع کا ظہور ہونے لگا۔ لاہور میں پہلا مطبع منشی محمد عظیم نے قائم کیا۔ جنہوں نے ۱۸۴۸ء میں لدھیانہ کے مشنریوں سے یہ مطبع خرید کر لاہور میں منتقل کیا اور اس کا نام لاہور کرانیکل رکھا۔ لاہور کرانیکل کی شائع کردہ بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی کی "یادگار چشتی" بھی پہلی بار ۱۸۵۸ء میں اس مطبع سے شائع ہوئی۔ اسی زمانے تک منشی محمد عظیم کا ایک اور مطبع "مطبع پنجابی" کے نام سے لاہور میں قائم ہو چکا تھا چنانچہ ۱۸۵۸ء کی

چھپی ہوئی مولوی نور احمد چشتی کی کتاب "تحفۂ چشتی" اسی مطبع کی اشاعت ہے۔

۱۸۴۹ء میں لالہ ہرسکھ رائے نے لاہور میں مطبع کوہِ نور قائم کیا جس کے قیام کی تاریخیں اس دور کے ممتاز الشعراء نے موزوں کیں جن میں مولوی نور احمد چشتی، مفتی غلام سرور لاہوری اور دیوان امرناتھ اکبری قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ اکبری کی کہی ہوئی تاریخ درجِ ذیل ہے:

چھاپہ خانہ منشی ہرسکھ رائے کا — ہے بنا جس دن سے مثلِ کوہ نور
نامِ نامی کوہِ نور اس کا رکھا — دل کو حیرت تھی کہ آیا کس لیے؟
کیا متانت سے ہے اس کا مدعا — کوہِ سنگیں سے ہے کیا نسبت اسے
اختراعِ تازہ از بحرِ ریا — جب نہ جانا کچھ تو جانا یہ کہ ہے

الغرض ہے اس کی یہ تاریخِ سال
چھاپہ خانہ لالہ ہرسکھ رائے کا ۱۲۶۵ھ

۱۲۶۶ھ

۱۲۔ جنوری ۱۸۵۰ء کو لالہ ہرسکھ رائے نے اس مطبع سے ہفتہ وار اخبار "کوہِ نور" جاری کیا۔ چنانچہ اسعد الاخبار آگرہ میں اس کے اجراء کی خبر جنوری ۱۸۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ ۱۸۵۰ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق صوبے بھر میں کوہِ نور کی اشاعت سب سے زیادہ تھی۔ لالہ ہرسکھ رائے کے علاوہ صحافتی سوجھ بوجھ اور تجربے کے ایک صلح کل اور ہردلعزیز انسان بھی تھے۔ اس اخبار کو ہندو مسلم ہر گروہ کے عوام نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ ۱۸۵۱ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق اس سال کوہِ نور ہفتے میں دو بار بھی شائع ہوتا تھا۔ سرکاری رپورٹ کی رو سے کوہِ نور کا اجراء پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی سرپرستی میں ہوا تھا۔ اس کے مطابق قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ منشی ہرسکھ رائے کا صحافتی کردار بہت بلند ہے۔ وہ بے باک اور نڈر صحافی ہیں اور حق گوئی میں کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔ انہوں نے لاہور میں پھیلنے والی ان تازہ معاشرتی اقدار پر شدید نکتہ چینی کی ہے جو انگریزی سیاست کا ردِ عمل تھا۔ انہوں نے انگریزوں کے انتظامی رویّوں خاص کر عوام دشمن عناصر کی حوصلہ افزائی کی ہمیشہ مخالفت کی۔ یہی سبب ہے کہ ۱۸۵۲ء کی سرکاری

رپورٹ میں لکھا گیا:

"یہ اخبار . . . . . . لوگوں میں روشن خیالی پیدا کرنے اور ان کی ترقی و بہبود میں ممد ہو رہا ہے"[۱۳]

چشتی خاندان کے ادیبوں کی تحریریں اس کے زمانۂ اجرا سے ہی اس میں شائع ہونے لگی تھیں، چنانچہ مولوی احمد بخش یکدل اور ان کے صاحبزادے مولوی نور احمد چشتی، مولوی محمد علی چشتی پُردل اور مولوی محرم علی چشتی سب کے اپنے اپنے زمانے میں لالہ ہر سکھ رائے کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم رہے اور "کوہِ نور" ان کی تحریروں کو ہمیشہ خیر مقدم کہتا رہا۔ مثال کے طور پر ۱۔ جنوری ۱۸۵۵ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں مولوی احمد بخش یکدل چشتی کا فارسی زبان میں ایک خط اور ایک قطعۂ تاریخ درج ہے جس میں شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کی وفات پر اظہارِ تعزیت اور مادۂ تاریخ موزوں کیا گیا ہے۔ اسی شمارے میں ذوق کی وفات پر مولوی نور احمد چشتی اور مولوی محمد علی پردل کے قطعاتِ تاریخ بھی موجود ہیں۔

یکدل کا قطعہ آیندہ باب میں درج ہوگا۔ اس جگہ مولوی نور احمد اور پُردل کے قطعات درج کیے جاتے ہیں:

از نتائج طبع مولوی نور احمد صاحب متخلص بہ چشتی خلف مولوی یکدل صاحب:

بذوقِ شعر و سخن بُد تمام ابراہیم
بسبحۂ شعراء چون امام ابراہیم
سروش گفت و صالش چنان بچشتی ما
قدم رسول گزین شد مقام ابراہیم[۱۵]

۱۲۷۱ھ

طبع زاد مولوی محمد علی صاحب فرزند خورد مولوی یکدل صاحب متخلص بمولوی:[۱۶]

شیخ ابراہیم عزرائیل دیدہ واہ گفت
فوق و تحت اے مولوی غمہا نمودآہ گفت
سال او چون بہ مرید قطب چرخ سلطنت
ہاتفیم شیخ ابراہیم اہل اللہ گفت[۱۷]

۱۲۷۱ھ

دسمبر ۱۸۵۰ء میں فقیر سید سراج الدین نے لاہور سے دریائے نور جاری کیا۔ گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس مجلّے کے پہلے مدیر نجیب الدین حسین تھے[۱۸]۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس سے اختلاف کرتے ہوئے فقیر سید شہسوار الدین کو اس کا مدیر قرار دیتے ہیں[۱۹]۔ مولوی احمد بخش یکدل کی بیاضوں میں بھی اس اخبار کا ذکر موجود ہے۔ مولوی صاحب نے مطبع اور اخبار کے اجرا کا مادۂ تاریخ مندرجہ ذیل موزوں کیا تھا[۲۰]:

چیست آن تاریخ این یک مصرعیست
"شد شہانہ مطبع دریائے نور"

۱۸۵۰ء

۱۸۵۲ء میں منشی دیوان چند نے لاہور سے "ہمائے بے بہا" جاری کیا جس کا دائرۂ اثر کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔

ان اخبارات نے لاہور میں ادبی رجحانات کو فروغ دیا۔ انگریزی دور میں جن نئے سیاسی اور معاشرتی مسائل نے جنم لیا تھا، ان پر اظہار رائے کیا۔ اس سلسلے میں دیانت اور پامردی کی بعض عمدہ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر فقیر سید سراج الدین کا اخبار دریائے نور محکمۂ پولیس کے استعمار گرانہ رویے کا مخالف تھا جس کی سزا میں اس اخبار کو حکومت کی طرف سے کوئی سہولت حاصل نہ تھی۔ فقیر صاحب نے اخبار کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا لیکن نہ تو حق گوئی سے باز آئے اور نہ اپنے اخبار کو حکومت کا آلۂ کار بننے دیا۔

ج۔ ہم زمان شاعری اور نثر

لاہور میں خاندانِ چشتی کی اردو خدمات کا زمانہ ۱۸۰۰ء یعنی مولوی غلام حسین چشتی کے نمونہ ہای شعر سے ۱۹۰۰ء یعنی مولوی محرم علی چشتی کے اخبار رفیقِ ہند کے دمِ واپسیں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سو سال کے عرصے میں سیاست اور حکمرانی کے دو اہم ادوار اس خاندان کے سامنے رہے۔

۱۔ لاہور میں خالصہ عہد کا زریں دور یعنی مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کا زمانہ

۲۔ انگریزی دورِ حکومت

یہ دونوں ادوار لاہور میں ادبی رجحانات اور مقدارِ تخلیقات کے اعتبار سے مختلف نتائج کے حامل ہیں۔ خالصہ عہد میں سرکاری زبان فارسی، سفارتی اور تشریفاتی زبان اردو اور عوامی زبان پنجابی تھی۔ سکھوں کی قومی زبان ہونے کے لحاظ سے پنجابی کو ہر چند اردو سے زیادہ اہمیت حاصل تھی تاہم اردو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اسے شائستگی اور متانت کی علامت قرار دیا جاتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین سفیروں اور دربار میں آنے والے اجنبیوں سے اردو میں بات چیت کرتے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ کے بارے میں سید محمد لطیف نے اطلاع دی ہے کہ:

> "مہاراجہ صاحب ہمیشہ پنجابی زبان میں گفتگو کیا کرتے لیکن جب انگریزوں سے بات چیت کرتے تو ہندوستانی (اردو) زبان میں کرتے۔"

مہاراجہ شیر سنگھ کا عہد (۱۸۴۱ء – ۱۸۴۳ء) اردو ادب کی سرپرستی کے لیے قابلِ ذکر ہے۔ مولوی غلام حسن خورم جیسے قادر الکلام اور مرزا نثار علی نکہت جیسے مشاق شاعر اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ خورم نے راجہ شیر سنگھ کے دربار سے اپنی وابستگی کا اعتراف اس مخمس میں کیا ہے جس میں راجہ کی تخت نشینی کے واقعات ہیں، جسے گذشتہ باب میں نقل کیا جا چکا ہے۔ اس کے آخری بند میں کہتے ہیں:

بڑے اقبال سے ہے بادشاہ لاہور کا حافظ
سری سنگور ہوئے اس بادشاہ کے جا بجا حافظ
ارے خورم چلو دربار میں کہہ کر خدا حافظ
حضوری گر ہمی خواہی ازو غایب مشو حافظ

متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا[۲۱]

مرزا نثار علی بیگ نکہت کے بارے میں تذکرہ گلستانِ سخن کے مولف قادر بخش صابر نے لکھا ہے

نکہت خاندانِ شرافت اور دودمانِ نجابت سے تھا۔ فنِ سخن میں شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی تھی۔ تلاشِ روزگار میں دہلی سے لاہور آیا۔ ان دنوں یہاں رنجیت سنگھ کے بیٹے راجہ شیر سنگھ کی حکومت تھی۔ نکہت نے ایک قصیدہ لکھ کر راجہ کی نذر کیا۔ راجہ نے ازراہِ قدر دانی نان و نفقہ کے لیے معقول رقم مقرر کر دی۔[۲۲]

مہاراجہ شیر سنگھ تعلیم یافتہ اور باشعور انسان تھا۔ وہ دوسرے سکھ حکمرانوں سے بہت مختلف تھا۔ شیر سنگھ فارسی اور اردو زبان کے علاوہ انگریزی زبان بھی جانتا تھا جس کی تعلیم کا رنجیت سنگھ نے خود انتظام کیا تھا۔[۲۳] مہاراجہ رنجیت سنگھ آخری عمر میں انگریزی تعلیم کا قائل ہو گیا تھا کیونکہ اس کے نزدیک اہلِ پنجاب کے لیے نئے علوم سے بہرہ مند ہونا مفید تھا۔ مہاراجہ سرکاری خرچ پر لاہور میں سکول بھی کھولنا چاہتے تھے۔ اگر لدھیانہ مشن سکول کے معلم مسٹر لاری انجیل کی تعلیم پر اصرار نہ کرتے تو شاید مہاراجہ اس کی سرپرستی میں ایک سکول ضرور کھول دیتا۔ مہاراجہ چاہتا تھا کہ سکول میں صرف فارسی، اردو اور گورمکھی پڑھائی جائے۔[۲۴] مہاراجہ دلیپ سنگھ کے اتالیق پنڈت رادھا کشن تھے جو اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور شنکر تخلص کرتے تھے۔[۲۵] ان کا ذکر لالہ سری رام نے بھی خمخانۂ جاوید میں کیا ہے۔ راج دربار سے قطع نظر خالصہ عہد کے متعدد وزرا، رئیس زادے اور اہلِ علم اردو نظم و نثر میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے ان میں سے بعض کے ادبی آثار موجود ہیں۔

انگریزی عہد کے قیام کے بعد جہاں لاہور کی معاشرتی صورتِ حال تبدیل ہوئی وہاں ادبی رویّوں میں بھی فرق آ گیا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں آتے ہی مغلیہ حکومت کی سرکاری زبان کے مقابلے میں مسلمانوں کی عوامی اور تہذیبی زبان اردو کی سرپرستی شروع کر دی۔ شاید وہ ذرائع ابلاغ کو کمزور کر کے مغلوں کے سیاسی نظام پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ اردو زبان کی سرپرستی انگریزی سیاست کا ایک اہم حصہ تھی۔ ۱۸۴۹ء یعنی الحاقِ پنجاب کے پہلے سال ہی سے انگریزوں نے اردو زبان کی ترویج کی طرف توجہ کی۔ اردو کی ترویج کا سرکاری ریکارڈ شاہد ہے کہ بورڈ آف ایڈمنسٹریشن پنجاب کے سیکرٹری نے ۲۔جون ۱۸۴۹ء کے ایک سرکلر کے ذریعے جب لاہور، ملتان، لیہ اور جہلم کے کمشنروں اور پشاور اور ہزارہ کے ڈپٹی کمشنروں سے استفسار کیا کہ کیا ان کے ڈویژن عدالتی اور دفتری امور کی انجام دہی میں فارسی زبان کو ہی برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا اس کی بجائے "اردو" کو بہتر اور قابلِ عمل تصور کرتے ہیں تو اس کے جواب میں لاہور ڈویژن کے کمشنر رابرٹ منٹگمری نے جی۔جے۔ کرسچن سیکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن پنجاب کو ۲۸ر جون ۱۸۴۹ء کے خط میں بلا تامل جواب دیا:

"In reply to your letter of the 2nd instant, No.193, I have the honour to inform you that the whole of the officers of my division are in favour of the Oordoo language being used in the different courts as best suited for official businesses, and in their opinion I entirely concur."[26]

رابرٹ منٹگمری سے ملتی جلتی رائے گجرات کے ڈپٹی کمشنر مسٹر بیلی، لیہ کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن ہولنگز اور کمشنر کیپٹن ڈی رُس نے ارسال کی۔ انہی آرا کی بنیاد پر سیکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن برائے پنجاب نے ۱۷۔اگست ۱۸۴۹ء کو مسٹر ایچ۔ ایم ایلیٹ سیکرٹری گورنمنٹ ہند و سیکرٹری گورنر جنرل برطانوی ہند کو لاہور کے بارے میں مندرجہ ذیل سفارش منظوری کے لیے ارسال کی:

"In the Lahore Division which comprises the upper portion of the Baree and Rachna Doab the Commissioner and his subordinates included those formerly the Pol. employ and habituated to the use of Persian are in favour of Oordoo in which opinion the Board entirely concurs."[27]

اسی خط میں سیکرٹری بورڈ نے جہلم اور ملتان ڈویژن کے لیے بھی اردو کی سفارش کی۔ ان سفارشات کو سر ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ کے خط مکتوبہ ۶۔ ستمبر ۱۸۴۹ء کے مطابق گورنر جنرل نے منظور کر لیا۔

۲۰۔ ستمبر ۱۸۴۹ء کو ایڈمنسٹریشن پنجاب بورڈ کے سیکرٹری نے لیہ کے کمشنر اور پشاور و ہزارہ کے ڈپٹی کمشنروں کو ایک خط لکھا جس میں سرکاری سطح پہ اردو کے نفاذ کے بارے میں سر جان لارنس کا ایک نوٹ نقل کیا۔ یہ نوٹ چونکہ انیسویں صدی کے پنجاب میں اردو زبان کی ترویج میں خاص اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا اسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

Note by Sir John Lawrence:

1. In April 1851 (1849 ?) the board issued an order that Urdu should be the language of our Courts in the Punjab. I believe that Peshawar and Hazara, the Derejat and Multan been exempted.

2 If these be the cases, I request Mr. Melvie after looking at the circular vide draft and letter to the Commossioner of Peshawar, Leia and Multan asking their views in the introduction of Urdu for substitution of Persian into the exempted Courts.

3. It should be considered that the Urdu is not the language of these districts neither is Persian. But Urdu is well understood by the majority of our officers whereas Perisan is not. Of course many more of the people understood Urdu even in these Districts than Persian. Urdu is the "Lingua Franca" of India and it is presumbly but perceptibly becoming that of all the Districts in the Punjab even in the Derajet and Peshawar. It is spreading in Hazara. It is familiar to the people."[28]

لارڈ لارنس اردو زبان پہ کافی دسترس رکھتا تھا۔ اس نے مولوی نور احمد چشتی سے اردو پڑھی تھی جو پنجاب میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی "صاحبان" کے مدرس برائے تدریس زبان اردو مقرر ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ لارنس مسلمانوں کی تہذیب اور شائستگی کا بھی معترف تھا اور لاہور سے اسے گہرا لگاؤ تھا؛ لہٰذا اس نے لاہور میں اردو زبان کی ترویج کو یقیناً وقت کا اہم تقاضا سمجھا ہو گا۔[۲۹]

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ اکثر محققین خالصہ عہد کے پنجاب میں اردو کی ترویج کو ناممکن اور بے حقیقت سمجھتے ہوئے انگریزی دور کے پنجاب میں اردو ادب کے نمونوں کو ایک ناگہانی حادثہ خیال کرتے ہیں اور اس بات پہ غور نہیں کرتے کہ اگر پنجاب میں اردو کی ترویج اور محبوبیت کی جڑیں بہت زیادہ گہری نہ ہوتیں تو جان لارنس سے لاہور کے لیے بطور دفتری اور سرکاری زبان موزوں ترین کیوں قرار دیتا۔ سکھ دور میں اردو کے بے شمار نمونے ابھی پردۂ اخفا میں پڑے ہیں ورنہ خالصہ عہد کی بزمِ ادب کا وسیع تر جائزہ مرتب کرنا ناممکن نہیں۔

انگریزی دور کے ادب سے سب سے اہم تبدیلی نظم و نثر میں سلاست اور حقیقت پسندی ہے۔ ان کے اسلوب کو خالصہ عہد کے کلاسیکی اسلوب سے جلد شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب دہلی کی مرکزیت ختم ہوئی اور دہلی اجڑ گیا تو اہلِ علم و دانش کی بساط پنجاب میں

بخشی۔ پنجاب میں رہنے والے ادیبوں نے انہیں سر آنکھوں پر جگہ دی بلکہ انھیں اپنوں سے بڑھ کر اہمیت دی اس کے نتیجے میں ترویجِ ادب کی دو تحریکیں لاہور میں ابھریں اور انہوں نے لاہور کو برِصغیر میں اردو ادب کی ترقی و اشاعت کا گہوارہ بنا دیا۔ مولوی فیض الحسن سہارنپوری جیسے نابغہ روزگار جو جنگِ آزادی کے بعد لاہور آ گئے تھے، لاہور کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ شہر ان دنوں دوست دشمن کا ٹھکانا ہے اور ترویجِ ادب کے لیے ہندوستان بھر میں عروس البلاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۶۴ء میں انجمن پنجاب کے قیام اور اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے قیام اور اس میں علومِ شرقیہ کی ترویج و اشاعت کے پروگراموں نے لاہور کے ادبی ماحول کو منور کر دیا اور خالصہ عہد کے کلاسیکی شعراء کے ساتھ ساتھ جدید شاعری اور جدید نثر نگاری کے چراغ بھی لاہور کے گلی کوچوں میں جگمگانے لگے۔ لہٰذا، ۱۸۵۷ء سے پہلے کے دور کے ساتھ ساتھ انگریزی دور میں خاندانِ چشتی کے معصروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ اس اعتبار سے ہم خالصہ عہد کو خاندانِ چشتی کے معاصرین کا دورِ اوّل اور انگریزی عہد میں ان کے معاصرین کو دورِ دوم میں رکھ کر دیکھیں گے ان میں سے چند ایسے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا جو چشتی خاندان کے ادیبوں کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقِ ادب میں ان کے ہمسفر بھی تھے۔

دورِ اوّل کے شعراء

۱۔ مولوی غلام حسن خورّم

خورم تخلص، مولوی غلام حسن نام تھا۔ کنہیا لال ہندی نے انہیں سکھ دور کے ممتاز شعراء میں شمار کیا ہے۔ جس طرح پہلے بیان کیا گیا، خورم راجہ شیر سنگھ کے دربار میں شاعر تھے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ ایک مخمس میں اپنے آپ کو مرتضائی کہا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ خورم شاید شیعہ عقاید کے مالک تھے۔ بہرکیف اپنے عہد میں وہ بلند پایہ شاعر تھے۔ خورم کے

اردو اور فارسی کلام کا مخطوطہ "مضحکاتِ خورم" کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے خورم قطعہ اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے اور اسلوبِ خاص کے حامل تھے۔ ان کے کلام میں عصری حالات کی جھلک موجود ہے جو ان کی سیاسی اور تمدنی بصیرت کا واضح ثبوت ہے۔ ان کی دو نظمیں گذشتہ باب میں درج کی جا چکی ہیں۔ اس جگہ ایک غزل بطور نمونہ درج کی جاتی ہے:

اس کی میری دوستی اکثر بنے اور ٹوٹ جائے
شمع سے پروانے کی اکثر بنے اور ٹوٹ جائے
جس طرح دریا پہ اک دم زندگی رکھتا حباب
اس طرح اس عمر کا ساغر بنے اور ٹوٹ جائے
یوں گرا موتی لڑی کا اس صنم کی مانگ سے
رات میں جس طرح سے اختر بنے اور ٹوٹ جائے
کیا اثر ہے اشک میں نکلے جو درجِ چشم سے
آتے آتے خاک تک گوہر بنے اور ٹوٹ جائے
تیزیِ سُرمہ سے آنسو بہ چلے اس شوخ کے
اس طرح ابلق گھر کمتر بنے اور ٹوٹ جائے
شاہ کے سائے میں خورم حشر میں ہو گھر ترا
کیا ہے یہ دنیا کا گھر، اکثر بنے اور ٹوٹ جائے[۳۰]

خورم کے کلام میں تازگی، ندرت اور قدرتِ زبان و بیان اس غزل سے صاف ظاہر ہے۔ خورم کا تقریباً تمام کلام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

۲۔ نتھو شاہ

سید امیر بخش نام اور نتھو شاہ عرف تھا۔ اپنے عہد کے جیّد حکما اور نامور شعراء

میں سے تھے۔ کنھیا لال اور مفتی علی الدین نے نامِ طبیبوں میں اور مولوی احمد بخش یکدل نے انھیں عالم اور شاعر کے علاوہ "مردِ عامل و کامل و مرگاں پوش" لکھا ہے۔ رنجیت سنگھ کو لاہور کا قبضہ دلانے والے گروہ کے ایک رکن یہ بھی تھے۔ ۱۸۴۸ء تک وفات پا چکے تھے کیونکہ مولوی یکدل نے اس سال کی بیاض میں ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مزار کی نشاندہی کی ہے۔ یکدل اپنی ولادت کے ذکر میں نتھو شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"صبحگاہان کہ سید امیر بخش عرف نتھو شاہ کہ مرد کامل و مرگاں پوش و حاکمانِ وقت بر دروازہ اوی رسید ند او شاعر نیز بود۔ و صاحبِ علم۔ قبرش بیرون خضری دروازہ لبِ خندق تا حال موجود است، برای مبارکبادی آمد۔ جناب جدی امجدی گوشگزار کردند میر نتھو صاحب دعا در حقِ بندہ کردند۔"[۳۱]

مفتی علی الدین نے ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وحید العصر بودند، با وصف اینکہ نہ مصارف بذات خود پیش آمدی سوال نمی کردند۔ و بنا برآن مرجع خواص و عوام لاہور و حکام وقت بودند۔"[۳۲]

نتھو شاہ کی طبی تالیفات کا ذکر کنھیا لال نے کیا ہے۔ ان میں تبصرۃ الاطبا اور مرأۃ الشفا[۳۳] شامل ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کے دادا مولوی محمد ابراہیم چشتی نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک موقع پر انہیں "حسان العجم" کا نام دیا تھا۔[۳۴]

قاضی فضل حق مرحوم نے اپنے ایک مقالے بعنوان "پنجاب میں اردو" میں میر نتھو شاہ کی ایک اردو غزل نقل کی ہے۔ ان کے کلام کی پختگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اپنے دور کے اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہو گی۔ غزل درجِ ذیل ہے:

نہ پوچھ خونیں دلوں سے قصہ خموش ہو رہ ہلا نہ ہرگز

برنگِ غنچہ لہو بھرے ہیں ہمارے لب کوں کھلا نہ ہرگز

بھری ہیں خونِ جگر سے آنکھاں نہ چھیڑ مجھ کو قسم ہے تجھ کو
کہ ہیں لبالب یہ دونوں شیشے چھلک پڑیں گے ڈھلانہ ہرگز
سوا ہمارے اس ایک دل کے وہ کون غنچہ ہے جس کے اوپر
صبا لگادے بہت سے زور سے پھر ایک دم بھی کھلا نہ ہرگز
سرشکِ عشاق کے تُو ظالم کرے ہے پامال ڈر خدا سے
جنھوں کو آنکھوں میں ہم نے پالا انہوں زمیں پر رُلا نہ ہرگز
رقیبِ سرکش بخواب سے ہوگیا ہے تو کیا ہوا ہے (آخر)
نہ چھیڑ اس کو وہ مردہ دل ہے مرا بھلا ہے جلانہ ہرگز [۲۵]

۳۔ فقیر سید نورالدین منوّر

منور لاہور کے بااثر اور ممتاز "فقیر خاندان" کے رکن تھے۔ وہ فقیر غلام محی الدین نوشہ ثانی کے بیٹے اور عہد خالصہ کے نامور وزراء فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید امام الدین کے بھائی تھے۔ منور ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام کو ڈاکٹر محمد لطیف نے مرتب کر کے "دیوانِ منوّر" کے نام سے پبلیکیشنز لاہور کے اہتمام سے شائع کر دیا ہے اردو کلام غیر مطبوعہ ہے۔ دیوان کے مرتب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"منور، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر حضوری، گورنر لاہور موتی مندر خزانوں کے کلید بردار، راجکماروں کے اتالیق، محلات کے محافظ اور مہاراجہ کے معالج تھے"۔[۲۶]

فقیر سید نورالدین منور ۲۷۔ مارچ ۱۸۵۲ء کو ہفتہ کے دن مطابق ۵۔ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ فوت ہوئے۔

مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے مندرجہ ذیل تاریخ وفات بطور تخرجہ کہی:

آہ شمع منور مسلماں | گشت بے نور واز رضاعت رفت
وائے موئے بکند مواز سر | حکمت عیسوی بغارت رفت
خم گردن طریق دست بسر | سربسر ایں ہمہ افادت رفت
کسوت رنگ خاک درویشاں | نیلگوں چرخ راز عادت رفت
یعنی حضرت خلیفہ نورالدین | بسواد شب از وجاہت رفت
پنجم از ماہ جمادی الثانی | روز شنبہ برو قیامت رفت
شیعہ و ہندو و مسلماں نیز | ہر یکش از پے عیادت رفت
نعت و توحید و منقبت می گفت | ہر دمش در رہِ عبارت رفت
عقدہ وصف را ز ناخن فکر | نکشاید کہ خوش عبارت رفت
طبع درّاک و شعر پاکیزہ | لطف دہم خلق وہم امارت رفت
ہاتفم گفت سال و آہ کشید | از جہاں موجدِ سیادت رفت[۳۷]

۱۲۶۸ھ

اسی طرح اپنے عہد کے فاضل اجل خلیفہ غلام رسول نے بھی منور کی تاریخ وفات لکھی جو درج ذیل ہے۔ خلیفہ غلام رسول شاعری میں غلامؔ تخلص کرتے تھے:

دریغ وحسرت و دیلا فقیر نورالدین | سفر ز عالم فانی بدار باقی ساخت
ز درس او دوسہ فاضل برآمدی ہر سال | بجود حاصل خود در رضای مولا باخت
بشام شنبہ و پنجم جمادی الثانی | ازیں سرای فناسوئے دارِ عقبیٰ تاخت
سنی وخلق وزحم قبول وہم اقبال | بہ بیخودی کلہ خویش بر زمیں انداخت
زحالِ ایں ہمہ تاریخ فوت شد معلوم | غلامؔ بالُنت ایدم بادعیہ پرداخت

سینِ سخا و خاء خلق و تاء ترحم و قافِ قبول والفِ اقبال انداختیم، باقی ۱۲۶۸ھ[۳۸]

مولانا محمد حسین آزاد نے منور کو لبیق[۳۹] اور صاحبِ علم لکھا ہے۔

فقیر خاندان نے "دربارِ عالی" کے نام سے جو دینی مدرسہ لاہور میں قائم کیا تھا، منور اس کے بھی سرپرست تھے۔ مولوی غلام رسول نے اپنے قطعۂ تاریخ میں اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس درس گاہ سے ہر سال دو تین علماء فارغ التحصیل ہوتے تھے جیسا کہ پہلے لکھا گیا۔ مولوی صاحب موصوف خود بھی کچھ عرصہ اس درس گاہ کے اساتذہ میں شامل رہے ہیں۔

مولوی یکدل کی اطلاع کے مطابق نورالدین منور صرف حمد، نعت، منقبت اور مدح کہتے تھے۔ ان کے فارسی اور اردو کلام میں بہت کم اشعار ان موضوعات سے ہٹ کر ملتے ہیں۔ مدح میں زیادہ غزلیں آلِ اطہار اور آئمہ کبار کی شان میں ہیں جس سے بعض لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ شاید منور شیعہ عقیدے کے حامل تھے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ان کے دیوان میں حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں بھی کئی غزلیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پہ ایک اردو غزل کا مطلع ہے:

مرے نہ عیب چتار د شہنشہِ جیلی

مرے عدو کو بچھاڑ دے شہنشہِ جیلی [۴۰]

مدح و منقبت کی طرف منور کے بیشتر رجحان کا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ عرصہ دراز تک کسی ایسی بیماری میں مبتلا رہے جس سے انہیں جانبر ہونے کی امید نہ تھی۔

ان کے بھائی فقیر عزیزالدین کے روزناچوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اور منور کی صحت کے لیے دعا کی گئی ہے۔ خود منور کے کلام میں ایسے مضامین جا بجا موجود ہیں:

یاالٰہی! بہ نبی صحتِ تن می طلبم

بہ علی عافیتِ مرد علن می طلبم [۴۱]

ان کا فارسی اور اردو غزلیات پر مشتمل دیوان خاصا ضخیم ہے جس میں ہر چند فارسی غزلیات کی تعداد زیادہ ہے لیکن اردو کلام بھی خاصی مقدار میں ہے۔ ذیل میں ان کے اردو کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

قرصِ نان و مہ و خور کر کے گدائی تیری
تسپہ بھی چرخ نے کی زلّہ ربائی تیری
جب وہ عاشق ہے ترا جس پہ خدا ہے عاشق
وہ ترا شان ہے اور واہ بڑائی تیری
بلکہ وہ آپ ہو یا شیفتۂ حُسن رخت!
جس نے ہاتھ اپنے سیں تصویر بنائی تیری
ہو گئے پادشہا سبعہ و سیارہ خجل
دیکھ یہ نور ترا اور صفائی تیری
مطربِ چرخ نے تب نوبتِ ماہ و خورشید
رین دن چرخ زماں کیا ہے بجائی تیری
جن و انسان و ملک حور سب اس شادی پر
تیرے نقاش کو دیتے ہیں بدھائی تیری
شب کے پردے میں چھپاتا ہے رُخ اپنا خورشید
جبکہ سنتا ہے شہا چہرہ کشائی تیری
یا حسین ابنِ علی کثرتِ افکار سیں اب
ہو کے لاچار میں دیتا ہوں دہائی تیری
مردم چشم میں جیسا کہ سمایا ہے جہاں
اس طرح ہوئے مرے دل میں سمائی تیری
سرورا! بادشہا! بحرِ کفا! دادورا!!
حق نہ دکھلاوے کبھو مجھ کو جدائی تیری

ہے نری شان کہ گلزار بجائے خس وخار
کھل رہے ہیں چمنِ دل موں کھلائی تیری

عرضِ شکریۂ مداح ہے اب بادشہا!
کہ مراد اپنی ہیں پائی ہے دلائی تیری

خاکِ پاک، درِ زہرا کروں اب سرمۂ چشم
بخت گر ہووے مجھے راہ نمائی تیری

کب لیاقت ہے مجھے عرض کی در حضرتِ قدس
ہاں مگر کہتا ہوں یہ بات کہائی تیری

کہ بقولِ امّ شہ آگے منور کا سلام
اے صبا کیجو عرض گر ہو رسائی تیری [۴۲]

۴۔ راجہ دینا ناتھ سوز

راجہ دینا ناتھ کے والد کا نام بخت مل اور دادا کا نام مدن تھا، ماں کا نام کاموں۔ بتایا گیا ہے[۴۳] ان کا خاندان کشمیر سے تعلق رکھتا تھا۔ مولوی یکدل لکھتے ہیں کہ راجہ دینا ناتھ پہلے محض پنڈت دینا ناتھ تھا۔ اس کے بعد وہ دیوان گنگا رام کے دفتر میں ملازم ہو کر لالہ دینا ناتھ دفتری بن گیا۔ پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملازمت میں آ کر ناتھ جی کہلانے لگا۔ سمت ۱۸۹۴/۱۸۳۷ء میں جب مہاراجہ نے اسے دیوان کا خطاب دیا تو یکدل نے مادۂ تاریخ یوں موزوں کیا:

از طفیلِ دودمانِ رازداں ناتھ جی دیوان سرکاری شدند [۴۴]

۱۸۹۴ سمت

۳ پگھر سمت ۱۹۰۴ مطابق ۱۷۔ ذوالحجہ ۱۲۶۳ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۸۴۷ء کو انگریزوں نے اسے راجہ کا خطاب دیا اور دلیپ سنگھ کی سرپرست کونسل کا ممبر بنایا۔ یکدل نے راجگی

کے خطاب کی تاریخ یوں کہی:

با مدد ہاے فراواں از جناب رازداں
راجہ دینا ناتھ آمد بس امیرِ رازداں[۴۵]

۱۹۰۴ سمت

"امیرِ رازداں" سے اشارہ انگریزوں کی مشاورتی کونسل کی طرف ہے۔ راجہ دینا ناتھ مولوی یکدل کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کدار ناتھ، یکدل کے والد مولوی غلام حسین چشتی کے شاگرد اور ان کے بیٹے امرناتھ، مولوی یکدل کے شاگرد تھے۔ راجہ دینا ناتھ فارسی اور اردو کا اچھا شاعر تھا اور مولوی یکدل سے مشورہ لیتا تھا۔ سوزؔ تخلص تھا۔ مولوی یکدل نے اس کے موزوں کیے ہوئے فارسی مادہ ہاے تاریخ اپنی بیاضوں میں درج کیے ہیں۔ ایک تاریخی قطعے کے بارے میں لکھا ہے کہ سوزؔ نے اسے اشاعت کے لیے لالہ ہرسکھ راے کے اخبار "کوہِ نور" میں بھیجا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوزؔ کا کلام معصر اخبارات میں شائع ہوتا تھا اور شوق سے پڑھا جاتا تھا۔[۴۶] سوزؔ کے اردو کلام کے نمونے میں اس کی کہی ہوئی ایک تاریخ پیش کی جاتی ہے۔ اسے بھی مولوی یکدل نے اپنی ایک یادداشت میں درج کیا ہے:

جہاں کو کیوں نہ کرے نورِ عدل سے تسخیر
کہ آسمانِ جلالت کا ہے تو مہرِ منیر
بوقت پوچھنے تاریخ کے یہ بولا سروش
بنا ہے رنگِ عجائب بہ فضلِ ربِ قدیر[۴۷]

۱۸۵۷ء

آخری مصرعے سے ۱۸۵۷ء کا سال برآمد ہوتا ہے۔ کافی جستجو کے بعد بھی حتمی طور پر واضح نہ ہو سکا کہ یہ مادۂ تاریخ کس واقعے سے متعلق ہے۔

سوزؔ کی شاعری کا ذکر بعض معاصر اور غیر معاصر تذکرہ نویسوں نے بھی کیا ہے جس سے ثابت

ہوتا ہے کہ ان کا کلام شائقین سے اعتراف کی سند حاصل کر چکا تھا۔ سر لیپل گرفن نے سوز کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے جہاں خود غرض اور موقع پرست لکھا ہے وہاں انگریز دشمن بھی قرار دیا ہے۔ گویا یہ "قدر" بھی مولوی بیکدل اور سوز کے درمیان مشترک اور دونوں میں دوستی کی بنیاد نظر آتی ہے۔[۴۸]

۵۔ دیوان امرناتھ اکبری

راجہ دینا ناتھ سوز کا بیٹا اور عہدِ خالصہ کا نامور تاریخ نویس تھا۔ اس کے حالات شاگردانِ بیکدل کے تحت درج کیے جائیں گے اور وہیں اس کی اردو شاعری پر بحث ہوگی۔

۶۔ پیر مراد شاہ، مراد لاہوری : متوفی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء

مولوی غلام حسین جشتی کے معاصر تھے۔ والد کا نام پیر کرم شاہ عرف میتا شاہ تھا۔ ان کے دادا کا نام شیخ ابوالفتح شاہ جی لکھا گیا ہے۔ پیر مراد شاہ پانچ بھائی بہن تھے جن میں مراد شاہ سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹے بھائی پیر قلندر شاہ، ان سے چھوٹے پیر سکندر شاہ اور سب سے چھوٹے بھائی پیر فرح بخش تھے۔ پانچویں بہن تھیں جن کا نام مبارک سلطان تھا اور وہ پیر محبوب شاہ ساکن قریب بٹیانوالہ کی زوجہ تھیں۔ پیر مراد شاہ اور ان کے تینوں بھائی فارسی اور اردو زبان کے صاحبِ طرز شاعر اور ادیب تھے اور ان سب کی تصانیف موجود ہیں۔

پیر مراد شاہ کے بارے میں ان کے بھائی پیر فرح بخش اپنی تصنیف "اذکارِ قلندری" میں لکھتے ہیں کہ :

"اس کاملِ شریعت و طریقت و مکمل الحقیقت و المعرفت یعنی غلام رکن الدین المشہور بشاہ مراد بخش علیہ الرحمۃ نے بیعت علمی کا دستِ ارادت اپنے جدِ امجد خلاصۃ اولیا، حضرت شاہ خدا بخش کے ہاتھ میں دے کر اور تبرک

خرقۂ آبائی اپنے والد شریف شیخ الوقت حضرت کرم شاہ عرف مینا شاہ سے پہنا۔"[۴۹]

پیر مراد شاہ اردو زبان کے اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی اردو مثنویاں "نامۂ مراد" اور "مراد المحبتین" چھپ چکی ہیں۔ نامۂ مراد پیر غلام دستگیر نامی کے تعارف اور مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی تھی اور مراد المحبتین کو نامی صاحب سے حاصل کر کے پہلی مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر (سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) نے رسالہ اردو، دہلی کے اکتوبر ۱۹۴۲ء کے شمارے میں شائع کیا تھا۔ پیر مراد شاہ کا تخلص مرآد تھا۔ دیوانِ مراد، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ اور تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ مراد شاہ، ۵ محرم الحرام ۱۲۱۵ھ مطابق مئی ۱۸۰۰ء میں فوت ہوئے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے گنج خوبی میں مندرجہ ذیل مادۂ تاریخ درج کیا ہے:

چوں مراد از دارِ دنیا رخت بست — رفت در گلزارِ جنت با مراد
سالِ وصلش گو سخیِ مقتدر — ہم بخواں شاہِ کرامت با مراد

۱۲۱۵ھ — ۱۲۱۵ھ

حافظ محمود شیرانی نے پنجاب اردو میں الگ عنوان کے تحت مراد شاہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔[۵۰] لاہور میں مراد شاہ کی رہائش محلہ کھاری کھوئی، گذر چوک مانک، بازار حکیماں اندرون بھاٹی دروازہ میں تھی۔ گذر چوک مانک کا علاقہ سید مٹھا بازار سے ٹکسالی دروازہ کی فصیل اور شاہ برج تک تھا اسی رہائش گاہ میں انھوں نے حکیم علیم اللہ ارشاد بن محمد حیات کی فرمائش پر چہار درویش کا قصہ مراد المحبتین کے نام سے اردو زبان میں نظم کیا۔ مراد شاہ کی ایک اور قابلِ ذکر نظم "مگس نامہ" بھی ہے جسے پیر غلام دستگیر نامی نے شائع کر دیا ہے۔ اس اردو نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراد اپنے دور کی معاشرتی اور سیاسی صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھے اور اس پر تنقید کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔

نامۂ مراد میں "اردو" کا لفظ زبان کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ گویا نوطرز مرصع کے مصنف تحسین نے نثر میں اور مراد شاہ نے نظم میں یہ لفظ زبان کے معنی میں زمانۂ قدیم میں استعمال کیا تھا۔

یہ بات اردو کی لسانی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے — کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے میں ہندی زباں میں — کروں، شہرت ہوتا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں — سمندِ طبع کو کرتے ہیں جولاں
اسی کا شہرہ اب ہو جائے سب تک — یہاں سے تا بہ ایراں بل عرب تک
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں — کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
خصوصاً شعراب شاعر یہاں کے — نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
غرض ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے — کہ شعرِ فرس مطعونِ زماں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمونِ پُر کی — نہ کوئی فارسی پوچھے نہ تُرکی
نہیں ہندی سخن میں نقص ممکن — لطافت ہے بہت سی اس میں لیکن
یہ شاعر ہند کے یوں فی الحقیقت — گئے لے فرس کے مضموں پہ سبقت
نچوڑا فارسی کی استخواں کو — کیا پُرمغز تب ہندی زباں کو

فصاحت فارسی سے جب نکالی
لطافت شعر میں ہندی کے ڈالی[۱۵]

۷۔ پیر سکندر شاہ امداد لاہوری

امداد سے بڑے بھائی پیر قلندر شاہ قلندر فارسی زبان کے شاعر تھے لیکن مراد شاہ کے بعد اردو زبان میں جنہوں نے قابلِ توجہ شاعری کی وہ پیر سکندر شاہ امداد تھے۔ ۱۷۹۰ء کے قریب پیدا ہوئے اور بیس سال کی مختصر عمر پا کر ۱۷۹۹ء میں فوت ہو گئے۔ مزار خانقاہ عبدالجلیل واقع لاہور میں ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے گنج تاریخ میں مندرجہ ذیل مادہ تاریخ درج کیا ہے:

چوں سکندر بادشاہِ دوجہاں — یافت از حق جنت الفردوس مفت

عقل سالِ ارتحالِ آں جناب　　عارفِ اکبر سکندر شاہ گفت [۱۲۰۵ھ]

حافظ محمود شیرانی نے امداد کا نمونۂ کلام پنجاب میں اردو میں درج کیا ہے جو درج ذیل ہے:

بادہ و جام و ساقی و گل و مل　　ہے، نہیں ہائے اک وہ غیرتِ گل

سب میں احوال اس کا کہہ نہ سکا　　شیشہ ہر چند کہہ رہا قل قل

زلفِ مشکیں کو دیکھ کر اس کی　　کٹ گیا آج طرۂ سنبل

جس گل اندام کے لیے میں نے　　کھائے اپنے بدن پہ لاکھوں گُل

سو اشارے میں اس کے خوں میرا　　لے گیا اس کا زنگیِ کاکل

فیضِ شاہِ مراد سے امدادؔ　　ہم نے باندھے ہیں ریختوں کے پُل [۵۳]

مراد شاہ مراد لاہوری، امداد کے برادرِ بزرگ نے اپنی تصنیف مراد المحبّین میں ان کے صاحبِ علم و فضل اور اہلِ کمال ہونے کا ذکر کیا ہے:

جو پیروں نے برسوں میں حاصل کیا　　خدا نے سو تھا اس جواں کو دیا

کسے یاد ہے جو اسے یاد تھا　　ہر اک فن میں گویا وہ استاد تھا

فقیری میں رکھتا تھا کسبِ کمال　　جہاں کو سمجھتا تھا خواب و خیال

تجرّد کے عالم میں اک فرد تھا　　جواں مرد تھا، صاحبِ درد تھا

بمصر دلم ہمچو یوسف عزیز　　سکندر خصائل، ارسطو تمیز

برادر نہ تھا آہ! فرزند تھا　　کہ آرامِ جاں اور دلبند تھا [۵۴]

پیر مراد شاہ مراد کے خاندانِ فقیراں لاہور سے بہت گہرے مراسم تھے۔ انہوں نے اپنے منظوم فارسی خطوط میں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے بھائیوں کو تحریر کیے، فقیر سید غلام محی الدین نوشاہ ثانی اور ان کے بیٹوں فقیر سید عزیز الدین، فقیر سید نور الدین حضور اور فقیر سید امام الدین کا ذکر بے حد محبت اور خلوص سے کیا ہے۔ مراد شاہ نے ۱۲۱۰ھ میں اپنے بھائیوں قلندر شاہ اور سکندر شاہ کو، جو اس زمانے میں رو پوچک میں مقیم تھے، لاہور سے ایک خط لکھا جس میں مندرجہ ذیل الفاظ میں فقیر صاحبان کے سلام ان تک پہنچائے:

افتخارِ دوستانِ بے ریا — آں غلامِ شاہ محی الدین ما
عارفِ باللہ حکیمِ حاذقے — دوستے در دوستیہا صادقے
ہمسرش نبود کسی در ہمسراں — مثل و ثانی سنت اورا در جہاں
ہم امام الدین و نورالدین دگر — نیز صدر الدینؔ فرخندہ سیر[۵۵]
بندگیہا می رسانند از نیاز — یا الٰہی عمر شان آباد باد

مراد شاہ اور قلندر شاہ دونوں بھائی فقیر عزیز الدین کو اپنے خطوں میں عزیزِ جاں و جاں ہر عزیز لکھا کرتے تھے:

مراد شاہ: اے عزیز جان، اے جانِ عزیز — اے سرا پا عقل و اے وافر تمیز
قلندر شاہ: اے عزیزِ جان، اے جانِ عزیز — دست در دامانِ پاکت چون طریز[۵۶]

چشتی خاندان اور فقیر خاندان کے گہرے دوستانہ روابط کے پیشِ نظر یہ بات قابلِ یقین ہے کہ پیر خاندان، خصوصاً مراد شاہ، سکندر شاہ، قلندر شاہ اور فرخ بخش جیسے صاحبِ علم حضرات سے مولوی احمد بخش یکدل یا ان کے صاحبزادے مولوی نور احمد چشتی کے مراسم نہ ہوں۔

۸۔ مفتی غلام سرور لاہوری، سرورؔ

مفتی غلام سرور ۱۸۳۸ء میں محلہ کوٹلی مفتیاں نزد حویلی میاں خاں اندرون موچی دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مفتی غلام محمد تھا۔ آپ خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے فاضل باپ سے اور بعد میں عربی و فارسی نیز علومِ دینیہ کی تعلیم اپنے عہد کے فاضلِ اجل مولوی غلام اللہ لاہوری سے حاصل کی تھی۔ مفتی صاحب اردو نظم و نثر میں صاحبِ اسلوب تھے۔ فارسی اور اردو تصانیف کی تعداد اکیس کے لگ بھگ ہے۔ مفتی صاحب نے خود علمی کام کرنے کے ساتھ ساتھ محققین اور اہلِ علم کو تصنیف و تالیف میں مدد دی۔ ۱۸۸۲ء کے قریب وہ کنہیا لال ہندی کے منشی تھے اور ان کی کتبِ تاریخ کی ترتیب میں معاونت کرتے تھے۔ کنہیا لال کے بعض

علمی کاموں پر مفتی صاحب کی محنت کی اس قدر گہری چھاپ ہے کہ وہ خود مفتی صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کنہیا لال کی تاریخ پنجاب اور مفتی غلام سرور لاہوری کی تاریخ مخزنِ پنجاب کو اگر ایک ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مخزن پنجاب کی صفحے کے صفحے کی عبارتیں اور مطالب جوں کے توں کنہیا لال کی تاریخ پنجاب میں آ گئے ہیں، حتیٰ کہ الفاظ تبدیل کرنے کا تکلف بھی نہیں کیا گیا۔ مفتی صاحب تاریخ نویسی میں کنہیا لال پر اوّلیت اور فوقیت رکھتے ہیں اس لیے یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ سرقت کے اس عمل میں مفتی صاحب ملوث ہوئے ہوں گے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ایک ہی نوالہ ہے جو دو منہ میں چلا گیا ہے۔ کنہیا لال نے مفتی غلام سرور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ شخص اردو، فارسی نظم قابلِ تحسین لکھتا ہے۔ . . . . . یہ شخص فی زمانہ ایک نامور عالم، فاضل، شاعر، مصنف ہے۔ . . . . جس نے تمام عمر شاعری اور تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ سترہ کتابیں نظم و نثر اردو فارسی لکھیں۔ تمام زمانے میں نام پایا۔ اس نے خاص لاہور کے محلہ موروثی میں سکونت اختیار کی اور عالی شان حویلی بنوائی اور یہیں چند مکانات خریدے۔ اب مؤلف کتاب کے دفتر میں منشی کے عہدے پر ممتاز ہے۔"[۵۷]

کسری منہاس لکھتے ہیں:

"آخری عمر میں مفتی صاحب مرحوم حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۴۔ اگست ۱۸۹۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی تاریخ وفات ان کا اپنا کہا ہوا مصرعہ ہے:

ابھی سرور نے کی ہے سرورِ عالم کی پابوسی "[۵۸]

مفتی غلام سرور کی فارسی تصانیف میں ان کے تذکرے "خزینۃ الاصفیا" کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس تذکرے کو پاک و ہند میں صوفیا اور اہل اللہ کے حالاتِ زندگی پر ایک اہم دستاویز

کی حیثیت حاصل ہے۔ بے شمار محققین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے اور اس کی علمی قدر و قیمت کے معترف ہیں۔ ایران کے مشہور محقق سعید نفیسی بھی مفتی صاحب کے کام کے بے حد مداح تھے۔ انہوں نے اپنی کئی تصانیف میں اس تذکرے سے استفادے کا ذکر کیا ہے۔ خزینۃ الاصفیا کے ایک حصے کا اردو ترجمہ چند سال پہلے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ مکمل ترجمہ ابھی سامنے نہیں آیا۔

اس کے علاوہ ان کی کتاب "گنجِ خوبی" بھی فارسی زبان میں ہے۔ اس میں مشاہیر کی وفات اور پیدائش کے تاریخی مادے فارسی میں نظم کر کے جمع کیے گئے ہیں۔ مفتی صاحب کو تاریخ گوئی کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے اور اپنے دوستوں کی کتابوں میں مندرج لاتعداد شخصیات کے مادہ ہائے تاریخ نظم کیے ہیں۔ خزینۃ الاصفیا کے تمام تراجم میں تاریخی مادے انہی کے موزوں کیے ہوئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ گوئی مفتی صاحب کی شخصیت کا حصہ تھی۔

اردو تصانیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ نظم

۲۔ نثر

نثر میں ان کی تصانیف حدیقۃ الاولیا اور مدینۃ الاولیا، قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں سے زیادہ اہم کام تاریخ مخزنِ پنجاب کا ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہر چند کہ انگریزی دور میں بامیدِ صلہ لکھی گئی تاہم سکھ دور کا زوال اور انگریزوں کا عروج چونکہ مفتی صاحب کے چشم دید واقعات ہیں لہٰذا ان کے بیان کی صداقت کو جھٹلانا ممکن نہیں۔ رہی بات جنگِ آزادی کو مفسدہ کہنے کی تو یہ وقت کا تقاضا تھا۔ ایک سفید پوش اور وضعدار آدمی کے اندر اس زمانے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی اور اپنے اہلِ خاندان کی عزت و ناموس کو حق گوئی کے داؤ پر لگا دے۔ اس کام کے لیے قدرت کی طرف سے اور لوگ چنے جاتے ہیں جو شہامت کے ساتھ مالی آسودگی اور معاشی فارغ البالی کی نعمت سے بھی مالا مال ہوں۔[۵۱]

مفتی صاحب کی شعری تصانیف کی تعداد بھی کم نہیں۔ دیوانِ نعت سروری، گلزارِ شاہی ما

مناقبِ غوثیہ انہوں شاعری کی کتابیں ہیں۔ مفتی صاحب قادر الکلام شاعر تھے۔

مفتی غلام سرور لاہوری کے چشتی خاندان کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ گنج خوبی میں قریباً چشتی خاندان کے تمام اکابر کی تاریخیں درج ہیں۔ مفتی صاحب مولوی نور احمد چشتی کی مشہور تالیف "تحقیقاتِ چشتی" کی ترتیب و تدوین کے مراحل میں ان سے معاونت کرتے رہے۔ ذیل میں مفتی صاحب کی ایک اردو نظم درج کی جاتی ہے۔ یہ نظم "تحقیقاتِ چشتی" کی تاریخ اختتام کے طور پر لکھی گئی ہے۔

تاریخِ اختتام از مفتی غلام سرور

عجب چھپ کر یہ تحقیقاتِ چشتی — بنا بے مثل نسخہ دلربا ہے
کہیں ذکرِ شہاں با طرزِ رنگیں — کہیں تشریح حالِ اولیا ہے
مضامیں خوش، معانی اس کے دلچسپ — بیاں خوش ہے عبارت جانفزا ہے
کیا ہے جو بیاں سب مسلح کل ہے — لکھا ہے بے تعصب جو لکھا ہے
زبہرِ انکشافِ حالِ اسلاف — عجب آئینۂ عالم نما ہے
کہیں اشعار گوہر بار منظوم — کہیں نقشوں کا نقشہ جم رہا ہے
ہر اک لفظ و ہر اک معنی ہر اک حرف — غرض صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ ہے
لکھی سرور نے آخر اس کی تاریخ — کہ اچھا تحفۂ چشتی بنا ہے [۶۰]

۱۲۸۴ھ

ان شعراء کے علاوہ لاتعداد شعراء ایسے ہیں جن کا ذکر مولوی بیدل نے اپنی بیاضوں میں کیا ہے یا چشتی خاندان کی تالیفات پر ان کی کہی ہوئی منظوم تاریخیں درج ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو فارسی میں لکھنے والے ہیں اور بعض کے سوانحی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کی ایک مختصر فہرست درجِ ذیل ہے:

نواب غازی الدین نظام — مظہر حسن — نرائن داس مضطر
میاں طالب محمد — سید انور شاہ انور — محمد حسن شعری کشمیری — جان محمد لاہوری

انور حسین ہما　　شیو ناتھ پشمینہ　　سید بہادر شاہ بن سید چراغ شاہ سبزواری[۶۱ھ]

۱۸۵۷ء کے بعد لاہور میں چشتی خاندان کے ہمعصر نامور شعراء میں سے اکثر کے نام انجمن پنجاب سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ انجمن کے ابتدائی رسائل میں جن لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں ان میں مولوی محمد حسین آزاد ــــ منشی محمد علی ــــ منشی گوپال داس ــــ منشی جمنا پرشاد ــــ منشی ہر سکھ رائے ــــ فقیر سید جمال الدین ــــ ڈاکٹر ہادی حسین خاں اور منشی کرم الٰہی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لاہور ان دنوں اردو ادب کا عروس البلاد تھا۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری نے اسی مناسبت سے کہا تھا:

بناوٹ اس میں نہیں ہے کہ ان دنوں لاہور
بُرے بھلے کا ٹھکانہ ہے دوست دشمن کا

اس سلسلۂ ادب پروردہ ادیب اور شاعر جن کا تعلق شہرِ لاہور سے موروثی تھا، ان کی فہرست درجِ ذیل ہے:

منشی نظام الدین	شیو ناتھ منتظر
مفتی غلام سرور	سردار دھیان سنگھ
سید نصرت علی	مولوی کریم بخش
مادھو سروپ	نادر علی سیفی
منشی محمد اعظم	لالہ ہر سکھ رائے
سید رجب علی؛ وغیرہ	

ان کے علاوہ جن نامور ادیبوں اور شاعروں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی اور انجمن پنجاب کے روح و رواں تھے ان میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مرزا اشرف علی اشرف، اعجاز مرزا، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، میر ناظم حسین ناظم، امو جان ولی، فتح دین بسمل، منشی پیارے لال آشوب، مرزا ارشد گورگانوی (یا گورگانی) مولوی سیف الحق ادیب اور میر

نثار علی شہرت دنیائے ادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔

انجمن پنجاب کی ادبی خدمات پر موسیو گارساں دتاسی نے اپنے مشہور مقالات میں مفصل روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں ان ادیبوں اور شاعروں پر خاصا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ چشتی خاندان کے ادیبوں کی نظم و نثر اس نئے ادبی ماحول سے متاثر ہوئی اور انھوں نے اپنی تصانیف میں وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو مدِ نظر رکھا۔ چنانچہ ایک اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ اس خاندان کے ادیبوں کی توجہ شاعری کی نسبت اردو نثر کی طرف زیادہ ہو گئی۔ مولوی نور احمد نے انگریزی میں مہارت حاصل کر کے نثر کے نئے رجحانات کو اپنایا حتیٰ کہ ان کے والد مولوی احمد بخش یکدل نے جو اس دور کے بزرگ ترین شاعر اور مورخ تھے، فارسی نثر کے ساتھ ساتھ اردو نظم اور نثر کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس پر مفصل بحث اگلے باب میں آئے گی۔

حواشی ــــ باب دوم

۱۔ مفتی علی الدین بن مفتی خیرالدین : عبرت نامہ، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، لاہور ۱۹۶۱ء ص ۳۔
عبرت نامہ اور اس کے مصنف کا تفصیلی ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

۲۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی : بیاضِ یکدل نمبر ۱۳

۳۔ مولوی نور احمد چشتی نے لاہور کی معاشرتی زندگی پہ ایک کتاب "یادگارِ چشتی" کے نام سے جارج اوبارلس کی فرمائش پر ۱۸۵۶ء میں تصنیف کی۔

۴۔ سنیا رام کوہلی : مہاراجہ رنجیت سنگھ (دیباچہ) الہ آباد ۱۹۳۲ء ص ۵

۵۔ مفتی خیرالدین، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں، فقیر نورالدین کی وساطت سے تعلقہ ظفروال کے عامل تھے۔ راجہ گلاب سنگھ نے اس تعلقہ میں جاگیر انہی کے زمانے میں حاصل کی تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے : عبرت نامہ جلد ۲ ص ۷۸)

۶۔ مولوی احمد بخش یکدل : بیاض یکدل نمبر ۴۲۔ ف ۱۲۴

۷۔ بیاضِ یکدل : شمارہ ۱۶ ف ۱۲۴۔ نیز تاریخِ وفات از یکدل :

سروش غیب یکدل گفت ہے ہے [۳۰]
زد نیا حیف شد مفتی ابوبکر

+ ۱۲۳۵ = ۱۲۶۵ھ

۸۔ اردی بہشت یعنی ماہ جیٹھ (حاشیہ یکدل)

۹۔ مولوی یکدل : بیاض اشعار مرقومہ ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء ف ۷۸

۱۰۔ روزنامچہ مولوی حامد علی چشتی (غیر مطبوعہ) ص ۲۸۵

۱۱۔ ایضاً ص ۹۲

۱۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر محمد باقر؛ مقدمہ عبرت نامہ۔ لاہور ۱۹۶۱ء

۱۳۔ امرناتھ اکبری: دیوانِ اکبری؛ لاہور، مطبع کوہِ نور ۱۸۷۳ء ص ۱۲۸

۱۴۔ عتیق صدیقی: صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات۔ ص ۱۲۶

۱۵۔ کوہِ نور: ۲ جنوری ۱۸۵۰ء۔ ص ۷

۱۶۔ اس سے معلوم ہوتا ہے مولوی محمد علی کا پُر دل اپنانے سے پہلے تخلص، مولوی تھا۔

۱۷۔ ہفتہ وار کوہِ نور: ۲ جنوری ۱۸۵۰ء ص ۷

۱۸۔ عتیق صدیقی: صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۲۶

۱۹۔ عبدالسلام خورشید: صحافت پاک و ہند میں۔ لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۲۴

۲۰۔ بیاضِ بیدل نمبر ۱۶ ف ۷

۲۱۔ مولوی غلام حسن خورم: مضحکاتِ خورم، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری مخطوطہ نمبر ۲۰۰۶ ورق ۱۰۲۔ و

۲۲۔ قادر بخش صابر: تذکرہ گلستانِ سخن۔ لاہور، مجلس ترقی ادب ص ۴۶۸

۲۳۔ ستیارام کوہلی: مہاراجہ رنجیت سنگھ، الہ آباد۔ ۱۹۳۳ء ص ۳۲۷۔ کوہلی نے اطلاع دی ہے کہ "مہاراجہ شیر سنگھ کے انگریزی دستخط کئی سرکاری کاغذوں پر موجود ہیں جو گورنمنٹ پنجاب کے ریکارڈ آفس میں پڑے ہیں۔"

۲۴۔ ایضاً ص ۳۲۸

۲۷۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے حوالے سے شنکر کا گارساں دتاسی نے بھی ذکر کیا ہے اور اسے مہاراجہ کا اتالیق لکھا ہے۔ (گارساں دتاسی: مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم۔ ص ۲۱۴)۔

لالہ سری رام کے علاوہ جن تذکرہ نگاروں نے شنکر کا ترجمہ اپنے ہاں درج کیا ہے ان میں یادگارِ شعراء کے مؤلف کریم الدین اور سخنِ شعراء کے مؤلف عبدالغفور نساخ قابلِ ذکر ہیں۔

26. Nazir Ahmad Chaudhry: Development of Urdu as official language in the Punjab 1849-1974 Lahore, 1977, P. 8

۲۷۔ ایضاً ص ۲۴۳۔

۲۸ ۔ 〃 ص ۲۸

۲۹۔ سر جان لارنس کے حالاتِ زندگی اور سیاسی کارناموں کے لیے ملاحظہ فرمائیے:

Sir C. Aitchison: Lord Lawrence. Oxford 1914.

۳۰۔ مولوی غلام حسن خورم: مضحکاتِ خورم (قلمی) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۳۱۔ یکدل: بیاضِ یکدل شمارہ ۱۲

۳۲۔ مفتی علی الدین: عبرت نامہ، جلد اوّل ص ۹۸

۳۳۔ مراۃ الشفار کا ۲۰ محرم ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ قلمی نسخہ کتب خانہ گنج بخش اسلام آباد میں محفوظ ہے۔

اندراج نمبر ۲۵۷۔

۳۴۔ یکدل: تحفۂ یکدل (قلمی) مملوکہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ص ۵۹۔ "و میر نھتو شاہ بجدِ شریف راقم بملاقات آمدہ گفت کہ ایہا الشیخ تیمور شاہ بمرد۔ فرمودند کہ تاریخ باید گفت"۔ میر گفت — "تیمور شاہ بمرد ۱۲۰۷ھ"۔ فرمودند یا حسان العجم"۔

۳۵۔ قاضی فضلِ حق: پنجاب میں اردو، مندرج ضمیمہ نمبر ا۔ پنجاب میں اردو، مصنفہ حافظ محمود شیرانی، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، کتاب نما لاہور ۱۹۷۲ء ص ۴۹۷

۳۶۔ ڈاکٹر محمد لطیف: مقدمہ دیوانِ منور، لاہور، پنجز ص ۲۰

۳۷۔ مولوی یکدل: بیاضِ یکدل نمبر ۱۲۱

۳۸۔ ایضاً ف ۱۲۲

۳۹۔ مقالاتِ آزاد: مرتبہ آغا محمد باقر، لاہور ۱۹۶۶ء ص ۴۱۳

۴۰۔ فقیر سید نور الدین منور : دیوانِ منور (خطی) مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی۔ ف ۱۱۴

۴۱۔ ایضاً۔ ف ۱۱۲

۴۲۔ ایضاً : غزل شمارہ ۵۸۔ مکتوبہ ۷۔ ماہ ساون سمت ۱۹۰۴/ ۳۔ اگست ۱۸۴۷ء (حاشیہ مصنف)

۴۳۔ مولوی یکدل : بیاض یکدل نمبر ۱۲۔ ف ۱۸۰۔ خطی

۴۴۔ ایضاً : ف ۱۸۱

۴۵۔ ایضاً : ف ۱۷۴

۴۶۔ بیاضِ یکدل : شمارہ ۱۶۔ ف ۲۳۱

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ سر لیپل گرفن : رنجیت سنگھ ؛ ترجمہ مولوی نظیر حسین فاروقی۔ حیدر آباد (دکن)۔ دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی۔ ۱۹۲۲ء۔ ص ۹۰

۴۹۔ بحوالہ تاریخ جلیلہ از پیر غلام دستگیر نامی۔ ص ۲۲۹

۵۰۔ حافظ محمود شیرانی : پنجاب میں اردو ؛ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی لاہور ۱۹۷۲ء ص ۲۸۱

۵۱۔ غلام دستگیر نامی : تاریخ جلیلہ، طبع دوم لاہور ۱۹۶۰ء۔ ص ۲۴۱

۵۲۔ مفتی غلام سرور لاہوری : گنج خوبی۔ نولکشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۷ء۔ مفتی صاحب کے مصرع سے سالِ فوت ۱۲۱۴ھ برآمد ہوتا ہے جو غلط ہے۔ پیر غلام دستگیر نامی کی تحقیق کے مطابق امداد ۱۲۱۰ھ میں فوت ہوئے۔ (دیکھیے تاریخِ جلیلہ ص ۲۴۵)۔

۵۳۔ حافظ محمود شیرانی : پنجاب میں اردو ؛ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ لاہور ۱۹۷۲ء۔ ص ۲۳۲

۵۴۔ مراد لاہوری : مراد المحبتین ؛ مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر۔ رسالہ اردو، دہلی۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

۵۵۔ یہ نام یقیناً عزیز الدین ہے جو فقیر امام الدین اور فقیر نور الدین کے تیسرے بھائی تھے۔ پیر غلام دستگیر نامی کو مخطوطہ خوانی میں مغالطہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی تاریخِ جلیلہ میں ان اشعار کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے : "صدر الدین صاحب کون تھے، معلوم نہ ہو سکا۔" دوسرے یہ کہ

فقیر خاندان کی فہرست میں اس دور میں کہیں صدر الدین نام نہیں ملتا لہٰذا قرائن سے عزیز الدین ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہیے:

ہم عزیز الدین فرخندہ سیر

۵۶۔ پیر غلام دستگیر نامی: تاریخِ جلیلہ، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۲۴۹۔۲۵۰

۵۷۔ کنہیا لال:

۵۸۔ نقوش: لاہور نمبر، ص ۹۸۹

۵۹۔ اس سلسلے میں تنہا مفتی صاحب پر الزام نہیں، کنہیا لال ہندی سے لے کر سید محمد لطیف تک سبھی انگریزوں کی خوشنودی کے لیے جنگِ آزادی کو مفسدہ کہنے پر مجبور رہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دل سے اسے جنگِ آزادی ہی سمجھتے ہوں۔

۶۰۔ تحقیقاتِ چشتی: باہتمام احسان علی، لاہور۔ پنجابی ادبی اکیڈمی ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۳۲۸

۶۱۔ سید بہادر شاہ: مولوی نور احمد چشتی کے برادرِ نسبتی تھے۔ ان کی بہن سید بیگم مولوی نور احمد کی زوجہ تھیں۔

باب سوم

خاندانِ چشتی

لاہور کے خاندانِ چشتی کے نامور مصنف مولوی نور احمد چشتی نے اپنی تصنیف "تحقیقاتِ چشتی" میں اپنا آبائی شجرہ نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کے والد مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے اپنی نادر الوجود بیاضوں میں اپنے آبائی شجرے کی تکرار کی ہے۔ ان دو ذرائع کے علاوہ مولوی یکدل کے پڑپوتے مولوی عبدالرشید چشتی کی یاد میں چھپنے والی کتاب "حیاتِ رشید"[1] میں بھی اس خاندان کا آبائی شجرہ درج کیا گیا ہے جس کے سلسلے میں یقیناً مرحوم کے والد مولوی حامد علی چشتی سے استفادہ کیا گیا ہو گا۔ ان تینوں مآخذ کو ملا کر اس خاندان کے بارے میں جو تفصیل فراہم ہوتی ہے اس کے مطابق اس خاندان کے پہلے بزرگ مولوی محمد عاقل تھے جو ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ایران سے ہندوستان میں آئے اور بقول مولوی نور احمد "مدت مدید دکن میں بعہدہ ہائے جلیلہ سرفراز رہے"[2]۔ مولوی یکدل نے انہیں "مولوی محمد عاقل چشتی اورنگ آبادی" لکھا ہے جس سے دکن میں ان کا مستقر متعین ہو جاتا ہے۔ مولوی محمد عاقل کے دو بیٹے تھے، مولوی نظام الدین اور مولوی عنایت اللہ یہ دونوں صاحبزادے باپ کی وفات کے بعد دکن سے پنجاب میں آ گئے۔ مولوی نظام الدین نے روحانیت میں مقام پیدا کیا اور لاہور میں پیر دھکا کے نام سے مشہور ہوئے۔ تحقیقاتِ چشتی میں ان کا ذکر موجود ہے:

"حال ان کا یہ ہے کہ نام ان کا مولوی نظام الدین سلسلہ ان کا چشتیہ۔ اگرچہ صدہا کرامات ان سے سرزد ہوئی ہیں مگر اکثر اوقات جو کوئی مُٹھکوں والا ان کے پاس جاتا تھا فی الفور شفا پاتا تھا۔"[۳۳]

ان کا مقبرہ گڑھی شاہو میں میاں میر روڈ (موجودہ اقبال روڈ) کے جنوب رویہ موجود ہے۔ تحقیقاتِ چشتی میں مقبرے کی تفصیل درج ہے۔ مولوی نظام الدین عرف پیر ٹھکا کی وفات دہم صفر ۱۱۱۷ھ میں ہوئی۔ مفتی غلام سرور لاہوری کا قطعہ تاریخ درجِ ذیل ہے[۳۴]:

پیر ٹھکا نظامِ ہر دو جہاں ... شیخِ عالم امامِ دینِ نبیؐ

بہر سالِ وفاتِ آنحضرت ... گفت سرور "نظامِ دینِ نبیؐ"

۱۱۱۷ھ

مولوی نظام الدین کی اولاد کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ دوسرے بھائی مولوی عنایت اللہ یتیمی کی حالت میں پاک پتن پہنچے اور انہیں حضرت فرید شکر گنجؒ کے خاندان میں اولاد کا سا رتبہ ملا۔ مولوی نور احمد چشتی نے لکھا ہے:

"بابا فرید گنج شکرؒ نے ان کو اپنا متبنّیٰ کیا۔"

لیکن اس بات کی تحقیق کسی دوسرے حوالے سے نہیں ہوتی۔ مولوی بیدل نے اپنے آبا و اجداد کی اجودھن یعنی پاک پتن سے نسبت تو ضرور ظاہر کی ہے لیکن متبنّیٰ یا نیابت کا کہیں ذکر نہیں کیا:

آجودھنم آمدہ ز اجداد

مولا منشا کہ باد آباد[۳۵]

مولوی عنایت اللہ کی اولاد میں دو لڑکے تھے۔ مولوی بہاء الحق اور مولوی ضیاء الحق۔ مولوی بہاء الحق کا شجرہ "تحقیقاتِ چشتی" میں موجود ہے (نقشہ منسلک ہے)۔ ایک لڑکی کا ذکر مولوی بیدل نے کیا ہے[۳۶]۔ یہ لڑکی مولوی لطف اللہ بن مولوی عبدالہادی کے نکاح میں تھی۔ مولوی لطف اللہ کے بیٹے حافظ امام بخش بہت اچھے خطاط تھے، بیدل کی والدہ نے بیٹے کے لیے سب سے پہلا قرآن مجید

انہی سے لیا تھا[۵۴]۔ مولوی حامد علی چشتی نے اپنے روزنامچے میں مولوی صاحب کی اولاد کی مزید نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مولوی بہاء الحق و مولوی ضیاء الحق ہر دو برادر حقیقی بودند۔ ما از اولاد مولوی ضیاء الحق و مولوی اسماعیل و مولوی عبدالقادر وکیل قصور از اولاد مولوی بہاء الحق"۔[۵۵]

مولوی ضیاء الحق ۱۵ محرم ۱۲۰۶ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۷۹۴ء کو فوت ہوئے۔ ان کا مزار حافظ پور شرقیہ کے قبرستان میں ہے۔ موصوف زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ علم و فضل کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ مولوی ضیاء الحق کی اولاد سے ایک صاحبزادے جن کا نام مولوی محمد ابراہیم چشتی تھا اور ایک صاحبزادی تھیں جن کی شادی مرزا ہدایت اللہ سے ہوئی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ آگرے چلی گئیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی کی شادی عابدہ بیگم سے کی گئی جو مرزا امان اللہ بیگ کی بیٹی تھیں۔ مولوی یکدل لکھتے ہیں:

"والدۂ پدر من عابدہ بیگم دختر مرزا امان اللہ بیگ نواسۂ محمد مرزا از نبائر سلطان مراد بخش"۔[۵۶]

مولوی محمد ابراہیم چشتی اپنے وقت کے کاملین میں سے تھے۔ ان کی علمی شخصیت آئندہ باب میں زیر بحث آئے گی۔ مولوی ابراہیم چشتی کے ہاں ایک فرزند مولوی غلام حسین چشتی اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں جن کا نام عابدہ بی بی تھا۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی کے زمانے میں لاہور سکھ گردی اور فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی اور اہل خانوادہ کی حفاظت کو مد نظر رکھتے ہوئے محلہ نوگھرا اندرون زکی دروازہ میں ایک مکان خریدا اور سکونت اختیار کر لی۔

مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے اس دور کی بدامنی، مردم آزاری اور کس مپرسی کا نقشہ بہت دردناک انداز میں کھینچا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"یاد دارم کہ چون کشتیٔ مغلیہ و سلطنت چغتائیہ غرق شد و برہم خورد، جد

شجرہ مولوی بہاءالحق

۷- حال مولوی بہاءالحق برادر مولوی ضیاءالحق صاحب

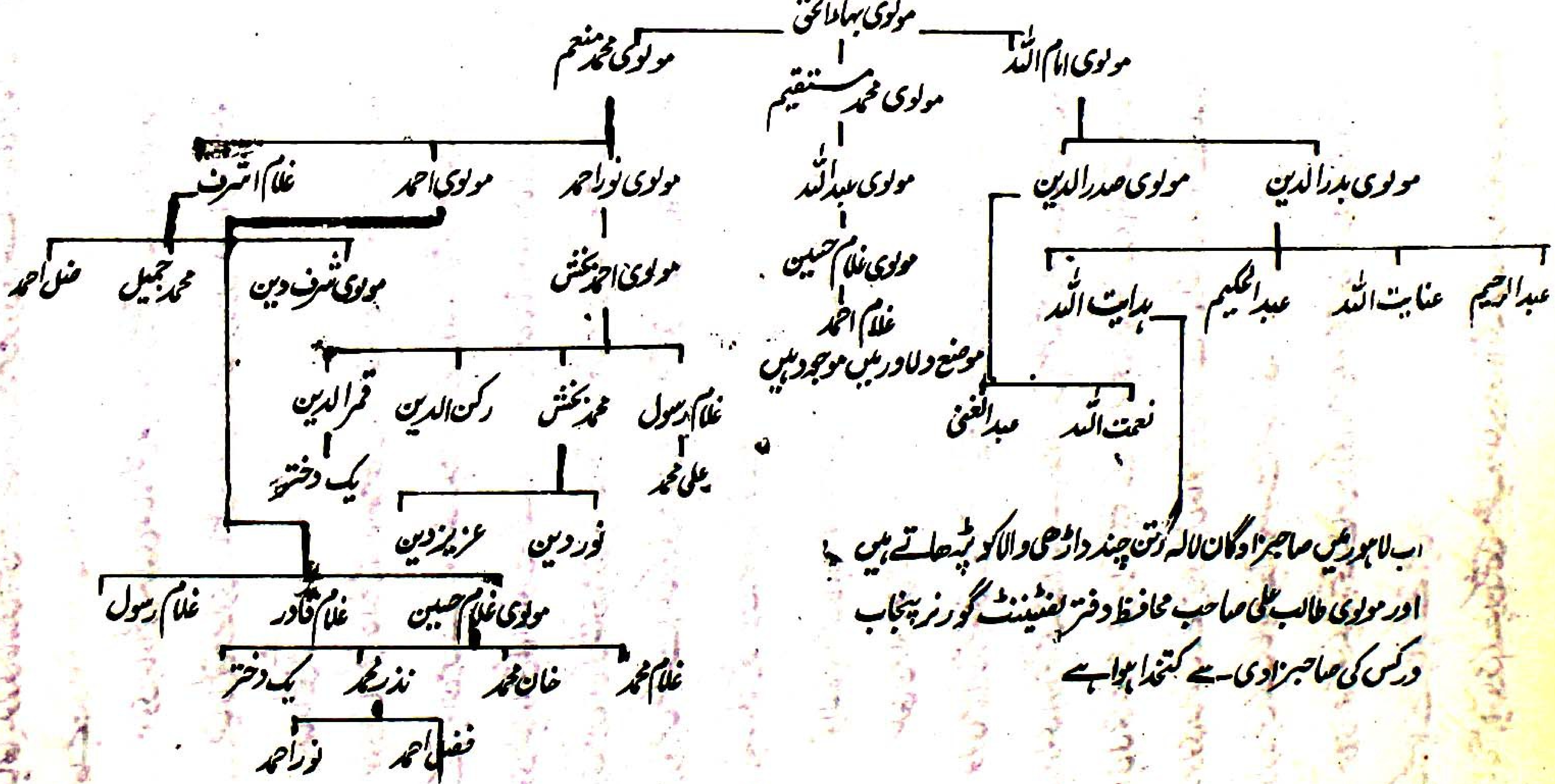

شریف بندۂ واجداد تمام شرفاء و سادات عظام و علمائے کرام وغیرہ ہر گروہ سفید پوشان قلم پرست چہ ہندو چہ مسلمان جامۂ سوگواری پوشیدند، از آنکہ مسلط شدند مولبیراں یعنی سکھاں دہقان مزاج نانو برہنہ . . . . وجھنگہ خورد بعدہ، مال مردم خوار دآتش زن ودزد، شدہ شدہ سلطنت شد۔

آن بزرگان بعضی روانہ شاہجہان آباد وحیدرآباد ولکھنؤ و مکہ و مدینہ و مصر و روم و شام و بعضی بخراسان و بہاولپور وحیدرآباد سندھ و آنانی کہ قوت نداشتند و شرفا بودند در ہمین لاہور بگوشہ نشستہ بعضی بافندگی و بعضی صلہ چینی و بعضی معماری و بعضی سید برادری و بعضی معلمی و بعضی ترہ فروشی و بعضی گدائی دیہات ۔ ہمین طور خلقی افتادہ ماندہ حیران پریشان، تا آنکہ در ہمان غم از جہان رفتند۔[۱۱۵]

مولوی محمد ابراہیم چشتی نے گذر اوقات کے لیے زکی دروازے کے اندر ایک مسجد میں امامت اختیار کی۔ وہیں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ مولوی صاحب کی صاحبزادی عابدہ بی بی کی شادی ایک شخص خدا بخش بن منور وکیل سے ہوئی۔ یہ شخص خلافِ توقع بے حد آوارہ اور بدکردار ثابت ہوا۔ مجبوراً اس سے طلاق حاصل کی گئی اور ان کا نکاحِ ثانی ایک ملّا زادے محمد حیات بن دسوندی سے کر دیا گیا۔ مولوی نور احمد کا کہنا ہے کہ ملّا زادے کی ذات غوری تھی اور اسے زیورِ علم و ادب سے آراستہ کر کے موضع خود پور (خورد پور) مانگا منڈی ضلع لاہور میں ایک مسجد کا امام مقرر کرا دیا۔ مولوی یکدل نے ان واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

'پدرم را خواہری بود عابدہ بی بی نام، در عقد محمد حیات بود۔ ازدی امام بخش الحال از امام بخش پسری آمد محمد بخش و محمد بخش را الحال سہ پسر می آمدند، چراغ دین و شہاب الدین و علم الدین و باز محمد بخش را دو خواہر بگیم و بھاگن دور نانوڈوگر و خیلپور ہر دو کد خدا اند۔ چون در قرب و جوار سہ مسجد را

امامت می کند و ہمیں محمد بخش مالک ہر سہ مسجد است، میاں عبداللہ مولوی بود
کہ نانائے محمد بخش بود، از وی کتب و زیور بسیار ماندہ۔ امام بخش بیچارہ
محتاج بود۔ امام بخش مرد بسیار غریب و نیک بخت و غسال بود۔ امام
بخش خورد ماندہ بود مادرش عابدہ بی بی دختر مولوی محمد ابراہیم چشتی
خواہر خورد حضرت مولوی غلام حسین چشتی بود و اول در عقد خدا بخش
بن منور وکیل دادہ بودند۔ و او شراب خور بود لہذا بزودی از وے
طلاق و ہا یندہ اورا بحیات نامی ملا عقد کردہ دادند و آن ام البلایا
زود انتقال کرد۔ سلہ

ام البلایا کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کے خیالات اپنی پھوپھی کے سسرالی خاندان کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔ عابدہ بی بی کی اولاد کا شجرہ یوں بتایا جاتا ہے:

مولوی محمد ابراہیم

مولوی غلام حسین چشتی | عابدہ بی بی

امام بخش

بیگم | محمد بخش | بھاگن

چراغدین | شہاب الدین | علم الدین

مولوی غلام حسین چشتی نے والد کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے مولوی عصام الدین آہن گر کی بیٹی کا رشتہ قبول کیا۔ مولوی صاحب کی بیوی جس کا نام عظمت النساء بیگم تھا حافظ قرآن اور بے حد پرہیزگار خاتون تھیں۔ انہی کے بطن سے مولوی غلام حسین چشتی کے نامور فرزند مولوی احمد بخش یکدل پیدا ہوئے۔ چنانچہ یکدل اپنی والدہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"درلاہور بتجویز جدی امجدی، شادی حضرت والدی قدس سرہٗ بدختر
عصام الدین مرحوم از قوم آہن گر شد۔ ووالدۂ من عظمت النساء بیگم مرحومہ
حافظہ وسعیدہ ومن از وی آمدم۔ خالہای قوم پیدا شدند۔ پس در این
قوم از بی استعدادی متوازی شدم واز گروہ ہدایت انکار نکردیم۔"[۱۴]

لاہور کے بھنگی سردار گوجر سنگھ نے مولوی محمد ابراہیم کی مددِ معاش کے لیے لوہاری اور زکی دروازے پر ان کا دو دو آنے یومیہ مقرر کر دیا تھا۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی کا انتقال ۱۲۰۲ھ میں ہوا۔ مولوی احمد بخش یکدل کو ابتدا میں مغالطہ ہو گیا تھا جس کی بنا پر انھوں نے ایک شعر میں یہ تاریخ ۱۲۲۰ھ بیان کر دی:

زِ ہجرت یک ہزار و دو صد و بیست
کہ جدِ امجدم را خلق بگریست

لیکن ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱-۱۸۶۲ء میں جب انھوں نے اپنے اور اپنے معاصرین کے کلام پر مشتمل بیاضِ اشعار مرتب کی تو اس غلطی کی تصحیح کر لی۔ چنانچہ اس بیت کو یوں بدل دیا گیا:

زِ ہجرت یک ہزار و دو صد دو
کہ جدِ من زِ دنیا تاختن زد[۱۵]

اسی طرح ان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جناب جدِ امجدم مولوی محمد ابراہیم چشتیؒ متصل دروازہ زکی در مسجد میر مداری بن میر ابوالحسن از قوم سادات زکی یعنی اولاد پیر سید زکی کہ قبالہ خرید زمین دیوار بدیوار مسجد میر مداری موجود است دفن شدند۔ وچون بقلم حافظ شب دو گھڑی باقی ماندہ بر پلنگ علیحدہ مضمون تاریخ جناب جدِ شریف از سرش درخواستیم وپنج بیت وہ مادۂ تاریخ عمدہ ودل پسند اولی الالباب عنایت شدہ:

چشتی بُد محمد ابراہیم — مولوی زمانہ صاحبِ ہوش
خلفۂ مولوی ضیاء الحق — در لہانور نورِ او در جوش
فخر دینش ز فخرِ دین حاصل — کسوتِ فقر داشت در بر و دوش
چون بدروازۂ ذکی مسجد — مدفنش شد ز خلق خواست خروش
سالِ آن عارفِ خدا آگاہ — رضی اللہ عنہ گفت سروش

۱۲۰۲ھ

مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقاتِ چشتی میں آپ کی تاریخ وفات پنجم ماہ صفر ۱۱۹۵ھ درج کی ہے اور اس سال سے متعلق مفتی غلام سرور لاہوری کا موزوں کیا ہوا قطعہ تاریخ بھی درج کیا ہے لیکن بیدل کی تحقیق قابلِ ترجیح ہے۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی کی ادبی خدمات پر اگلے باب میں بحث کی جائے گی۔

مولوی محمد ابراہیم چشتی کے صاحبزادے مولوی غلام حسین چشتی والد کی وفات کے بعد ان کے سجادۂ درس و تدریس پر متمکن ہوئے۔ آپ نے لوہاری دروازے سے اندر علومِ متداولہ کا مکتب جاری کیا۔ پہلے کچھ عرصہ چوبڑہ خاندان کے بچوں کو پڑھایا۔ پھر دیوان بھوانی داس کے خاندان کو تعلیم دیتے رہے۔ اس کے بعد فقیر سید عزیز الدین نے اپنے بیٹے فقیر سید چراغ الدین کو پڑھانے کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔ آپ کی اہلیہ عابدہ بی بی نے بھی ایک زنانہ مدرسہ جاری کیا جس میں وہ لڑکیوں اور عورتوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں۔ ان کا فیضِ عام بھی جاری تھا۔

مولوی غلام حسین چشتی کا پیدائشی نام غلام علی تھا۔ مولوی نور احمد چشتی نے تبدیلی نام کے بارے میں مفصل وجوہ بیان کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب مولوی غلام حسین چشتی دہلی میں حضرت فخر الدین فخرِ عالم چشتی کی خدمت میں بیعتِ طریقت کے لیے حاضر ہوئے تو انھوں نے آپ کا نام غلام علی سے بدل کر غلام حسین رکھ دیا۔ یہ واقعہ یقیناً ان کے والد مولوی محمد ابراہیم چشتی کی وفات سے یعنی ۱۱۹۵ھ سے قبل کا ہوگا کیونکہ مولوی محمد ابراہیم چشتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے نام ایک بے تاریخ خط راقم الحروف

کے پاس موجود ہے جس پہ لکھا ہے :

"برخوردار سعادت اطوار قرۃ العین غلام حسین از عمر و دولت بہرہ یاب بود ، سلامت باشد"[۲۲]

مولوی نور احمد چشتی نے مولوی غلام حسین چشتی کی شخصیت اور قیافے کی لفظی تصویر تحقیقاتِ چشتی میں کھینچی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"قد مبارک موزوں و میانہ اوسط بہ مضمون خیر الامور اوسطہا اور رنگ گندم گوں کشادہ پیشانی ، پیوستہ ابرو ، فراخ چشم ، باحیا ، بہ سبب عادتِ کثرتِ مراقبہ آپ ہمیشہ سرنگوں رہا کرتے تھے۔ سفید ریش اور سفید موئے سر اور سر مبارک بموجب سنتِ نبویہ محلوق ، خوش پوشاک۔ اکثر سر پر دستار سبز رکھا کرتے تھے اور ہاتھ میں چھڑی رنگین ، پاپوش بانانی اکثر بزرگ بسنتی۔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں فنافی الحسین تھے اور مزاج عنایت امتزاج حضرت کا اس قدر خلیق تھا کہ ہر ایک آدمی جو جلیس وانیس حضرت کا تھا ، اپنی نسبت یہی کہتا تھا کہ مجھ سے زیادہ مولوی صاحب کسی پر مہربان نہیں اور آج تک لوگ ان کے اخلاقِ محمدی سے رطب اللسان اور رجذب البیان ہیں اور ر رؤسائے پنجاب ان کی جناب میں باادب مریدانہ پیش آتے تھے۔ مزاج آپ کا تجرد پسند ، سیاحت دوست تھا اور آپ سیرِ اقالیم کو پسند فرماتے تھے۔"[۲۳]

اسی شوقِ سیاحت میں انہوں نے گھریلو زندگی کو خیر باد کہا اور کابل (افغانستان) چلے گئے جہاں آپ امیرِ کابل کی فرمائش پر کابل کے رئیس زادوں کو علومِ متداولہ پڑھاتے تھے۔ مولوی احمد بخش یکدل کی بتائی ہوئی تفصیلات کی روشنی میں مولوی غلام حسین چشتی کے سفرِ کابل کا زمانہ ۱۲۱۵ھ کے قریب تصور کیا جاسکتا ہے۔ ۱۲۱۲ھ میں مولوی یکدل پیدا ہوئے اور ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ کے قریب وہ

داخلِ مکتب ہوئے۔ مولوی یکدل کو ان کی والدہ مکتب میں لے کر گئی تھیں۔ مولوی غلام حسین اس زمانے میں کابل میں تھے۔ مولوی یکدل سے پہلے مولوی غلام حسین کے گھر چار بچے ولادت پا کر فوت ہو چکے تھے۔ جن کے نام مولوی یکدل نے حبیب اللہ، قادر بخش، بیگم بی بی اور رکھی بتاتے ہیں۔ کابل میں جن لوگوں سے آپ کے گہرے مراسم تھے ان میں ناظمِ کابل میرزائی خانؒ کے علاوہ عبدالستار چشتی اور پیرزادہ فضل احمد نقشبندی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موخرالذکر کا اہلِ کابل بے حد احترام کرتے تھے اور انھیں "پیرِ ابدالیان" کا خطاب حاصل تھا۔

کابل سے واپس آکر مولوی غلام حسین چشتی دوبارہ خاندانِ خالصہ کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جس زمانے میں مولوی صاحب کا وظیفہ مقرر کیا، اس زمانے میں ان کے بیٹے مولوی احمد بخش یکدل بھی علمی دنیا میں متعارف ہو چکے تھے اور ان کے پوتے مولوی نور احمد چشتی بھی دنیا میں آ چکے تھے۔ کیونکہ مولوی نور احمد چشتی کے یہ الفاظ کہ:

> "جب مولوی غلام حسین کابل سے لاہور میں واپس تشریف لائے اور بدستور قدیم اس خاندان عالی شان کے اتالیق مقرر ہوئے تو پھر مہاراجہ نے سائر لاہور پر چند چند روپیہ سالیانہ بنام والد اور مولوی غلام حسین صاحب اور بندہ کے مقرر کر دیے"۔ : تحقیقاتِ چشتی

.... اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ ۱۸۳۶ء تک مولوی غلام حسین نے جن خاندانوں کو تعلیم دی ان میں لالہ اجودھیا پرشاد، دیوان بیج ناتھ، دیوان شنکر ناتھ اور دیوان دینا ناتھ کے خاندان قابلِ ذکر ہیں۔ دیوان دینا ناتھ کے بھائی کدار ناتھ، ضلع لاہور کے ناظم پریم ناتھ اور شیو ناتھ آپ ہی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں آپ علائقِ دنیوی سے قطع تعلق کر کے یادِ خدا میں مشغول اور جذب و مستی میں فنافی الحسین ہو گئے تھے۔ مولوی غلام حسین چشتی کی وفات ۱۰ صفر ۱۲۶۰ھ مطابق ۲۹ فروری ۱۸۴۴ء کو جمعرات کے دن علی الصبح ہوئی۔

مولوی نور احمد چشتی نے وفات کا منظر بڑے دل گداز الفاظ میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"آخر کلام ان کی لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہوئی اور بعد از اں جاں بحق تسلیم ہوئی۔ من بعد جب دو ساعت انگریزی گزریں تو پائے مبارک آپ کا ہلا بلکہ پائے مبارک کو تاران مبارک جنبش ہوئی۔ اشخاص موجودہ حیران ہوئے تو مولوی جان محمد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ یہ معاملہ نعش حضرت شیخ شبلیؒ پہ بھی ہوا تھا۔"[۲۱]

مولوی غلام حسین چشتی کی وفات پر ان کے شاگردوں، دوستوں اور نیاز مندوں نے تاریخیں موزوں کیں اور تاریخی مادے نکالے۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے آپ کی وفات پہ آپ کے بارے میں مندرجہ ذیل یادداشت قلم بندکی:

"ناگہاں باواجی قدس سرہٗ دہم صفر ۱۲۶۰ھ رحلت فرمودند۔ آنچہ بر من گذشت سخت گذشت۔ یک ہزار و چار صد روپیہ بر ایشان خرچ کردم، در مسجد چینی خوابگاہ کردند۔ ہفت صد روپیہ بر مسجد و خانقاہ بخرچ آمدہ از خود بسیار دادم من مردم برادری من بسیار دادند۔ حالا غلاف و جاروب و چراغ و گل ہا بر مزار ایشان می باشند و خدمت از قرار واقعی جاری است تا کہ پنجشنبہ ہا و جمعرات کلاں ہا و چہلم و ششماہی و شب برات و عرس بعد از یکسال و مرثیہ ہا بخیر و خوبی بسیار شد۔"[۲۲]

وفات کی چند تاریخیں درج ذیل ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کے معاصرین آپ کے بارے میں کیا احساسات رکھتے تھے:

فقیر سید عزیز الدین آزاد

زین چشتیِ دینِ حق رضا باد بر روحِ وے از خدا ثنا باد
مقبول حسین بود ذاتش یارب بجوارِ مصطفےٰ باد
میداشت غلامی حسینیؓ آقاش حسینِ مرتضےٰ باد

از حضرت فخرِ دین و دنیا   از نور بفرقِ او ردا باد
ناگہ بسرم نزول فرمود!   ہاتف ز ایزدش جزا باد
چون دید تفکرم بتاریخ   او گفت کہ رحمتِ خدا باد

۱۲۶۰ھ

فقیر سیّد نورالدین منوّر

چون بمزار شریف دیدہ را افروختم
عرض نمودم کہ ای صاحب صد زیب و زین
سال وصالِ تو چیست گفت کہ اسے جانِ من
خامہ بکف شو، نویس، بندہ غلام حسین

۱۲۶۰ھ

دیوان امرناتھ اکبری

چونکہ نور چشم ابراہیم باصد آب و رنگ
کرد چون گل در گلستان اندرون خلد جائے
تیرگیہا خیرگی در دیدۂ عالم فزود
از زمین تا آسمان شد سر بسر ماتم سرائے
چون ضیاء الحق و ابراہیم جد و والدش
بود نسلاً بعد نسلٍ محوِ تسلیم و رضائے
چون غلامی حسین ابن علی بودش بدل
بامسمی بود اسم سامیِ آن نیک رائے
فخرِ او بود از شکر گنجؒ و معین الدینؒ چشت
بسکہ بر درگاہ فخر الدینؒ بودی جبہ سائے

چوں شرف یاب مزار او شدم دیدم کہ آن
ہست چوں گلزار ابراہیم با نور و ضیائے
سال تاریخش چو پرسیدم سروش غیب گفت
خوابگاہ مولوی گلزار ابراہیم یلمائے

۱۲۶۰ھ

اس سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے کہ مولوی غلام حسین چشتی نے وفات سے کچھ دیر پہلے کہا: "در درد حسین رفتم۔"

جب مولوی یکدل نے ان الفاظ کی اعداد شماری کی تو ۱۲۶۰ھ برآمد ہوئے۔ گویا آپ نے بستر مرگ پر خود اپنی تاریخ وفات موزوں کر دی۔[۲۳]

"مسجد چینی" میں اس خانقاہ کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کمیٹی نے اسے مرحوم کے پوتے مولوی محمد علی چشتی پر دل کی زندگی میں ان سے غلط بیانی کرکے گرا دیا تھا۔ اس کی تفصیل مولوی ممتاز علی چشتی نے اپنے روز نامچے میں درج کر کے تمام حقائق کو محفوظ کر دیا ہے۔[۲۴]

مولوی غلام حسین چشتی کا ذکر مولوی یکدل کی بیاضوں اور تصانیف میں جابجا موجود ہے۔ ان کا فارسی اور اردو کلام موجود ہے جس کا تذکرہ اگلے باب میں آئے گا۔ مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں مولوی صاحب موصوف کی کرامات بھی درج کی ہیں۔

مولوی احمد بخش یکدل چشتی،[۲۵] مولوی غلام حسین چشتی کی پانچویں اولاد تھے۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں، شعری بیاضوں اور تصانیف میں اپنے حالات زندگی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی اولاد میں سے مولوی نور احمد چشتی، مولوی حامد علی چشتی اور مولوی ممتاز علی چشتی کی تصانیف اور روز نامچے بھی موصوف کے ذکر سے مزین ہیں۔[۲۶] ان تحریروں کی مدد سے مولوی یکدل کی سوانح حیات بہت اختصار کے ساتھ بیان کی جاتی ہے:

مولوی احمد بخش یکدل ۷۔ ماہ صفر ۱۲۱۲ھ مطابق یکم اگست ۱۷۹۷ء کو رات کے دو بجے[۲۷]

نوگھرہ یاقوت خان محلہ آغا خانیاں، ہاگزرِ شیخ اسحاق اندرون ذکی دروازہ میں پیدا ہوئے[۲۸]۔ شہر کے اکابرین مبارکباد دینے آئے جن میں اپنے زمانے کے معروف دانش مند سید امیر بخش عرف نتھو شاہ بھی شامل تھے جنہیں یکدل نے عامل و کامل و مرگاں پوش و شاعر و صاحبِ علم لکھا ہے۔ یکدل کے دادا مولوی محمد ابراہیم چشتی نے آپ کا نام احمد بخش رکھا اور مندرجہ ذیل تاریخِ ولادت موزوں کی ہے[۲۹]

چون پورم از غلامی حسینی	بفرزندی کہ یارب باد شاداں
دو چشم خویش را انوار افزود	بود این ہر دو را اللہ نگہباں
چوں تاریخ ولادت باز جستم	ہم شد مصرعی از لطفِ یزداں
بروز شنبہ از ماہ صفر ہفت	قران ماہ و مہر و مشتری داں
بگوشم ہاتفی از غیب گفتہ	باحمد بخش یکدل لطفِ یزداں[۳۰]

۱۲۱۲ھ

مولوی نور احمد چشتی کے ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی احمد بخش یکدل کی ولادت کے وقت ان کے والد مولوی غلام حسین چشتی لاہور میں نہیں تھے اور حضرت فخر الدین فخرِ عالم چشتی کی بیعت کے لیے شاہجہان آباد گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"از آنجا کہ ذات مبارک آپ کی بڑی متعبد اور متشرع تھی لہٰذا شوقِ الٰہی نے وہ جذبہ دکھایا کہ بہ دل و جان تجسس پیر روشن ضمیر میں مشغول ہوئے۔ اس اثنا میں یہاں والدم مولوی احمد بخش صاحب المتخلص بہ یکدل پیدا ہوئے"[۳۱]۔

یہ بیان اشتباہ سے خالی نہیں۔ حضرت فخر الدین نظامی چشتی ۱۱۹۹ھ میں فوت ہوئے۔ اس اعتبار سے مولوی غلام حسین چشتی کا دہلی جانا اور حضرت کے ہاتھ پہ بیعت کرنا ۱۱۹۹ھ سے پہلے کا واقعہ ہے جیسے کہ خود مولوی نور احمد نے بیان کیا حضرت فخر الدین فخرِ عالم نے مولوی صاحب کا نام غلام علی سے بدل کر غلام حسین رکھا۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی متوفی ۱۱۹۵ھ کے ایک خط میں مولوی غلام حسین ہی لکھا ہے جس سے ثابت ہوا کہ بیعت کا واقعہ ۱۱۹۵ھ سے بھی پہلے کا ہے۔ اس مدت سے ۱۲۱۲ھ تک سترہ سال سے زیادہ

کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس قدر طویل مدت تک ان کا دہلی میں قیام کسی ماخذ سے ثابت نہیں۔ مولوی غلام حسین چشتی جیسا کہ پہلے بیان ہوا میرزائی خان حاکمِ کابل کے ایما پر عرصہ دراز تک کابل میں رہے۔ بیدل نے قیامِ کابل سے متعلق ان کی یادداشتوں سے تحفۂ بیدل میں استفادہ کیا ہے[۳۲]۔ ممکن ہے بیدل کی پیدائش کے وقت ان کے والد کابل میں ہوں۔ یہ بات یقینی ہے کہ ۱۲۱۷ھ یا ۱۲۱۸ھ کے نزدیک مولوی غلام حسین کابل میں تھے کیونکہ یہ سال مولوی احمد بخش بیدل کے مکتب میں داخلے کا ہے[۳۳] اور مولوی صاحب نے اس واقعے کے ساتھ اپنے والد کی گھر سے غیر حاضری کو یوں بیان کیا ہے:

"و چوں سرشتِ مرا زغم کردہ اند، از عہدِ صباکے مادرم در ہجر پدرم کہ روانۂ پشاور بودند و با مرزائی خان ناظم در کابل و فضل احمد پیرزادہ نقشبندی پیر ابدالیاں[۳۳] صحبت داشتہ و چیزی آوردہ، مادرم بمکتب میاں فضل اللہ از قوم خوجہ فرستادی و او در خانہ بھوانی داس کلال و کشن سنگھ نشستی۔ ہر بھگت سنگھ کہ مردہ و دھرم سنگھ و جیت سنگھ و نہال سنگھ و گلاب سنگھ و غیرہم خواندندی من غریب ترین مردم و نیز مسلمان بودم اما میاں فضل اللہ مرحوم بحرمت جدم حرمت کردی و قرآن شریف بر قرآن غلام محمد پور غلام علی بن دوست محمد خواندہ شد۔ مادام بمحنت و مشقت سہ روپیہ را قرآن شریف از امام بخش حافظ بن مولوی لطف اللہ خطاط بن عبدالہادی گرفتہ داد و آن تا حال موجود است مرا چیزی می آمد و چیزی نمی آمد۔ سخت لاچار از ذہنِ نارسا بودم و مادرم برای من دعا کردی و سر برہنہ نمودی"[۳۴]

مولوی احمد بخش بیدل نے اپنے ننھالی شجرے کی جو تفصیلات بیاضوں میں دی ہیں، ان کی رو سے یہ شجرہ یوں مرتب ہوتا ہے:

- مولوی محمد رضا
  - مولوی عصمت اللہ
    - مولوی عصام الدین
      - حاجی امام الدین
        - محمد مکی
        - حاجی احمد
      - عظمت النساء (زوجہ مولوی غلام حسین چشتی)
        - بیگم بی بی
        - حبیب اللہ
        - قادر بخش
        - رکھی
        - مولوی احمد بخش یکدل

یکدل کی والدہ عظمت النساء اور ان کی نانی رحمت النساء بنت جیوا، یکدل سے بے حد پیار کرتی تھیں دونوں خواتین نہایت نیک اور دیندار تھیں۔ یکدل نے لکھا ہے :

"مادر مادرِ من قرآن خوان و مادرِ من صابرہ و محنت کشیدہ و سخیہ و کریمہ و رحیمہ و
نا شیبہ بودہ است و بر من عاشقہ بود۔ مرا پرورش داد۔ من او را آسیا سائی
شریک شدم۔ مرا چون مرض آمدی جاروب بموی سر از دیوانگی دادی"۔ [۲۶]

مولوی یکدل کے بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے والد کا مسافرتِ کابل کے بعد ان کے گھر پہ عسرت اور تنگدستی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اس عسرت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مولوی یکدل کی شخصیت میں اعتماد اور احساسِ ذمہ داری نے جگہ لے لی۔ چنانچہ وہ سترہ برس کی عمر میں ہی یعنی ۱۲۷۹ھ کے قریب فارغ التحصیل ہو کر اپنے والد کی جگہ درس و تدریس کی ذمہ داریاں پوری کرنے لگے۔

مولوی یکدل نے لکھا ہے کہ سترہ برس کی عمر میں ہی ان کی ماں نے مولوی محمد بخش صحاف بن رحمت اللہ بن جان محمد بن رزق اللہ کی بیٹی فضل النساء سے ان کی شادی کر دی۔ اس وقت تک مولوی غلام حسین چشتی کابل سے واپس نہیں لوٹے تھے۔ مدرسے کی قلیل آمدن کے مقابلے میں گھر کے اخراجات اور پوری ذمہ داریاں

یکدل کے لیے بہت بڑا امتحان تھیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہوں نے اَن تھک محنت کی۔

مولوی صاحب درس و تدریس کے علاوہ اپنے خسر مولوی محمد بخش صحاف کے کارخانۂ صحافت (جلد سازی کتابت وغیرہ) میں ترجمہ، نقل نویسی اور کتابت کا کام انجام دیتے رہے۔ اس محنت کو یاد کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی محمد بخش کے علم میں ہے کہ میں کس قدر تیزی کے ساتھ کتابیں لکھتا تھا۔

۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان فتح کیا۔ یہ اس کی زندگی کا مشکل ترین اور اہم ترین کارنامہ تھا۔ اسی سال منکیرہ کے وکیل سکندر خان خاکوانی مہاراجہ سے ملنے لاہور آئے۔ وہ مولوی ضیاء الحق چشتی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے یہاں اپنے استاد اور ان کے خاندان کا پتہ دریافت کیا تو انہیں مولوی احمد بخش یکدل سے ملا دیا گیا۔

سکندر خان خاکوانی باعث ہوئے اور مولوی یکدل کی باریابی والیٔ پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ہوئی۔ ان کے علم و فضل کی تعریف کی گئی۔ مہاراجہ اس خاندان سے ناآشنا نہیں تھا اور نہ ہی وزراء اور عمائدینِ سلطنت بے اطلاع تھے۔ مہاراجہ کو فتحِ ملتان کی خبر اپنی حلیف اور دوست حکومت یعنی انگریزوں تک پہنچانی تھی۔ خط لکھنے کا کام مولوی یکدل کے سپرد ہوا۔ مولوی صاحب نے خط لکھا جسے اس عہد میں انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھا گیا۔ مہاراجہ کی توجہ ہوئی اور یکدل کی عسرت اور تنگدستی خوشحالی میں بدل گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل مولوی احمد بخش یکدل کی بیاضوں کے علاوہ تحقیقاتِ چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی اور خاص طور پر ظفر نامہ رنجیت سنگھ مصنفہ امرناتھ اکبری میں موجود ہے۔[۲۷]

۱۸۱۸ء سے پہلے تنگدستی، کام کی زیادتی اور مالی مشکلات نے اس قدر دباؤ ڈالا کہ مولوی یکدل ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اس کی تفصیل ان کی شاعری پر بحث کے دوران اگلے باب میں آئے گی۔

امرناتھ اکبری نے لکھا ہے مولوی یکدل کو خط کے صلے میں مہاراجہ نے انعام و اکرام اور خلعت و جاگیر عطا کی۔

مولوی نور احمد چشتی نے اس جاگیر کی تفصیل دی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"اسی وقت ایک چاہ موضع لبانوالہ اور ایک شریف پورہ اور ایک تلواڑہ اور ایک پکی ٹھٹھی اور ایک بمقام موضع جگ پورہ جو سرِ دریائے ڈیک ہے اور ایک ہوشیار پور اور ایک جالندھر میں عطا کیا اور ماسوا اس کے ایک باغ موضع سانڈہ میں بھی کہ جس کی زمین چالیس بیگھہ ہے، عنایت فرمایا اور کل آمدنی چھ سو روپیہ سالیانہ مقرر کر دی۔"[۲۸]

یہ واقعہ ۱۸۱۸ء یا ۱۸۱۹ء کا ہوگا۔ یہ جائداد ۱۸۴۹ء تک قابلِ استفادہ رہی۔ چونکہ خاندان کا کوئی فرد کاشت کار نہیں تھا لہٰذا ۱۸۴۹ء تک کل آمدنی بہت کم رہ گئی تھی۔ ۱۸۴۹ء کی یادداشت میں یکدل نے لاہور سے آمدنی کے بارہ میں لکھا ہے:

"از چاہاتِ ائمہ (کذا) مردم مرا نومید کردند"

اس سال چاہ سانڈہ، چاہ پکی ٹھٹھی، چاہ تلواڑہ، چاہ شریف پورہ اور جگ پورہ یا چک پٹواری کی آمدنی ۱۱۸ روپے تھی۔[۲۹]

۱۸۲۴ء میں مولوی یکدل کی والدہ عظمت النساء بیگم فوت ہو گئیں۔ مولوی صاحب نے تاریخِ وفات موزوں کی:

مادرم رفت و غم در گرفت   خاتمہ را فاتحہ از سر گرفت

فکر چون اندر پئے آنہا شدہ   رضوان اللہ علیہا شدہ

۱۲۴۰ھ

۱۸۲۸ء میں دیوان دینا ناتھ کے بیٹے امر ناتھ بھی شاگرد ہوئے اور دیوان موصوف نے پانچ روپے درماہا مقرر کیا۔ امر ناتھ کے علاوہ اس کے چچا کدار ناتھ کے دو بیٹے پران ناتھ اور بدری ناتھ بھی بعد میں مولوی یکدل کی شاگردی میں آ گئے لیکن مولوی صاحب ان کے باپ کے گستاخانہ رویے سے خوش نہیں تھے اور صاف لکھا ہے کہ:

"و باز کدار و با من بدی ہا کرد۔"

دیوان دینا ناتھ کے بیٹے امرنا تھ نے استاد کا احترام کیا اور مولوی صاحب نے اسے علم و دانش کا آفتاب بنا دیا۔ اس کے علمی اور ادبی کارہائے نمایاں آیندہ ابواب میں تفصیل سے زیر بحث آئیں گے۔

۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء میں مولوی احمد بخش یکدل کی اہلیہ فضل النساء نے وفات پائی۔ فضل النساء کے بطن سے اس وقت تک مولوی صاحب کے ہاں سات بچے پیدا ہو چکے تھے اور آٹھواں بچہ پیٹ میں تھا کہ موصوفہ کا انتقال ہو گیا۔ مولوی صاحب کو ان کی وفات سے بے حد صدمہ پہنچا۔ مرحومہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؛

"نیک بخت و پاک دامن و فرماں بردارِ من و مادرِ اولادِ من بود۔"[۱۴۱]

۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء میں ہی مولوی یکدل مزاراتِ خواجگانِ چشت کی زیارت کی غرض سے شاہجہان آباد گئے اور آٹھ مہینے وہاں قیام کیا :

"در مکتوب خودم بتکرار بقلم آمد کہ در ۱۲۵۰ھ بشاہجہان آباد بودہ ستم و ہشت ماہ در آنجا بودم۔"[۱۴۲]

اس سفر میں جن مزارات کی زیارت کی اس کی تفصیل بھی کئی جگہ لکھی ہے۔ قیامِ دہلی کے دوران مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر نے انہیں دربار میں باریابی دی۔ مولوی یکدل نے بادشاہ کو جب بتایا کہ حضرت فخر الدین فخر عالم چشتی میرے والد بزرگوار کے پیر تھے اور میرے دادا پیر ہیں تو بادشاہ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ بھی حضرت فخر عالم سے دلی ارادت رکھتے تھے۔ بادشاہ نے یکدل کو حضرت فخر عالم کی تاریخِ وفات لکھنے کی فرمائش کی۔ تاریخ لکھی گئی۔ بہادر شاہ ظفر، مولوی یکدل کی شاعرانہ دسترس اور علمی عظمت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں خلوت نشینی کا شرف بخشا۔ دونوں دیر تک بیٹھے تصوف اور اہل اللہ کے حالات و مقامات پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ حضرت فخر عالم کی تاریخ کی مناسبت سے مولوی یکدل کو شاہی دربار سے فخر الشعراء کا خطاب، خلعتِ سیزدہ پارچہ اور دو رقم جواہر عطا ہوئے۔ اس سفر میں ان کے فرزند اکبر مولوی نور احمد چشتی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہیں بھی بادشاہ عنایت سے سات پارچے کا خلعت عطا ہوا مولوی یکدل کی دہلی سے واپسی کے بعد بھی ان کے نام بہادر شاہ ظفر کے فرمان اور پیغام آتے رہے اور

بیدل بھی بادشاہ کی خدمت میں خطوط ارسال کرتے رہے[۴۳]۔ دہلی سے واپسی پر ۲۷۔ شعبان ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۹۔ دسمبر ۱۸۳۵ء کو مولوی احمد بخش بیدل نے دوسری شادی کی۔ اس کے بعد پے در پے شادیاں کیں۔ ۲۸ رمضان ۱۲۷۹ھ تک مولوی بیدل کے رشتۂ ازدواج میں پانچ بیویاں آ چکی تھیں جیسا کہ اس دن کے روزنامچے میں لکھتے ہیں:

"امروز کہ ۲۸۔ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ روز پنجشنبہ ۹ ماہ چیت سمت ۱۹۲۰ ۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء می گزرد۔ سبحان اللہ طبع درگرفت است۔ . . . تا در ۱۲۵۰ھ آن جنت نشین کشادہ پیشانی[۴۴] روانۂ ملک تقدس گردیدہ و باز دوم یک سال وچار ماہ و باز سوئم یک سال و یک ماہ و باز چہارم پانزدہ سال و باز پنجم زن را امروز ہشتم سال است"[۴۵]۔

ان پانچوں خواتین کے بارے میں مزید تفصیلات حسب ذیل ہیں:

۱۔ فضل النساء بیگم

مولوی بیدل کی پہلی بیوی۔ مولوی محمد بخش صحاف کی بیٹی تھیں۔ ۱۲۳۰ھ میں مولوی بیدل کے رشتۂ ازدواج میں آئیں۔ دوشنبہ ۲۔ شوال ۱۲۵۰ھ مطابق ۲۲۔ بگھر بسنت کے دن فوت ہوئیں اور قبرستان گنج شہیداں متصل شاہ ابوالمعالی میں سپرد خاک کی گئیں۔ ان سے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

۲۔ عظمت النساء

الٰہ بخش خراطی کی بیٹی تھیں۔ ۲۷ شعبان ۱۲۵۱ھ کو بیدل کے عقد میں آئیں اور ۶۔ شوال ۱۲۵۲ھ کو بدھ کے دن فوت ہو گئیں۔ قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہیں[۴۶]۔

ان کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔

۳۔ مولوی یکدل کی یادداشتیں ان کے بارے میں مبہم ہیں۔ بیاض یکدل شمارہ ۵ کے حاشیے پر مولوی یکدل کے پوتے مولوی حامد علی چشتی نے لکھا ہے:

"جدۂ سوم خاکسار لعل بی بی بنت حافظ نظام الدین انصاری سادہ کار بود۔ او پسر محمد عظیم و او پسر حافظ عصمت اللہ بود۔"

مولوی یکدل کے بیان کے مطابق اس خاتون سے انھوں نے ۲۵ ذوی الحجہ ۱۲۵۴ھ کو نکاح کیا اور وہ ۲۶ صفر ۱۲۵۵ھ کو فوت ہو کر شاہ ابوالمعالی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئیں[۴۲]۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔

۴۔ بختاور بی بی

ان کے بارے میں یکدل نے ۱۲۶۵ھ میں لکھا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ان کی شادی کو دو سال ہوئے ہیں[۴۳]۔ اس اعتبار سے مولوی یکدل سے ان کا نکاح ۱۲۶۳ھ میں ہوا۔ مولوی حامد علی کی بیاضوں میں ان کی وفات کی تاریخ چہارم ذیقعد ۱۲۷۱ھ درج ہے۔ ان سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔

۵۔ مہراں

یکدل نے ان کا نام نہیں لکھا۔ ۱۲۷۹ھ کی یادداشتوں میں صرف اس قدر ملتا ہے کہ ان کو یکدل کے رشتۂ ازدواج میں آئے آٹھ سال ہو گئے ہیں[۴۴]۔ گویا ان کی مولوی یکدل سے شادی ۱۲۷۱ھ یا ۱۲۷۲ھ میں ہوئی۔ مولوی حامد علی چشتی نے اپنی بیاض میں لکھا ہے کہ ان کا نام مہراں ہے (ممکن ہے مہر النساء ہو)۔ اور وہ ۱۱۔ شوال ۱۲۹۰ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۸۷۳ء کو ایک سال تپ دق کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد فوت ہوئیں۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ گویا مولوی یکدل کی بیویوں میں صرف یہی خاتون تھیں جو شوہر

کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔

ان بیویوں سے خدا تعالیٰ نے جو اولاد مولوی احمد بخش یکدل کو دی، اس کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی بیوی فضل النساء کے بطن سے:

۱۔ فاطمہ بی بی: بچپن ہی میں وفات پا گئیں

۲۔ عطاء الحق: بچپن ہی میں فوت ہو گیا۔ نانا نے اس بچے کا نام چراغ الدین رکھا تھا

۳۔ عطا حسین: چھوٹی عمر ہی میں فوت ہو گیا

۴۔ فضل بخش: بہت تھوڑی مدت زندہ رہا

۵۔ امۃ الزہرا: جمادی الاول ۱۲۵۶ھ کو پیدا ہوئیں۔ تقریباً گیارہ ماہ زندہ رہ کر ۱۵۔ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ کو فوت ہو گئیں۔[۵۰]

۶۔ غلام محی الدین: چھوٹی عمر ہی میں فوت ہو گیا

۷۔ امۃ البتول: ۲۔ رجب ۱۲۴۰ھ بروز سہ شنبہ پیدا ہوئیں۔ ۱۵۔ رجب ۱۲۴۹ھ مطابق مگھر سمت ۱۸۹۰ مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۳۳ء کو مفتی علی الدین بن مفتی خیر الدین کے خاندان کے ایک فرد مفتی امام الدین بن مفتی نظام الدین سے ان کی شادی ہوئی۔ بیس سال تک زندہ رہ کر یہ خاتون ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں فوت ہو گئیں۔ مفتی امام الدین کی وفات ۱۱۔ دسمبر ۱۸۹۲ء کو ہوئی۔[۵۱]

۸۔ نور احمد چشتی: متولد؛ ۷ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ / ۱۰ جون ۱۸۲۹ء
وفات؛ ۱۰۔ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ / ۴۔ اگست ۱۸۶۷ء

سوانحی تفصیلات "خاندانِ چشتی کے اہم مصنفین" کے زیرِ عنوان اگلے باب میں درج کی جائیں گی۔

دوسری بیوی عظمت النساء کے بطن سے:

۹۔ مولوی محمد علی: شوال ۱۲۵۲ھ/جنوری ۱۸۳۷ء کو پیدا ہوئے اور ۱۷۔مارچ ۱۸۹۱ء/۶۔شعبان ۱۳۰۸ھ منگل کے دن انتقال کیا۔ سوانحی و ادبی کوائف کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

۱۰۔ زیب النساء: عرف بی بی۔ ۱۹۔شعبان ۱۲۶۶ھ/۳۰۔جون ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی مولوی سراج الدین صحاف بن مولوی فضل اللہ دین بن مولوی محمد بخش صحاف سے ہوئی۔ ان کے بطن سے مولوی فخر الدین صدیقی پیدا ہوئے۔ زیب النساء تقریباً ۵۰ سال عمر پا کر ۲۳۔دسمبر ۱۸۹۸ء کو فوت ہوئیں۔[۵۲]

۱۱۔ اقبال النساء: ان کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات مہیا نہیں کہ ۱۷۔ستمبر ۱۸۶۸ء کو ان کی شادی مولوی امیر بخش صحاف بن خیر الدین بن مولوی محمد بخش صحاف سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں ایک کا نام نجم النساء تھا اور دوسری کا نام غلام فاطمہ تھا جو مولوی عبدالرحمٰن چشتی بن مولوی حامد علی چشتی بن مولوی محمد علی چشتی بن مولوی احمد بخش یکدل چشتی کی اہلیہ تھیں۔[۵۳]

تیسری بیوی لعل بی بی کے بطن سے:

۱۲۔ دختر: نام معلوم نہ ہو سکا۔ مولوی یکدل نے اپنی اس بیٹی کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے: "بعد از انفصال شیر دایہ رخصت شد"۔

چوتھی بیوی بختاور بی بی کے بطن سے:

۱۳۔ محمود علی: بچپن میں فوت ہو گئے۔ ان کی ولادت پر مولوی یکدل کے شاگرد رشید دیوان امرناتھ اکبری نے مندرجہ ذیل قطعۂ تہنیت کہا تھا:

چوں باحمد پسری داد جناب یزداں

طبع بشگفت ازیں مژدہ چوں گل در گلشن

سالِ میلاد بگفت از سرِ احد احمد

شد ز محمود علی لحمک لحمی روشن ۱۲۷۵ھ

پانچویں بیوی مہراں (مہرالنساء) کے بطن سے:

۱۴۔ مولوی محرم علی: ولادت: ۶۔محرم ۱۲۸۰ھ/۲۳۔جون ۱۸۶۳ء

وفات: ۸۔دسمبر ۱۹۲۴ء علی الصبح

سوانحی کوائف اور ادبی کارہائے نمایاں کی تفصیل اگلے باب میں درج ہوگی۔

۱۵۔ نورالنساء: مولوی احمد بخش یکدل کی سب سے آخری اولاد۔ تاریخِ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں ان کی شادی امیرالدین بن نظام الدین سے ہوئی۔ تادیر زندہ رہیں لیکن اولاد کے بارے میں چشتی خاندان کے تمام تحریری و صدری ذرائع خاموش ہیں۔

مولوی احمد بخش یکدل اپنے عہد کے ممتاز ترین فضلاء میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے معاصرین کی تحریریں ان کے فضائلِ علمی کے تذکروں سے بھری ہوئی ہیں۔ مہاراجہ، امراء، رؤسا اور عوام سبھی ان کے علم و فضل اور دانش و حکمت کا اعتراف کرتے تھے۔

مولوی یکدل گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے سوانحی کوائف کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دین اور دنیا دونوں کو یکساں طور پر اہمیت دیتے تھے۔ سکھوں کے عہد میں جبکہ پنجاب فسق و فجور کا مرکز بنا ہوا تھا، جن چند مردانِ حق نے لاہور میں دین کی شمع کو روشن رکھا اور تہذیبِ اسلامی اور تعلیماتِ قرآنی کے فروغ میں کوشاں رہے ان میں مولوی احمد بخش یکدل کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے

غیر مسلموں کو تعلیم دے کر اگر ایک طرف مسلمانوں کو سیاسی اور معاشرتی تحفظ دیا تو دوسری طرف غیر مسلموں کے دلوں میں توحید و رسالت کے اعجازِ قرآن کا نقش بٹھا دیا۔ آپ کے ہندو شاگردوں کی تحریریں قرآنی آیات، احادیث اور اسلامی اصطلاحوں سے پُر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے ہاں عاشقانہ جذبات و خیالات اور دنیا داری سے گہرا تعلق اور تملق بھی نمایاں ہے اور کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے فاسد معاشرے سے پورے طور پر دامن نہیں بچا سکے۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولوی یکدل کے ہاں کوئی ایسی لغزش یا غلطی نظر نہیں آتی جس سے ان کے دل میں اور ان کے معاشرے میں کوئی فرق نہ رہا ہو۔ انہیں اپنی خاندانی شرافت اور اپنے علمی وقار کا ہمیشہ خیال رہتا تھا اور وہ ہمیشہ اس حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔

مولوی یکدل بے حد نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ سادہ لیکن نہایت صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ بیاضوں میں اکثر لکھا ہے:

"گلہائے موتیا را دوست دارم"

خوش خوراک تھے۔ انہوں نے اپنی بیاضوں میں اپنے گھر پہ ہونے والی متعدد ضیافتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں انواع و اقسام کے کھانے اور فروٹ کی کثرت ہوتی تھی۔ وہ تنگدستی کے زمانے میں بھی قرض اٹھا کر مہمان نوازی کا حق ادا کر دیتے تھے:

"شب گلگلہ ہا در روغن کردہ شد۔ و ہمہ شب در سرود ماندند و زیبا عشرت و خوب انجمن (از) عنایتِ الٰہی آراستہ شد۔ فضلِ الٰہی دامنگیر شد۔ وزن ہا شب نیکو سر دو کردند"[۵۵]

وہ بے حد اقربا پرور اور خدا ترس تھے۔ اقربا پروری کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے:

"بندہ احمد بخش چشتی را نصیحت است کہ اگر دست رسد، با قربا خوبی باید رسانید چرا کہ در مردم بسر خروی باید نشست"[۵۶]

خدا ترسی کا جہاں تک تعلق تھا اس کی مثال اس سے ظاہر ہے کہ محلہ نو گھرا کے باہر ایک مسجد میں

مولوی یکدل امامت کرتے تھے۔ یہ ۱۸۳۲ء کا ذکر ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بقول یکدل:

"دریں روزہا سخت عسرت دامنگیر حال شدہ واگر فضل الٰہی شود بہ یسّر مبدل گردد یک آثار آرد در خانہ نیست واگر از کسی طلب نمودہ میشود، ہر یکی چشم پوشی می نماید"۔ [۵۸]

"چوں از بابت ادای قرض فدوی بسیار مجبور بود و شخص گزران بمشاہرہ شش روپیہ می کند وپیشگی از ہمسایہ وغیرہ گرفتہ ادای قرض نمودہ یک خرمہرہ پیش خود نداشت"۔ [۵۹]

اس کے باوجود مولوی یکدل نے اس مسجد کی امامت ایک بزرگ قاضی محمد بخش رسول نگری کے سپرد کر دی، محض اس لیے کہ "کثیر الاحتیاج است"۔ [۶۰]

مولوی یکدل نو گھرا یا توت خان والے مکان کو چھوڑ کر محلہ قاضی صدر الدین میں آ گئے تھے۔ [۶۱] اس گھر کا محلِ وقوع حسبِ ذیل تھا:

"دیوار بخانۂ فقیر خانہ واقعہ دار السلطنت لاہور، محلہ قاضی صدر الدین مرحوم، حویلی آدینہ بیگ خاں، گزر چابک سواران گگے زئی، متصل کوچہ قدوۃ العلماء حضرت محمد شہریار مغفور لاہوری متصل مسجد چینی مینۂ حضرت بہادر شاہ عالمگیر بادشاہ، فیل خانہ شاہنواز خاں، تکیہ سادھواں، کٹڑہ حاجی امان اللہ، چوہٹہ مفتی باقر"۔ [۶۲]

۱۸۳۲ء کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال انہیں فشارِ خون یعنی بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت اور دنیاوی پریشانیوں کے سبب امراض میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۸۶۶ء کے اواخر میں مولوی یکدل پر فالج کا حملہ ہوا جس میں وہ ایک سال تک مبتلا رہے۔ چنانچہ ۱۱ اگست ۱۸۶۷ء کو جب ان کے چہیتے بیٹے مولوی نور احمد چشتی کی اچانک وفات ہوئی تو وہ مفلوج تھے۔ مولوی حامد علی چشتی لکھتے ہیں:

"جناب جدم بیمار و مفلوج و بے ہوش بودند، اوشاں را در محافہ سوار، ہمراہ جنازہ بردند او شاں از صدمۂ عظیم خود خبر نداشتند۔"[۶۳]

مولوی حامد علی چشتی نے اپنے دادا مولوی یکدل کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ آپ کی لفظی تصویر کھینچتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"باوجود ضعیفی عمر جناب ممدوح، رنگ مبارک سرخ و شکم کلاں و دست و انگشت ہا کلاں، آواز بلند و بشرہ، ہمچو شیر بود۔ یک سال کامل در فالج مبتلا ماندند۔"[۶۴]

جوان بیٹے کے جنازے میں شرکت نے مولوی احمد بخش یکدل کے ایام حیات کو اور مختصر کر دیا۔ وہ اس سانحۂ عظیم کی تاب نہ لا سکے چنانچہ ۲۔ نومبر ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ کو انیسویں صدی میں علم و ادب، دانش و حکمت اور تاریخ نویسی کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا لیکن بقول یکدل:

نوشتم بر در و دیوارِ خانہ — بماند از منے یکدل نشانہ
اگر پرسند ایں یکدل کجا رفت؟ — بگو، بگریخت از دستِ زمانہ[۶۵]

مولوی حامد علی چشتی نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو سینکڑوں سوگوار اخلاف، شاگردوں اور عقیدتمندوں کے ہجوم میں تکیہ ڈودرے شاہ نوکھا لاہور کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔[۶۶]

مفتی غلام سرور لاہوری نے گنجِ تاریخ میں مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ درج کیا ہے:[۶۷]

شد بہ بزمِ محمدی آخر — احمد آں بندۂ صداقت نقش!
سالِ تاریخ رحلتش سرور — گفت: دیدارِ حق باحمد بخش!

۱۲۸۴ھ

مولوی احمد بخش یکدل کو لاہور کے چشتی خاندان کا معنوی مورثِ اعلیٰ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس خاندان کا تمام علمی و ادبی کام انہی کی اولاد سے وابستہ ہے۔[۶۸] اپنے خاندان کی علمی ناموس اور ادبی شخصیت کی تعمیر کے لیے انھوں نے نہ صرف اپنی زندگی وقف کر دی بلکہ اس روایت کو ایسی حیاتِ جاودانی عطا کی کہ آج تک اس کے اثرات اس خاندان کے افراد میں موجود ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کے علمی

کارناموں اور اردو ادب میں ان کی خدمات پر آیندہ باب میں بحث ہوگی۔

لاہور کے چشتی خاندان کا شجرۂ نسب:

مولوی محمد عاقل چشتی اورنگ آبادی

مولوی نظام الدین چشتی — مولوی عنایت اللہ چشتی

مولوی ضیاء الحق — مولوی بہاء الحق

مولوی محمد ابراہیم چشتی — لڑکی (زوجہ مرزا ہدایت اللہ)

عابدہ بی بی (زوجہ ملّازادہ محمد حیات) — مولوی غلام حسین چشتی

امام بخش

محمد بخش — بیگم — بھاگن

علم الدین — چراغ الدین — شہاب الدین

حبیب اللہ — قادر بخش — بیگم بی بی — رکھی — مولوی احمد بخش یکدل چشتی

فاطمہ بی بی (فوت شد) — عطاء الحق (فوت شد) — عطا حسین (فوت شد) — غلام محی الدین (فوت شد) — فضل بخش (فوت شد) — مولوی محمد علی چشتی — امۃ الزہرا (فوت شد) — امۃ البتول — مولوی نور احمد چشتی — دختر (فوت شد)

اقبال النساء — نجم النساء — غلام فاطمہ — زیب النساء

نور النساء — محمود علی (فوت شد) — مولوی محرم علی چشتی

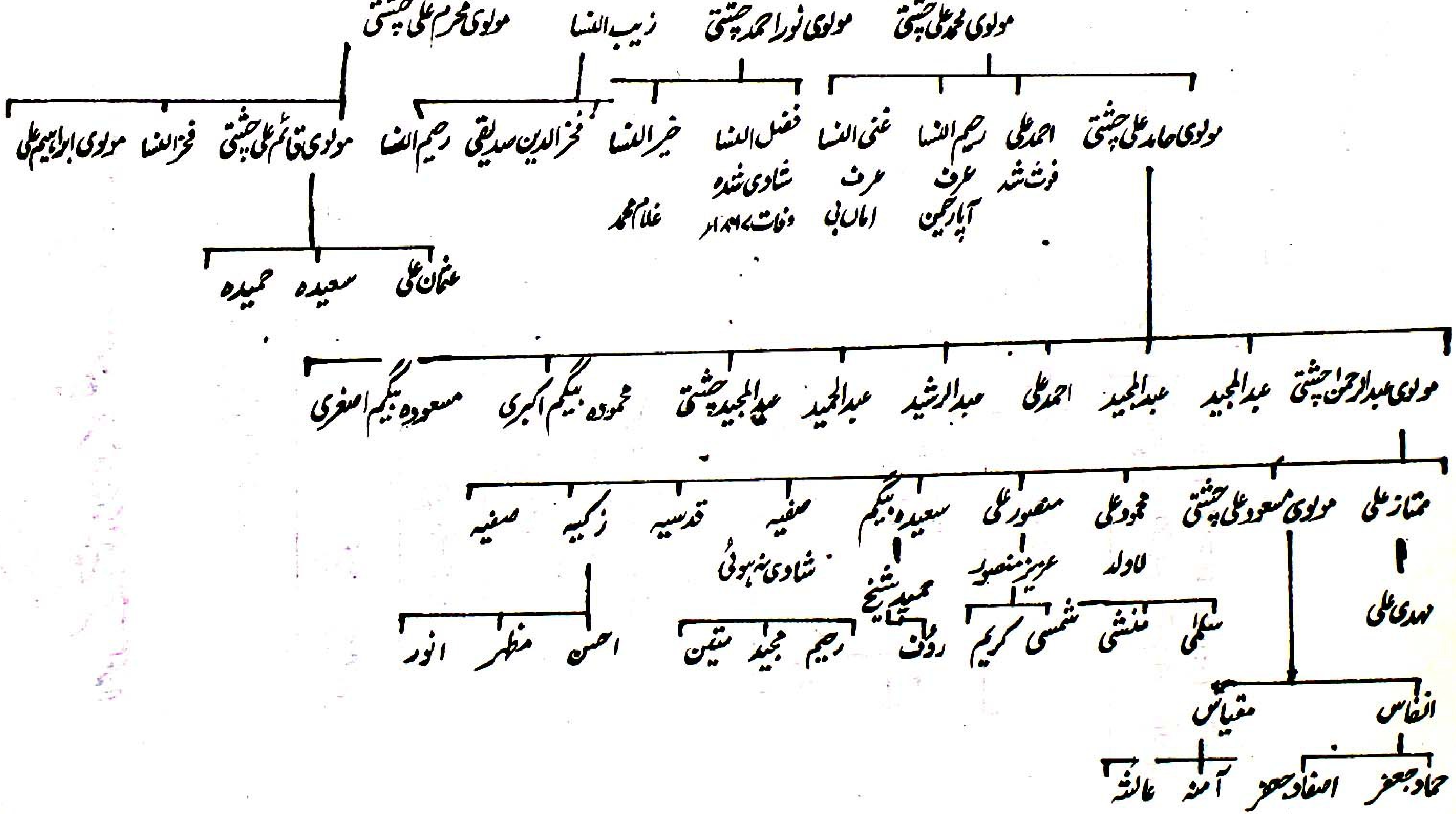
مولوی محمد علی چشتی
مولوی نور احمد چشتی
زیب النسا
مولوی محرم علی چشتی
مولوی حامد علی چشتی
احمد علی
فوت شد
رحیم النسا
عرف
آپا رحیمن
غنی النسا
عرف
اماں بی
فضل النسا
شادی شدہ
وفات ۱۹۸۱ء
خیر النسا
غلام محمد
فخر الدین صدیقی
رحیم النسا
مولوی قائم علی چشتی
فخر النسا
مولوی ابراہیم علی
عثمان علی
سعیدہ
حمیدہ
مولوی عبد الرحمن چشتی
عبد المجید
عبد المجید
احمد علی
عبد الرشید
عبد الحمید
عبد المجید چشتی
محمودہ بیگم اکبری
مسعودہ بیگم اصغری
ممتاز علی
مہدی علی
مولوی مسعود علی چشتی
محمود علی
لاولد
منصور علی
عزیز منصور
سعیدہ بیگم
حمید شیخ
صفیہ
شادی نہ ہوئی
قدسیہ
زکیہ
صفیہ
سلمیٰ
منشی
شمسی
کریم
رؤف
رحیم
مجید
متین
احسن
مظہر
انور
انفاس
مقیاس
حماد جعفر
اصفاد جعفر
آمنہ
عائشہ

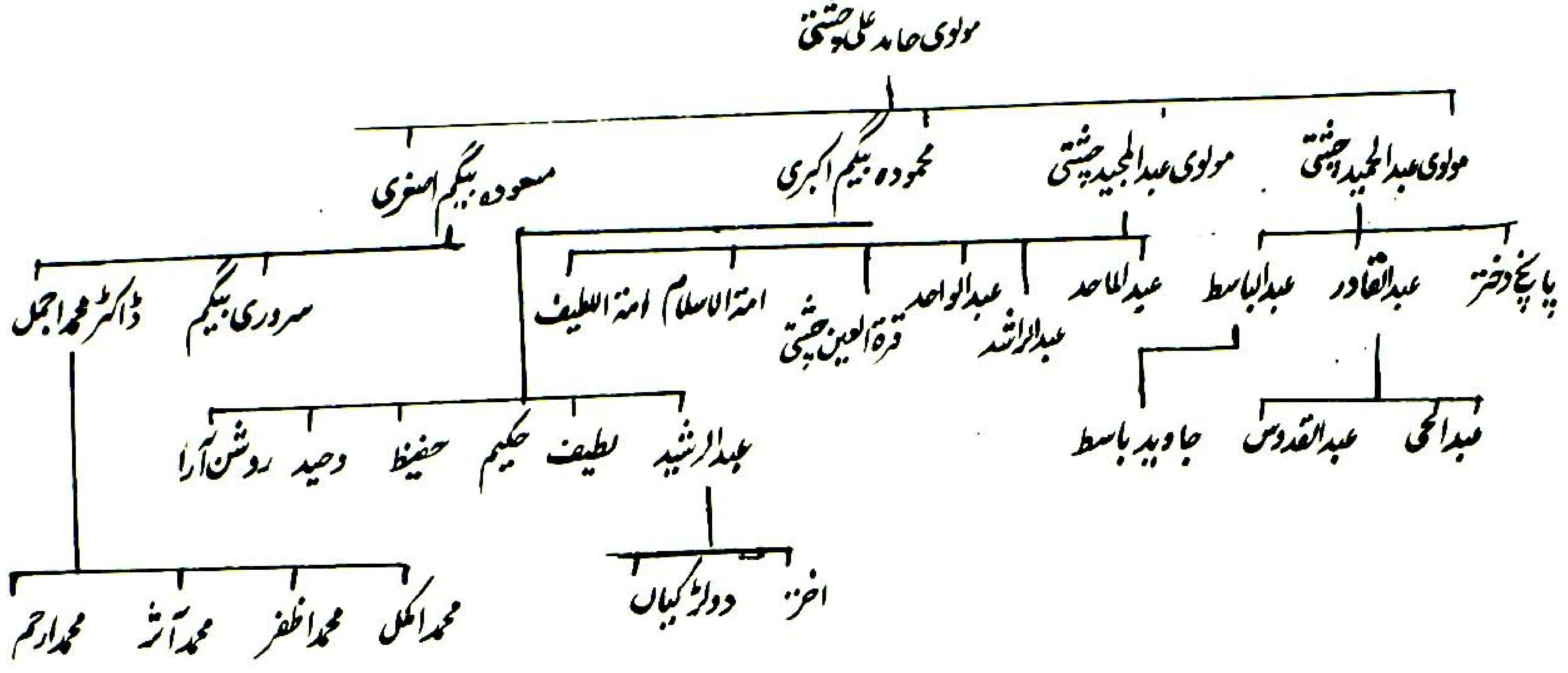

مولوی حامد علی چشتی
مولوی عبدالحمید چشتی
مولوی عبدالمجید چشتی
محمودہ بیگم اکبری
مسعودہ بیگم اصغری
پانچ دختر
عبدالقادر
عبدالباسط
عبدالماجد
عبدالراشد
عبدالواحد
قرۃ العین چشتی
امۃ الاسلام
امۃ اللطیف
سروری بیگم
ڈاکٹر محمد اجمل
عبدالحی
عبدالقدوس
جاوید باسط
عبدالرشید
لطیف
حکیم
حفیظ
وحید
روشن آرا
اختر
دو لڑکیاں
محمد اکمل
محمد اظفر
محمد آتش
محمد ارحم

حواشی ــــ باب سوم

۱۔ حیاتِ رشید: مولفہ مرزا اعجاز حسین بی۔اے دہلوی، وکیل چیف کورٹ پنجاب مقیم انبالہ، لاہور ۱۹۰۹ء

۲۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۱

۳۔ ایضاً۔ ص ۵۲۰

۴۔ ایضاً۔ ص ۵۲۱

۵۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: بیاضِ اشعار۔ ف ۲ الف،ب، نیز تحفۂ یکدل ف ۸۳۔ (بخطِ مصنف)۔

۶۔ یکدل: بیاض نمبر ۱۲

۷۔ یکدل: بیاض نمبر ۱۳

۸۔ مولوی حامد علی چشتی: بیاضِ حامد نمبر ۹ ف ۱۷

۹۔ یکدل: بیاض شمارہ ۱۳۔ ف ۲۶

۱۰۔ مراد ہے مولوی محمد ابراہیم چشتی

۱۱۔ یکدل: بیاضِ یکدل نمبر ۱۲ ف ۴۵

۱۲۔ پنجابی میں خورد پور کا تلفظ خوہ پور یا خطبور سے ادا کیا جاتا ہے

۱۳۔ یکدل: بیاضِ یکدل نمبر ۱۲

۱۴۔ ایضاً۔ شمارہ ۱۳ ف ۲۶

۱۵۔ یکدل: بیاضِ اشعار ف ۸۷ الف

۱۶۔ مولوی یکدل : بیاضِ یکدل۔ شمارہ ۱۵۔ ف ۱۷

۱۷۔ مجموعہ متفرق اوراق : یہ اوراق مولوی مسعود علی چشتی نے راقم الحروف کو عنایت فرمائے۔

۱۸۔ مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی۔ لاہور ۱۹۶۴ء ص ۸۱

۱۹۔ مولوی یکدل : بیاض شمارہ ۱۳

۲۰۔ میرزائی خان : نائب الحکومت کابل، لوگری، بَرَکی، غلجائی۔ پدر نائب امین اللہ خان لوگری فرمانِ شاہ زمان بنام ص ۶۱۲۔ "تیمور شاہ درانی" طبع کابل ۴۶ ۱۳ھ (مکتوب آقای عبدالحی حبیبی، استاد دانش گاہِ کابل بنام راقم الحروف)۔

۲۱۔ مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی۔ لاہور ۱۹۶۴ء ص ۲۱

۲۲۔ مولوی یکدل : بیاضِ یکدل شمارہ ۱۰

۲۳۔ مولوی یکدل : تحفۂ یکدل (بخطِ مصنف) مملوکہ راقم الحروف ، ف ۱۳

۲۴۔ مولوی ممتاز علی چشتی : روز نامچہ مولوی ممتاز علی مکتوبہ ۱۹۱۷ء مملوکہ پروفیسر قمرالمعین چشتی لاہور ف ۱۸۔ (راقم الحروف نے اس کے فوٹو سٹیٹ سے استفادہ کیا ہے)۔

۲۵۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے تفصیلی حالات پر راقم الحروف نے فارسی زبان میں ایک مفصل مقالہ تحریر کیا ہے جس کا بیشتر حصہ دانش گاہِ مشہد (ایران) کے علمی جریدے "مجلہ دانشکدۂ ادبیات و علومِ انسانی" کے شمارہ اول سال سیزدہم بہار ۲۵۳۶ شاہنشاہی میں "احوال و آثار فخر الشعراء یکدل چشتی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے

۲۶۔ نیز ملاحظہ ہو "ظفر نامہ رنجیت سنگھ" مصنفہ امرناتھ اکبری ملاہور ۱۹۲۸ء۔ ص ۱۰۴

۲۷۔ مولوی یکدل : بیاضِ یکدل نمبر ۱۲۔ ف ۱۱۵

۲۸۔ ایضاً۔ نمبر ۲۔ ف ۸۱

۲۹۔ "نوگھر ایاقوت خان محلہ آغا خانیاں، گزر شیخ اسحاق کہ در آن محلہ پدر بندہ و بندہ ولادت و بالیدگی یافتہ است و نیز ، کہ خدا و آن خانہ شدم"۔

۳۰۔ "قرانِ ماہ و مہر و مشتری" کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی محمد ابراہیم چشتی علاوہ دیگر علوم کے علمِ نجوم میں بھی دسترس رکھتے تھے۔

۳۱۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء ص ۱۵

۳۲۔ مولوی احمد بخش یکدل: تحفۂ یکدل بخطِ مصنف۔ ف ۷۔ "عبدالستار چشتی پیش پدرم در کابل بیان کرد" وغیرہ

۳۳۔ مولوی نور احمد چشتی نے لکھا ہے کہ مولوی یکدل عمر کے چھٹے سال میں داخلِ مکتب ہوئے۔ (تحقیقات ص ۱۵۱)۔ "بیان فضل احمد سرہندی آنست کہ احمد سرہندی کابلی است و امام ربانی مجدد الف ثانی، پس شاہان کابل را استقلال سلطنت از سرہند بجنگ افتد"۔ (یکدل: تحفۂ یکدل ف ۱۰)۔

۳۴۔ مولوی یکدل: بیاض یکدل نمبر ۱۲

۳۵۔ مولوی عصام الدین نے زندگی کا بڑا حصہ نادری لشکر میں بسر کیا تھا۔ نادر شاہ بادشاہ کے بارے میں ان کی بیان کردہ روایات "تحفۂ یکدل" میں درج ہیں۔ مولوی عصام الدین کا سالِ وفات معلوم نہیں۔ ممکن ہے یکدل نے انہیں دیکھا اور ان سے براہِ راست استفادہ کیا ہو۔

۳۶۔ مولوی یکدل چشتی: بیاض یکدل شمارہ ۱۲

۳۷۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء ص ۲۲۔ امرناتھ اکبری: ظفرنامہ رنجیت سنگھ لاہور ۱۹۲۸ء ص ۱۲۳

۳۸۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء ص ۲۳

۳۹۔ مولوی یکدل: بیاض یکدل نمبر ۱۴۔ ف ۳۸

۴۰۔ بعد ازیں دیوان امرناتھ اکبری۔ مصنف ظفرنامہ رنجیت سنگھ۔

۴۱۔ مولوی یکدل: بیاض یکدل شمارہ ۱۲

۴۲۔ اوراق ملسکہ گلستانِ سعدی بخطِ یکدل مکتوبہ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی راقم الحروف کے پاس اس کتاب کا مکمل فوٹوسٹیٹ موجود ہے۔

۴۳۔ بہادر شاہ ظفر کے نام لکھا ہوا مولوی یکدل کا ایک خط جس پر ۱۲۵۸ھ درج ہے راقم الحروف کے اپنے کتاب خانے میں ہے۔ کسی اہم کام کی انجام دہی کے لیے بادشاہ سے اجازت اور ماموریت طلب کی ہے۔

۴۴۔ مراد ہے فضل النساء بیگم

۴۵۔ مولوی یکدل: اوراقِ منسلکہ گلستانِ سعدی۔ بخطِ یکدل

۴۶۔ بعد میں ان کی قبر میانی صاحب سے گورستانِ چشتیہ واقع سلطان پورہ روڈ میں منتقل کر دی گئی تھی: بحوالہ مولوی مسعود علی چشتی

۴۷۔ مولوی احمد بخش یکدل: بیاضِ یکدل۔ شمارہ ۷

۴۸۔ ایضاً۔ شمارہ ۱۲

۴۹۔ اوراقِ متفرقہ، مملوکہ راقم الحروف بخطِ یکدل

۵۰۔ مولوی یکدل: بیاضِ یکدل شمارہ ۲۔ ف ۱۴

۵۱۔ مولوی حامد علی چشتی: روزنامچہ حامد علی چشتی: مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی لاہور

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ ایضاً

۵۴۔ مولوی یکدل: بیاضِ یکدل نمبر ۱۲

۵۵۔ "وقتِ مغرب بود، من نماز خوانده از خانہ روانہ شدم۔ نزدیک مسجد توپ سقا رسیدم، آنجا باران شد۔ ہمیں طور کلاہ بر سر و تہ بند و دوپٹہ داشتم۔ مہر اقبال لوئی داد، پسند نمودم و بالا گرفتم۔" (مولوی یکدل: بیاضِ یکدل شمارہ ۲۔ ف ۱۵)

۵۶۔ مولوی یکدل: بیاضِ یکدل۔ شمارہ ۲۔ ف ۲۲

۵۷۔ ایضاً۔ ف ۲۴

۵۸۔ مولوی یکدل: بیاضِ یکدل۔ شمارہ ۲۔ ف ۳۲

۵۹۔ ایضاً۔ ف ۲

۶۰۔ قاضی محمد بخش رسول نگری، ۱۷ جولائی ۱۸۹۳ء کو فوت ہوئے۔ (روزنامچہ مولوی حامد علی چشتی)۔
قاضی صاحب آخری عمر میں مسجد چینی کے امام تھے۔

۶۱۔ محلہ نوگھرا والا مکان مولوی یکدل نے مرمت کروا کر کرائے پر دے رکھا تھا اور اس میں گھبنہ نقیب رہتا تھا۔

۶۲۔ مولوی یکدل: بیاضِ یکدل نمبر ۱۲

۶۳۔ مولوی حامد علی چشتی: بیاضِ حامد یا روزنامچہ حامد علی چشتی؛ مملوکہ پروفیسر قرۃ العین لاہور

۶۴۔ ایضاً

۶۵۔ مولوی یکدل: دیوانِ یکدل (اردو) بخط مصنف مملوکہ راقم الحروف

۶۶۔ مولوی حامد علی چشتی: روزنامچہ مولوی حامد علی، مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی لاہور

۶۷۔ مفتی غلام سرور لاہوری: گنجِ تاریخ۔ لکھنؤ نولکشور ۱۸۷۷ء، ص ۲۱۶

۶۸۔ چشتی خاندان کا مفصل شجرۂ نسب جو اس خاندان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کی مدد سے مرتب کیا گیا، اس باب کے ساتھ منسلک ہے۔

باب چہارم

چشتی خاندان کے اہم مصنّفین

ا۔ مولوی ضیاء الحق چشتی

مولوی ضیاء الحق چشتی بن مولوی عنایت اللہ چشتی اجودھنی بن مولوی محمد عاقل اورنگ آبادی متوفی ۱۱۶۰ھ کے سوانحی کوائف پچھلے باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کے بیانات کے مطابق مولوی ضیاء الحق چشتی نے لاہور میں نواب عبدالصمد خان اور نواب زکریا خان کا زمانہ پایا۔ مولوی صاحب موصوف نے نواب عبدالصمد کی تاریخِ وفات مندرجہ ذیل مصرعے میں بطور تخرجہ موزوں کی:

"صمد ماند، عبدالصمد خان نماند" [۱]

مولوی نور احمد چشتی نے لکھا ہے کہ نواب خان بہادر، ناظم لاہور نے انہیں اپنے صاحبزادوں میں سے یحییٰ خان کا اتالیق مقرر کیا تھا[۲]۔ نواب خان بہادر سے مراد یقیناً نواب زکریا خان ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی ضیاء الحق چشتی اپنے زمانے کے جانے پہچانے علماء میں سے تھے۔ نواب زکریا خود صاحبِ علم آدمی تھا۔ نادر شاہ نے شالا مار باغ میں قیام کے دوران جب نواب موصوف سے شالا مار کے معنی دریافت کیے تو اس نے برجستہ کہا:

"نرگس چشمانِ ہند باغ گویند و لفظ ترکی است و فرحت گاہ فارسی" (تحفہ یکدل)

نواب زکریا خان کی علم دوستی اور درویش پروری کے واقعات پیر کمال لاہوری نے مثنوی تحائفِ قدسیہ میں بھی درج کیے ہیں[۳] مولوی ضیاء الحق چشتی کو اس ماحول میں جو رتبہ اور احترام ملا وہ حق بحقدار رسید کے مترادف تھا۔

مولوی نور احمد چشتی نے لکھا ہے کہ:

"مولوی ضیاء الحق خلف مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم، نادر کے استاد مقرر ہو کر ہند میں تشریف لائے"[۴]

اگر نادر سے مراد نادر شاہ ہے تو یہ بیان محلِ نظر ہے۔ مولوی صاحب موصوف جیسا کہ مولوی یکدل کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے، مولوی ضیاء الحق چشتی حملۂ نادری ۱۷۳۹ء سے پہلے لاہور میں موجود تھے اور دوسرے یہ کہ حملۂ نادری کے وقت مولوی ضیاء الحق نے اس حملے کی جو تاریخ منظوم کی ہے وہ نادر شاہ کے استاد کی نہیں اس کے کسی مخالف کی ہی ہو سکتی ہے۔ مولوی یکدل نے یہ تاریخ تحفۂ یکدل میں شامل کی ہے جو درجِ ذیل ہے:

"قدوۃ الکاملین مولوی ضیاء الدین والحق چشتی جدِ راقم در آن ورود جالی بر زبان آورد؛

نادر آمد بہند در یکدم　　کرد بر خلق جور و ظلم و ستم

حالِ تاریخ او دو تا آمد　　غم عام است و نیز چند قدم"[۵]

امرنا تھ اکبری نے آفرین لاہوری، محمد امین نیا یش سیالکوٹی، میر مومن خان، میر نعمت خان بخاری اور دیوان صورت سنگھ لاہوری کو مولوی ضیاء الحق کا ہم عصر اور ہم صحبت قرار دیا ہے[۶] ان میں سے ہر شخص علم و دانش میں یگانۂ روزگار تھا۔

مولوی ضیاء الحق چشتی صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔ ان کی تصنیف "ضیائی" کو اس خاندان کے علمی کارناموں میں خاص شہرت حاصل ہے۔

"ضیائی" کا نسخہ مولوی یکدل کے زمانے تک ان کے خاندان کے پاس موجود تھا چنانچہ ۱۸۴۹ء

میں جب مولوی یکدل نے اپنے کتاب خانے کی فہرست تیار کی تو اس میں یہ کتاب "رسالہ مصنفہ اجداد بندہ" کے زیرِ عنوان موجود ہے۔ میں نے چشتی خاندان پر تحقیقی کام کے دوران اس کتاب کی تلاش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مولوی یکدل کے ذاتی کتابخانے کا غالب حصہ مولوی حامد علی چشتی کے گھر میں تھا۔ اس کے بعد کچھ کتابیں اور تبرکات مولوی مسعود علی چشتی نے اپنے ہاں محفوظ کیے ہوئے تھے۔ میں نے دونوں کتابخانوں میں اس کتاب کو بدقت تلاش کیا لیکن اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

مولوی حامد علی چشتی کی وفات کے بعد مولوی یکدل کا کتاب خانہ کئی ہاتھوں میں پہنچ کر منتشر ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں اس کتاب پر کیا مصیبت نازل ہوئی۔ شاید کسی وقت اس کتاب کا اچانک سراغ مل جائے اور اس خاندان کے ایک اہم تصنیفی کام کو منظرِ عام پر لایا جا سکے۔[۷]

۲۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی المتخلص بہ خوشدل

مولوی محمد ابراہیم چشتی متوفی ۱۲۰۲ھ / ۸۸-۱۷۸۷ء۔ مولوی ضیاء الحق چشتی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا عہدِ حیات لاہور میں سیف الدولہ نواب زکریا خان بہادر دلیر جنگ کے دورِ نظامت سے لے کر لاہور پر سکھ سرداروں کے قبضے تک ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ قدر و منزلت کے اعلیٰ مراتب پر فائز رہے۔ مولوی احمد بخش یکدل نے لکھا ہے کہ:

"مولوی محمد ابراہیم چشتی نواب زکریا خان کے استاد تھے۔"[۸]

یہ محلِ نظر ہے۔ ان کی بجائے اگر وہ مولوی ضیاء الحق چشتی کا نام لیتے تو قرینِ قیاس تھا۔ مولوی محمد ابراہیم علم و فضل کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے نواب زکریا خان کی مندرجہ ذیل تاریخِ وفات بفن تعمیہ موزوں کی تھی:

حیف صد حیف کہ شہر لاہور — زیر و بالا شد و افسر معدوم
رونق از عرصۂ پنجاب برفت — گریہ ہا کرد کلان و معصوم
گشت امروز بخارا ویران — صد شرف داشت لاہور بروم

دامنِ لطف جناب ناظم | امن اداد زہر چند و بوم
روز سہ شنبہ جمادالثانی | خاک بیگم پورہ کرد شش منظوم
سالِ او از سرِ ابجد گفت | "ہاتفم" "خان بہادر مرحوم"

مولوی محمد ابراہیم چشتی اپنے زمانے کے سیاسی اور معاشرتی احوال سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ جب ملک کفایت خان نے نواب زکریا خان سے نمک حرامی کرتے ہوئے اس کے خلاف نادرشاہ سے ساز باز شروع کی اور نادرشاہ نے نواب موصوف کے سامنے خود اس راز کو فاش کر دیا تو اہلِ لاہور کے دلوں میں کفایت خان کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی نے اس واقعہ کی تاریخ قلمبند کی جو درج ذیل ہے[1]:

کشمیری بدخواہ خلائق غلق اندیشش
آن موزی مطلق کہ بہ تشویش پی افشرد
از بسکہ شدہ معنی ناخوب پسندش
ہر فرد ہمہ از قول ہم از فعل بیازرد
آخر چو بپاداش متادیر شرارت
از دستِ فلک تلخی بیزاری جاں خورد
یعنی کہ بزندانِ غضب ناکِ نواب
جانداد بدشواری و صد گونہ جفا برد
ایں واقعہ شد وانی[2] ہر واقفِ کارش
یکنوع نظارت چو بضمن دلم آورد
تاریخِ وقوعش پئے خورسندی احباب
جستم ز خرد، گفت بہ بیں گیدی خر مرد

مولوی بیکدل کا کہنا ہے کہ جب نادرشاہ لاہور میں فروکش تھا تو نواب زکریا خان کی طرف سے

مولوی محمد ابراہیم چشتی کو مجرائے نادری اور سلامِ شاہنشاہی ادا کرنے کا حکم ہوا۔ اس موقع پر مولوی صاحب نے شہنشاہِ ایران کی خدمت میں ایک قطعہ پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر خلعتِ فاخرہ اسپِ ایرانی، بازینِ طلائی اور "حسانِ عجم" کا خطاب دیا۔ مولوی یکدل کے الفاظ میں:

"در زمانی کہ نادرشاہ در شالامار بود نواب صاحب، مولوی صاحب را حکم مجرا دادند۔ لاجرم این قطعہ را ذریعہ ملازمت نمودہ چارہ تہی دستی شمردند۔

نظم:

ایا اہلِ ذوق و خذو من لسانی | کلاماً لطیفاً کدرٍ ثمینا
کہ چوں شاہِ ایراں شہنشاہِ گیتی | ملیکاً، قدیراً، نصیراً، معینا
کمر بست در حفظِ عالم چو گردوں | برب شدید القوی مستعینا
شدش والی ما چو شاہانِ دیگر | مطیعاً، سمیعاً، رہینا، مُہینا
بتاریخِ ایں سال گر دیدہ ناطق | سیاقِ فتحنا لک فتحاً مبینا

دیکصد نادر سرخ و خلعت یازدہ پارچہ و کمراس اسپ ایرانی بازینِ طلا، سرفراز نمودہ احسانِ عجم فرمودند۔"[۱۱]

مولوی محمد ابراہیم چشتی فارسی کے علاوہ اردو زبان کے بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام پنجاب میں اردو کا ایک نادر نمونہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی بالارزش تصنیف "پنجاب میں اردو" میں آپ کی ایک اردو نظم دی ہے۔ مولوی محمد ابراہیم چشتی "خوشدل" تخلص کرتے تھے۔ آپ کی مذکورہ نظم پنجاب میں بے حد مقبول رہی ہے جو کہ درج ذیل ہے:

چرخہ نامہ

عشق کے غم سوں ہوں محزوں | آہ! دنیا سب مکر و فسوں
جو توں چاہے قادر کوں | اس عالم سوں ہو بیروں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں | چل رے چرخے چرّخ چوں

نابود سبھی آہ ہستی ہے   بنیاد فرازش پستی ہے
دولت، خواب کی مستی ہے   مت کر اتنا شور و جنوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

تن چرخہ بودھیا ہے مار   میل کیا اس کا کرتار
بھور نیا رے ایسی پار   پیرے دوار کاتے توں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

آہ جیو میرا بھیا دیوانہ   دنیا ساتھ بہت بھتانا
بھول گیا اسے ادنا جانا   اب کیا اس کا فکر کروں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

کدھر گئے گور اور بہرام   کدھر گئے صیاد اور دام
کدھر گئے جمشید اور جام   کدھر گئے گنج اور قارون
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

کدھر گئے حضرت یعقوب   کدھر گئے یوسف محبوب
کدھر گئے طالب مطلوب   کدھر گئے لیلیٰ مجنوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

او بے خبر (از) ارض و سما   جاں (ہے) مرغِ اسیر فنا
نوک ، نامِ خدا   آخر عدم ہے دنیا دوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

کہاں سکندر ہے سلطان   دارا کہاں رفیع الشان
سب جگ کوں، فانی جان   چھوڑ ، نہ کر مکر و فسوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

خودی تکبر سبھ کچھ چھوڑ   مت کر اتنا غوغا شور
جیسے چرا ہے کا روڑ   ماٹی ہوا ہو، نا کر ہوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

جو غفلت کے مدھ ماتے ہیں   عصیاں سوں باز نہ آتے ہیں
پھر روزِ جزا پچھتاتے ہیں   یہ محکم رکھ دل میں مضموں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

ایہہ دنیا ہے سفر سرائے   غافل ہو مت آنکھ بچائے
پونجی کھوئی چلے پچھتائے   پھر نہیں آوے ہاتھ کبھوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

جو زاہد زہد نما ہوں گے دل پتھر اہل ریا ہوں گے
شرمندہ روزِ جزا ہوں گے رو راست ریا سے ہو بیروں

کدھر کی بودھیا کدھر کاتوں
چل رے چرخے چرّخ چوں

کدھوں بیٹھے بیچ عماری کدھوں پھرتے نال سواری
فکرِ معیشت گھر کی خواری تس پر دیکھو غمُ اور خوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

خوشدل قسمت پر قانع ہو ہنکار سوں دل کوں مانع ہو
بندۂ قدرت صانع ہو کسی سوں کیا مطلب تجھ کوں

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرّخ چوں

یہ نظم حافظ محمود شیرانی نے اپنے دوست پروفیسر آذر کی مملوکہ ایک بیاض سے حاصل کی تھی جس میں اس نظم کی کتابت اور قرأت کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ بے شمار الفاظ حل طلب ہیں جنہیں بغیر کسی دوسرے نسخے یا ماخذ کی مدد کے حل کرنا محض قیاس آرائی ہوگا۔ الفاظ کے علاوہ بعض بند نظم کے بنیادی وزن اور بحر سے ہٹ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر بند نمبر ۳، ۵، ۱۱، ۱۴، اور ۱۵۔ ان اشعار کو ذراسی توجہ سے درست کیا جاسکتا ہے لیکن تحقیق کی زبان میں اسے تحریف سمجھا جائے گا جو مناسب نہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے اس نظم پر اظہار رائے کرتے ہوئے اسے استعاراتی یا اخلاقی نظم قرار دیا ہے۔ حافظ صاحب کے بقول اس نظم میں "دنیا کو بڑھیا اور جسم انسانی کو چرخہ تصور کیا گیا ہے"[۱۲]

راقم الحروف نے بھی مولوی مسعود علی چشتی کی زبان سے اس نظم کے کچھ اشعار سنے تھے لیکن ان کے پاس اس کا کوئی نسخہ نہیں تھا جس سے اس نظم کی صحت کا اطمینان کیا جا سکتا۔

اس نظم سے متصوفانہ افکار کے علاوہ اس دور کا معاشرتی شعور اور سیاسی احساس بھی جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر چودھویں بند میں "فکرِ معیشت گھر کی خواری" والا مصرع اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں پنجاب کی معاشرت صورتِ حال کا آئینہ دار ہے۔ خود اس نظم کا صوفیانہ لہجہ اور تسلیم و رضا کے مضامین اس دور کے سیاسی ماحول کا ردِ عمل ہیں۔

۲۔ مولوی غلام حسین چشتی متخلص بہ حُسین

مولوی غلام حسین چشتی، مولوی محمد ابراہیم خوشدل چشتی کے فرزند تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ ہمہ تن یادِ حق میں مصروف اور اپنے نام کی نسبت سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے تصور میں فنا فی الحسین تھے۔ حضرت فخر الدین فخرِ عالم چشتی سے بیعت تھے۔ پیرِ روشن ضمیر نے عشقِ حسین کی آگ جو اُن کے اپنے دل میں تھی اس طالبِ صادق کے دل میں بھی روشن کر دی اور انہیں غلام علی سے غلام حسین بنا دیا۔ زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں بسر کر کے مشاہدے کو وسعت دی۔ اہلِ باطن کے فیضِ محبت سے باطنی مدارج حاصل کیے۔ مولوی نور احمد چشتی لکھتے ہیں کہ مولوی غلام حسین سات برس تک اپنے مرشد حضرت فخرِ عالم کی خدمت میں رہے اور بارہ سال اجمیر شریف میں "باولے چلّہ دوازدہ سالہ مصروف بعبادتِ حق رہے"۔ فنا فی الحسین کی کیفیت بیان کرتے ہوئے مولوی نور احمد چشتی نے لکھا ہے:

> "چونکہ بیعت ان کے کا ماہ محرم اور جلسہ عزاداریِ حسینؓ تھا۔ آپ جب تک زندہ رہے تو آپ کا یہی حال رہا کہ اگر نام تک حضرت امام حسینؓ کا یہ غلام حسین سُن لیتے تو دو دو گھنٹے تک آپ کو حالت وجد رہتی"۔[۱۱]

اس حبِ حسینؓ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی غلام حسین چشتی کے خاندان میں مرثیہ و سلام لکھنے کی رسم آ گئی۔ مولوی یکدل اور مولوی نور احمد چشتی کے کہے ہوئے اردو مرثیے متفرق یادداشتوں میں

موجود ہیں جن کا تذکرہ اپنے اپنے مقام پر ہوگا۔

مولوی غلام حسین چشتی خود بھی شعر کہتے تھے۔ اکثر پنجابی میں اور کبھی کبھی اردو میں۔ اس زمانے میں رواج تھا کہ شاگرد، استادوں کو عید ملنے جاتے تھے اور نقد و جنس بطور ہدیہ نذر کرتے تھے۔ استاد جواب میں ان کو رنگ برنگ کاغذوں پر لکھ کر عید کے مبارک باد کے اشعار دیتے تھے۔ ہندو اور غیر مسلم طالب علموں کو ان کے تہواروں پر یہ مبارکنامے دیے جاتے اور ہدایہ وصول کیے جاتے تھے۔ مولوی غلام حسین چشتی کی لکھی ہوئی عیدیاں اور دیوالی نامے مولوی یکدل کی بیاضوں میں موجود ہیں۔ مولوی غلام حسین چشتی نے اپنے اشعار خود جمع نہیں کیے۔ جس طرح صاحبِ تحقیقاتِ چشتی نے لکھا ہے وہ آخری عمر میں بالخصوص علائقِ دنیوی سے قطع تعلق رہے۔ مولوی صاحب کے اشعار ان کے شاگردوں، دوستوں اور ہم عصر ارادت مندوں کی زبان پر تھے۔ ان کی وفات کے بعد انہوں نے خود آ کر ان کے بیٹے مولوی یکدل کو یادداشت کروائے اور یکدل نے انہیں بیاضوں اور روزنامچوں میں محفوظ کر کے حیاتِ جاوداں بخش دی۔

ذیل میں ان کا اردو کلام درج کیا جاتا ہے:

دیوالی کی اٹھکیلیاں کیا کہوں
ٹھٹھک اور لچک بھوشاں کیا کہوں
چراغوں کی جگمگ ستاروں کی ضو
عجب سج ہے اور دھج یہاں کیا کہوں[۱۵]

"گیت کہ جناب بابا قدس سرہٗ یکپاس شب باقیماندہ میخواندند، امروز زبانی سائیں غلام حسین خیاط شنیدم"[۱۶]

یَس من چاہ کرو میرے کام سنوار دیو پل میں
جب آن بنے تب مان رکھو ترے نام کی مالا پڑی گل میں
محبت چیں گر سُب گھنیے جیا جنت جیس جل بیں تھل میں
ابوطالب کے تم نر بنس بہادر مرے کام سنوار دیو پل میں

اس کبت کا موضوع مناقب حضرت علی علیہ السلام ہے۔ مولوی صاحب کو خانوادۂ رسولؐ سے جو عشق تھا اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

۴۔ فخر الشعراء مولوی احمد بخش چشتی المتخلص بہ یکدلؔ

پچھلے باب میں مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے سوانح پر مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ اس موقع پر محض ان کے ادبی کارنامے زیرِ بحث آئیں گے اور مولوی صاحب کی شخصیت کے پس منظر میں ان کا مطالعہ کیا جائے گا۔

مولوی صاحب نے لکھا ہے ان کی ولادت کی تاریخ ان کے جدِ امجد مولوی محمد ابراہیم چشتی نے "با احمد بخش یکدل لطفِ یزداں" کے مصرع سے موزوں کی تھی۔ جب یہ تاریخ انہوں نے اپنے دوست میر تھو شاہ کو سنائی تو انہوں نے کہا کہ بچے کا نام احمد بخش اور تخلص یکدل ہوگا:

"میر تھو شاہ کہ نام ایشاں امیر بخش بود، نام بندہ بر بخش خیال کردند و فرمودند
کہ مرا از استخارہ معلوم شد کہ او فقیر و شاعر و ناثر باشد۔ پس تخلص ہم از
جانب بندہ یکدل باشد"[۱۷]

یہ محض توارد تھا کہ امیر بخش سے احمد بخش اور مولوی محمد ابراہیم چشتی کے تخلص خوشدلؔ کی مناسبت سے یکدلؔ دونوں نام ایک مصرع میں جمع ہو گئے۔ مولوی یکدل بچپن ہی سے خود کفیل اور خود ساختہ انسان تھے۔ والد کی گھر سے مسلسل غیر حاضری اور ماں کی تعلیم کی طرف رغبت اور تعمیرِ اخلاق میں جانفشانی نے یکدل کی شخصیت کو جلا بخشی۔ مولوی یکدل سے پہلے ان کے جتنے بہن بھائی پیدا ہوئے، سب فوت ہو گئے:

"بیگم بی بی و حبیب اللہ و قادر بخش و رکھی وغیرہ خواہران و برادران من شدند
اما ہیچ کس نماند، الا من"[۱۸]

اس اعتبار سے یکدل ایامِ طفولیت سے ہی احساسِ تنہائی کا شکار رہے۔ احساسِ تنہائی، باپ کی سرپرستی سے محرومی اور گھریلو ذمہ داریاں، زندگی نے ایک ایسی مثلث بنا دی تھی جس کے ہر زاویے نے

ان کے مستقبل کی تعیین میں حصہ لیا۔

اس محنتِ شاقہ اور شوقِ تحصیل نے مولوی یکدل کو اس قابل بنادیا کہ وہ پندرہ برس کی عمر میں صاحبِ تالیف اور سترہ سال کی عمر میں باپ اور دادا کی مسندِ درس پر متمکن ہوگئے چنانچہ "مسرت نامہ" کی تالیف کے بارے میں مولوی صاحب نے لکھا ہے:

"در ایامِ خوردی در باب لاہور کہ وطن من است بجناب باری مناجات کردہ بودم:

گلِ یکدل در آن داری مہ و سال
نگہداریش از اکرام و افضال

و آن کتاب "مسرت نامہ" کتابی عجائب است و من عاجزم و گفتہ بودم کہ:

بحنت ہای جانکہ تمام کردم
مسرت نامہ این را نام کردم

و این کتاب در عمرِ پانزدہ سالگی تصنیف کردہ بودم و آن ہشت جزو است"[۱]

مسرت نامہ فارسی زبان میں منظوم کتاب ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرہ سال کی عمر تک یکدل فارسی زبان میں قابلِ توجہ شاعری کی قدرت پیدا کر چکے تھے۔

یکدل نے جس محنت اور ریاضت سے خود پڑھا تھا وہ محنت اور جانکاہی وہ اپنے شاگردوں میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ تدریس میں وہ سرزنش اور سخت گیری کو طالب علم کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ امرناتھ اکبری نے استاد کی سخت گیری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"درین سال (۱۸۲۸ء) من آہوی صحرائے بےادبی را بہ مکتب سپردہ بتادیبِ ادیب سراپا ادب مقرر نمودہ۔ عمّ کدارناتھ از فیضانِ عامِ سرمایۂ دانش و صفوت مولوی غلام حسین چشتی تربیتِ عام و علم فائز شدند۔ نظر بہ وارستگی ام توجہ

زیاراتِ خواجہ معین الدّین چشتی بہ اجمیر گشتند۔ مرا خلف رشیدش مجموعۂ فضائل و کمالات مخدومی و مطاعی مولوی احمد بخش چشتی برای اکتساب علومِ موروثی و مکتبی تقید نمودند۔ استاذم حفظِ جاہم نگہ نداشتی و پدرم نیز بہنگام الغیاث بفریاد مرا ندیدی۔ تخمِ عداوت در دل می کاشتم و بمکافات مستعد بودہ از زندانِ دبستان نجات آرزو می کردم۔ چوں دانش رسمیم دامن گرفت و بامتیاز سپید و سیاہ فرحت اندوختم، حالیا استاذ را بری ستایم و ہمہ اوقات بپاداش آن رنج اگبنہا برای آن می اندیشتم۔[۱۰]

اس اقتباس میں مولوی یکدل کی دو خصوصیات نمایاں طور پر بیان کی گئی ہیں:

۱۔ ادیبِ سراپا ادب

۲۔ حفظِ جاہم نگہ نداشتی

اور یہی دو خوبیاں ایک اچھے استاد کا بنیادی جوہر ہیں۔ مولوی یکدل کو معلمی ورثے میں ملی تھی اس لیے بڑے سے بڑے منصب کو وہ معلمی کے سامنے کمتر سمجھتے تھے۔ اپنے شاگردوں کے دماغ سے "حفظِ جاہ" والی بُو تو وہ خود نکالنا چاہتے تھے اور اس میں وہ کس حد تک کامیاب رہے، اس کا اندازہ دیوان امرناتھ اکبری کی شخصیت اور علمی کارناموں کے مطالعے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ "معلمی کے امتیاز" کی مناسبت سے اس واقعے کا بیان بھی بے محل نہ ہوگا کہ مولوی یکدل کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے دربار میں کوئی منصب دینا چاہا تھا جس پر انہوں نے مہاراجہ سے عرض کیا کہ میری ماں کا حکم ہے کہ "پیشہ آبای تو معلمی ست نہ کر چاکری"۔ اس واقعے کو یکدل نے اپنی یادداشتوں میں کئی جگہ اشارۃً بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی نور احمد چشتی نے بھی اس واقعے کو مولوی احمد بخش یکدل کے بیان میں نمایاں جگہ دی ہے۔[۱۱]

اس ذوقِ تعلیم و تعلم نے ان کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ۱۸۱۸ء میں جب ملتان کی فتح کے بارے میں خط لکھا تو ان کی انشا پردازی اور فضیلتِ علمی کا نہ صرف خالصہ دربار میں بلکہ لاہور کے خواص و عوام کے دلوں میں بھی ڈنکا بجنے لگا۔ عزت اور شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ شاگردوں اور قدردانوں

کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان کے صلبی بیٹے مولوی نور احمد چشتی اور ان کے روحانی فرزند دیوان امرناتھ اکبری کی شعری اور نثری کاوشیں منظرِ عام پر آئیں، جن میں یکدل کی شخصیت نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔ اس سے بھی ان کی قلمرو شہرت و شناخت کی سرحدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں جب مولوی یکدل دہلی گئے تو ان سے پہلے ان کی علمی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے دربار میں اس "ادیبِ سراپا ادب" کو شاہانہ سلف کی روایت کے مطابق خوش آمدید کہا۔ چنانچہ مولوی یکدل نے اس واقعے کو یوں قلم بند کیا ہے:

این قصہ بر شہِ بہادر — از بہر ملوک بی بہادر
گفتند کہ آمد از لاہور — چشتی یکدل فقیرِ مشہور
او کرد بمن عنایتِ خویش — دادہ شرف از ولایت خویش
بہر خلعت خاص لطف آمود — از فیل و فرس عنایت افزود
بارید بمن ز بحر جوشی — مانع نشد از گلیم پوشی!
چون دید کہ این فقیر ہندی ست — شوریدہ و مائل بہ رندی ست
آزاد کیش بہ دل نشستہ — از بند رسوم باز رستہ
بابی ز توجہات خود خواند — در خلوتِ خاص خویش بنشاند

اس سفر میں جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا، مولوی یکدل کے ہمراہ ان کے بیٹے مولوی نور احمد چشتی بھی تھے۔ باریابی اور پذیرائی کی شان اور کیا ہوگی کہ بادشاہ نے یکدل کے لیے "فیل" اور ان کے بیٹے کے لیے "فرس" کی سواری بھیجی۔ مولوی یکدل نے ذریعہ ملازمت کے طور پر ایک مرصّع نعت بادشاہ کی خدمت میں پیش کی جو اسی موقع کے لیے لکھی گئی تھی۔ یہ نعت "تحفۂ یکدل" میں بہ تمام و کمال محفوظ کر دی گئی ہے۔ اس نعت میں مولوی یکدل نے اپنی قادر الکلامی اور نادر البیانی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ نعت کا ہر بند شاعر کے علم و فضل کا غماز ہے۔ پوری نعت ضمیمے میں موجود ہے۔ یہاں محض دو بند بطور تبرک درج کیے جاتے ہیں:[۲۲]

امامِ الانبیا والمرسلین آں قائدی رہبر
کہ زو نقشِ وجودِ او بسطرِ کاف و نون مسطر
بذات و باصفات از حق زہر کاں مقرب تر
نہ فرطِ اقترابِ او ملک حیران فلک مضطر

دقیقِ فرقۂ من ربہٗ من ذابہٗ ضاہا

نفیس انفسِ عالم کہ در تحقیق رجحانش
کمالِ صورت و معنی مرتب کردہ برہانش
بصدرِ مرصد تبلیغ مایوحیٰ زاقرانش
نیر زد ہیچکس را ادّعاء منزل وشانش

نعمّا قیل ہذا شمسِ فضل وہم کواکبہا

اس موقع پر مولوی احمد بخش یکدل کو بہادر شاہ ظفر سے فخر الشعراء کا خطاب، خلعتِ سیزدہ پارچہ اور دو رقم جواہر عطا ہوئے۔ بادشاہ نے خطاب کی مہر بدرالدین مہرکن سے کندہ کروا کر دی۔ اس کے علاوہ آپ کے صاحبزادے مولوی نور احمد چشتی کو بھی خلعتِ ہفت پارچہ عطا ہوا۔[۲۳] خطاب کی عبارت جو مہر پہ کندہ کی گئی، حسبِ ذیل ہے:

"فضیلت پناہ، یکدلی آگاہ، فخر الشعراء مولوی احمد بخش یکدل فدوی محمد بہادر شاہ، بادشاہ غازی ۱۲۵۸ھ"[۲۴]

قیامِ دہلی اور قلعۂ معلیٰ میں باریابی سے مولوی یکدل کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے دہلی کے ادبی ماحول کا بغور مطالعہ کیا۔ اپنی بیاضوں میں انہوں نے اہلِ دہلی کی فصاحت کی بہت تعریف کی ہے۔ انہوں نے دربار سے منسلک اور دیگر نامور شعرائے دہلی سے ملاقاتیں کیں۔ ان سے روابط پیدا کیے اور ان کے کلام سے متاثر ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ دہلی سے واپسی کے بعد انہوں نے اردو نثر و نظم کی طرف خاص توجہ دی، ورنہ اس سے پہلے کی ان کی اکثر تحریریں فارسی زبان میں ہی ملتی ہیں۔ دہلی کے ہم صحبت

شعراء میں انہیں خاص طور پر استاد محمد ابراہیم ذوق نے متاثر کیا۔ چنانچہ ۱۵۔ نومبر ۱۸۵۴ء کو جب ذوق نے وفات پائی تو مولوی یکدل نے فارسی میں قطعہ تاریخ موزوں کیا جو "کوہِ نور لاہور" کے ۲۔ جنوری ۱۸۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس قطعے کے ساتھ فارسی زبان میں لکھا ہوا یکدل کا ایک خط بھی ہے جس میں انہوں نے منشی ہرسکھ رائے مہتمم اخبار کو لکھا ہے:

"از مطالعۂ نسخۂ اخبار کہ از نتائج طبع اقدس ہر ہفتہ انطباع می پذیرد، دریافتِ تواریخ وفاتِ میاں ذوق نمودہ، بیاد صحبت ہای شاہجہان آباد بسیار تاسف کردہ"۔

اس کے علاوہ اشعار میں بھی ذوق سے دوستی کا ذکر موجود ہے۔ یہ قطعہ بہت طویل ہے، آخری چار شعر درج کیے جاتے ہیں[۵]:

بگو اے یکدل احمد ز سالِ فوت آں شاعر
کہ بُد در شاہجہان آباد جنّت در خیالِ او
بذوق و شوق احمد چونکہ مستثنیٰ دوراں بود
ازاں شد "ذوق و شوقِ احمد" از تاریخِ سالِ او

۱۲۷۱ھ

دوبارہ موج زد بحرِ طبیعت در بکف آمد
بگوشِ سامعین آویزہ بادہ سالِ حالِ او
بتائیدِ امیرالمومنین و فخرِ حق یکدل
بجنّت رفت مومن آمدہ سالِ وصالِ او

۱۲۷۱ھ

مولوی احمد بخش یکدل کی پہلی تصنیف "مسرت نامہ" (تالیف ۱۸۱۲ء سے ۱۸۶۶ء تک ابھی سال یکدل پر فالج کا حملہ ہوا) ہے۔ وہ بلا ناغہ تصنیف و تالیف کا کام انجام دیتے رہے۔ اس لحاظ

سے یکدل کی علمی اور تصنیفی زندگی کا دور نصف صدی پر محیط ہے بلکہ اس سے بھی متجاوز ہے۔ اس عرصے سے متعلق یکدل کے علمی اور ادبی کاموں کی جو فہرست دستیاب ہوئی، درج ذیل ہے:

۱۔ مسرت نامہ : فارسی

مثنوی کی ہیئت میں۔ لاہور کی تعریف اور اس کی خوشحالی اور آبادی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مناجات اس کتاب کا موضوع تھا۔ کتاب آٹھ اجزاء پر مشتمل تھی۔ راقم الحروف کے مطالعے میں نہیں آئی۔ باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہو سکی۔ چشتی خاندان کے کسی فرد کے پاس اس کتاب کا سراغ نہیں ملا۔

۲۔ واسع باری

خالق باری کی طرز پر لکھی ہوئی لغات کی کتاب ہے۔ فارسی الفاظ کے پنجابی مترادفات دیے گئے ہیں۔ اس کی بحر بھی خالق باری کی ہے۔ مولوی یکدل کے شاگرد دشو دت نارائن کے ہاتھ کا کتابت کیا ہوا ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی میں محفوظ ہے۔ سائز ۸ × ۵.۵۔ کاغذ سیالکوٹی خط شکستہ ناپختہ۔

۳۔ دیباچہ دیوان سبحان اللہ حقیر : فارسی (بخطِ یکدل)

مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (ذخیرۂ شیرانی مخطوطہ نمبر ۴۲۲)، سبحان اللہ حقیر کے دادا مولوی فتح محمد ایک نیک آدمی تھے یکدل نے دیباچے میں انہیں مظہر حق، صاحب بیعت، متصوّف اور تصوف میں بیشقدم لکھا ہے۔ یکدل کے خیال میں صاحب وجد و حال خاندان کے فرد سبحان اللہ حقیر کے کلام کو اسی ماحول میں سمجھنا اور پرکھنا چاہیے۔ "بندہ احمد بخش چشتی یکدل بصاحب دیوان گوینہ یکدلی دارد"۔ کا جملہ واضح کرتا ہے کہ حقیر، یکدل کے دوستوں اور

ہم مشورہ شاعروں میں سے تھے۔

دیباچے کا مسودہ دیوان سے بالکل الگ ہے۔ دیباچے کی عبارت ختم ہونے کے بعد یکدل نے اپنی چار دو غزلیں نقل کی ہیں۔ یہ غزلیں "بیاضِ اشعار" اور "دیوانِ اردو" (نامکمل) میں بھی موجود ہیں۔ دیباچہ دیوان سبحان اللہ حقیر کی کتابت کا سال ۱۲۵۸ھ ہے۔ خاتمے کی عبارت یوں ہے:

"۴ ر شہر ربیع الاول ۱۲۵۸ ہجری مقدس مطابق پنج بیساکھ ۱۸۹۹ سمت در حضرتِ لاہور حرسہا اللہ قلم برداشتہ مرقوم شد۔ فقط:

تقطیع: ۸×۵ ۔ کاغذ سیالکوٹی، بوسیدہ۔"

۴۔ سوانح عمری مخدوم علی ہجویری (حضرت داتا گنج بخش) لاہور، رحمۃ اللہ علیہ

فارسی: بخطِ یکدل۔ نامکمل۔

آغاز: اما بعد فیقول العبد المفتقر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ احمد بخش چشتی الذی تخلص المشہور یکدل ابن غلام حسین بن محمد ابراہیم الچشتی الاجودھنی ثم اللاہوری۔

اختتام: ناقص الآخر

تعداد اوراق: دس ؛ کاغذ: سیالکوٹی درجہ دوم

تقطیع: ۸ × ۵،۵

مملوکہ: کتابخانہ شخصی راقم الحروف

۵۔ رسالہ چہار خانوادہ: فارسی۔ بخطِ یکدل

بپاسِ خاطر: فقیر کرم بخش نوشاہی

آغاز: میگوید خاکپائے درویشان فقیر احمد بخش متخلص بہ یکدل لاہوری در سنہ دوازدہ صد و چہل و چہار ہجری۔

اختتام: ہر کہ اسامی این دوازدہ آیمہ و چہاردہ معصوم و اصحاب کبار و
پنجتن پاک رضی اللہ عنہم نداند او را کسوت درویشی و لقمہ درویشی
و امامت کردن و داخل شدن در سلسلہ محمدیہ روا نباشد۔
المنۃ للہ این صحیفہ ۱۹ ماہ شعبان المعظم ۱۲۴۴ھ در حضرت لاہور
مرقوم شد۔

تقطیع: ۸ × ۵، ۵ء۵ ۔ کاغذ سیالکوٹی ۔ کرم خوردہ

مملوکہ: کتابخانہ شخصی راقم الحروف

۶۔ بیاض کلام اردو: اردو ۔ بخط بیدل

لوح، مطلا، مجدول ۔ کاغذ انگریزی

اس بیاض میں مولوی احمد بخش بیدل اور مولوی نور احمد چشتی کا ملا جلا کلام ہے،
مولوی بیدل کی صرف آٹھ غزلیں ہیں ۔ پہلی غزل کا مطلع ہے:

گل کے تئیں دید سے تیری پڑے لالے بلبل
تو پڑے گی کس صیاد کے پالے بلبل

جلد: چرمی : کار چپہ ۔ عمل بہاؤالدین پشاوری

تقطیع: ۸ × ۵ مکتوبہ: ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء

مملوکہ: کتابخانہ شخصی راقم الحروف در لاہور

۷۔ دیوان غزلیات اردو: اردو بخط مولوی محمد علی چشتی فرزند بیدل

مکتوبہ: ۱۸۶۶ء در حیات مصنف

تعداد غزلیات اردو: ۱۴

نظم، بعنوان عید: ۱

قطعہ بند: ۱

متفرق اردو اشعار

کاغذ: انگریزی، آبی رنگ

خط: متوسط تقطیع: ۴x۶

مملوکہ: کتابخانۂ شخصی راقم الحروف۔ در لاہور

۸۔ انشائے بیدل: فارسی بخطِ بیدل

آغاز: "اما ل تقدیم محمدت قدیمی مفتاح گنجینۂ مقال تواند بود کہ مانند انفاس جدید کہ بر سبیلِ تعاقب و دعایم کاخ وجودِ انسانی خاکی بنیان میگردد۔

اختتام: ناقص الآخر

کاغذ: سیالکوٹی درجہ اوّل

تقطیع: ۵x۸

مملوکہ: کتابخانۂ شخصی راقم الحروف در لاہور

۹۔ رسالہ شمسیہ: بخطِ بیدل

مکمل کتاب مفقود ہے۔ یہ کتاب فقیر سید شمس الدین کے ایما پر لکھی گئی۔ اسی لیے ان کے نام کی رعایت سے اس کا نام رسالہ شمسیہ رکھا گیا۔ اس کا دیباچہ فارسی اور اردو میں لکھا ہوا موجود ہے۔

فارسی دیباچہ وزیری سائز کے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز حمد و نعت کے مرصّع اور مسجّع جملوں کے بعد یوں ہوتا ہے:

"اما بعد فیقول العبد المفتقر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ احمد بخش الذی تخلّصہٗ المشہور بیدل ابن غلام حسین ابن محمد ابراہیم الحنفی الچشتی الاورنگ آبادی، اللّٰھم نور قلبہٗ بنورِ معرفتک"۔

یہی دیباچہ اردو میں لکھا ہوا ہے جو صرف ایک صفحے پر ہے۔ کاغذ دیسی ولایتی سائز وہی یعنی وزیری۔ حمد و نعت کے بعد درج ذیل عبارت ہے:

"چونکہ دیباچہ اس کتاب کے لیے بطن تلمیع یعنی تازی و دری ملمع پایا۔ اب بحکم ممدوح اشہبِ قلم کو اردو زبان میں مہمیز دیتا ہوں کہ یہ کتاب اس واسطے قیدِ تدوین میں آئی ہے کہ جو مکان زیارت گاہ سلطنت لاہور میں ہیں، ان کا حال ابتدا سے انتہا تک لکھوں اور اس باب میں بہت سی تکلیفیں اٹھائی گئیں:

تیرا شگفتگی پہ دل آیا ہے یکدل اے غنچۂ فسردہ تجھے بھی ہوا لگے

اور یہ خیال ہوا کہ شاہانِ سلف کا حال اور ان کے تولّد اور جلوس اور وفات اور مدفن کی کیفیت لکھی جاوے اور یہ بھی ہو کہ جو خاندان دو لبسرونکا ہے اور خوانین بلند مکان کا مذکور اور عمارات قدیم مساجد اور معابد کا حال مشروحاً کتاب میں آوے تو اس میں تین باب ٹھہرے۔ چوتھا باب عجائبات، اقوال اور افعال نیکوں کا اور قابلوں کا کہ موجب تفنن طبع ہو، ترتیب پایا اور یہ کتاب بنام نامی اسم گرامی سید الشرفاء فقیر شمس الدین بخاری تصنیف ہوئی۔ موسوم برسالہ شمسیہ، معروف ہوئی۔ ناظرین اس کے مطالعہ سے حظ اٹھاویں اور حرف گیری نکریں۔"

آدمی از سہو و خطا پاک نیست
آبِ رواں بے خس و خاشاک نیست

تاریخ ندارد

اس کتاب کا اردو مسودہ اور دونوں دیباچے راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔ مسودے کا خط شکستہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ یکدل نے پاک نویس کرنے کے

بعد مسودہ ضائع نہیں کیا۔ مدوّن کتب دستیاب نہ ہونے کی صورت میں مسودے کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مسودے کے ورق ۱۶ ب پر بہادر شاہ ظفر کی طرف سے دیے گئے خطاب فخر الشعراء کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ یہ خطاب حضرت فخر عالم فخر الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات موزوں کرنے پر ملا تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر سے اپنی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"تاریخ حضرت مولانا (فخر الدین، فخر عالم) بمن فرمودند۔ گفتم کہ از حضرت مولانا پر سیدم، فرمودند : "مولوی فخر الدین محترم"۔ چون شمار کردند تاریخ سالم بود۔ بخلعت یازدہ پارچہ و سرپیچ مرصع و مالائے مروارید و خطاب فخر الشعراء و بتوجہ باطنی مثل بعضی اشغال سرفراز فرمودند۔"

فقیر سید شمس الدین، فقیر سید عزیز الدین کے بھتیجے اور فقیر سید نور الدین منور کے بیٹے تھے سر لیپل گرفن نے ان کی شائستگی، تہذیب اور فارسی زبان پہ قدرت اور حسن بیان کی تعریف کی ہے[۱۸] یہ مسودہ راقم الحروف کے ذاتی کتاب خانے میں محفوظ ہے۔

۱۰۔ احوالِ افغانستان

سیالکوٹی کاغذ پر شکستہ خط میں مولوی احمد بخش یکدل کے اپنے قلم کا لکھا ہوا مسودہ ہے مولوی یکدل نے دیباچے میں بتایا ہے کہ یہ مسودہ تاریخ افغانستان مصنّفہ امام الدین حسین چشتی کا خلاصہ ہے جس میں ۱۲۱۲ھ تک افغانستان کے اوضاع و احوال قلمبند کیے گئے ہیں۔ یہ مسودہ ناقص الآخر ہے۔ نواب خان بہادر یعنی نواب زکریا خان حاکمِ لاہور کی وفات پر کسی معاصر کی کہی ہوئی تاریخ پر ختم ہو جاتا ہے۔

کاغذ : سیالکوٹی

سائز : ۶ × ۱۰ کل ورق : ۱۲

مملوکہ : کتابخانہ شخصی راقم الحروف

۱۱۔ بیاضِ اشعار : اردو (بخطِ مصنف)

یہ بیاض مولوی احمد بخش یکدل نے ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء مرتب کی۔ اس بیاض میں اپنا اور اپنے معاصر شعرائے پنجاب و دہلی کا اردو کلام درج کیا گیا۔ اس کے علاوہ اساتذۂ اردو کا کلام بھی موجود ہے۔ گویا یہ بیاض اردو اشعار کی ایک ایسی جُنگ ہے جس سے مولوی یکدل کے ذوقِ شعری کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ نیز یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں شعر کے قابلِ انتخاب اور ناقابلِ انتخاب ہونے کے کیا معیارات ہیں۔

یہ بیاض ۵" × ۱۱" کے تقریباً ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ سیالکوٹی درجہ متوسط۔ تمام مندرجات دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہیں البتہ کاغذ پر پانی کے دھبے اس پر گذرے ہوئے مصائب کی غمازی کرتے ہیں۔

مولوی یکدل نے اپنے علاوہ جن اردو شعراء کا کلام اس بیاض میں منتخب کیا ہے ان کی فہرست درجِ ذیل ہے :

کانجی مل صہبا	مرزا راجہ شنکر ناتھ
غلام حسین خاں صبر کشمیری	صدق حیدرآبادی
صفدر راز سونی پت	ضمیر (شاگرد نظیر)
گنگا داس دہلوی	ضیا دہلوی
چھنو لال طرب	بہادر شاہ ظفر
مرزا عالی سلاطین	نزاکت رجو
گنا بیگم	نواب بخت خاں
دلہن بیگم	میاں ذوق
ذوقی رام	ذوقی شاہ

راقم	راغب
رافت	امید خاں انجام
آشفتہ	نواب یحییٰ خاں آصف الدولہ مرزا الٰہی ۔
آفتاب، شاہ عالم	نور خاں آگاہ
ٹھاکر رام تسلی	اٹل (جعفر زٹل کے شاگرد)
اثر (برادر میر درد)	تعشق
غلامی	میر درد
عظمت اللہ میر بھکاری خاں	میر ناصر خاں محزون
آسی، روشن بیگ	امانت رائے ساکن دریبہ
میاں بحر	میاں نصیر الدین نصیر
واقف	وزیر علی وزیر
جوان مرد	آفتاب خاں منیر
منشی میر حسین	منشی مولچند
میر فخر الدین منت	مرزا علی مہلت
ناجی	نالاں، میاں عسکری
ناظم لکھنوی	حسام الدین نامی
میر مہدی داغ (فرزند میر سوز)	مرزا دارا بخت
غلام حسین خیالی	مرزا مظہر
حافظ عبدالرحمٰن احسان	مرزا خانی نوازش
محمد علی فدوی	کلیم ثناء اللہ خاں
فراق	مقصود ترہ فروش

اجودھیا پرشاد حیرت   امرناتھ شعلہ

نورجہاں (شاہجہاں آباد)

ان میں سے بعض شعراء کی پوری پوری غزلیں اور بعض کا ایک ایک شعر درج کیا گیا ہے

یکدل کا اردو کلام:

اس بیاض میں سب سے اہم اندراج یکدل کا اپنا اردو کلام ہے۔ اس بیاض میں یکدل کا سب سے زیادہ کلام دستیاب ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یکدل نے اس بیاض کی تدوین سے پہلے جہاں جہاں بھی پراگندہ یا مدوّن صورت میں اپنا اردو کلام درج کیا ہے، زیرِ نظر بیاض ان کے بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ اس بیاض میں یکدل کی اردو غزلیات کی تعداد اکتیس ہے جن میں سے پانچ غزلیں دیباچہ دیوان سبحان اللہ حقیر کے ضمیمے میں، دس غزلیں بیاض کلامِ اردو میں اور پانچ غزلیں انتخاب کلامِ اردو بخطِ مولوی محمد علی پُردل چشتی میں بھی موجود ہیں۔

یہ بیاض مولوی یکدل کے فرزند مولوی نور احمد چشتی کے زیرِ مطالعہ رہی ہے جنھوں نے بعض اشعار تبدیل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مثال کے طور پہ یکدل کی غزل کا مطلع یوں تھا:

کوئی دن ہم دیکھ کر افلاک کے سایے تلے
خیمہ زن ہوجائینگے جاکر خاک کے سایے تلے

مولوی نور احمد چشتی نے دوسرے مصرعے کو بدل کر یہ صورت دے دی ہے:

خیمہ زن ہوجائیں گے پھر خاک کے سایے تلے

ایسی مثالیں دو ایک اور مقامات پر بھی موجود ہیں۔

تمام نسخہ خوشخط لکھا ہوا ہے اور مولوی یکدل کے مخصوص اندازِ تحریر کا آئینہ دار ہے۔ یہ مختصر بہ فرد مخطوطہ راقم الحروف کے شخصی کتابخانے میں محفوظ ہے۔

۱۲۔ رسالہ حرف شناسی : بخطِ مصنف

یہ مختصر رسالہ عربی زبان کے حروف اور ہجا کی شناخت پر خواتین کے لیے لکھا گیا۔ مولوی یکدل کی یہ واحد تصنیف ہے جس کا موضوع تعلیم نسواں سے متعلق ہے یہ کتاب ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں مصنف نے اپنی وفات سے دس سال پہلے تالیف کی۔ آغاز میں اعوذ باللہ، بسم اللہ اور درود ہزارہ تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"این چند صفحات برای حرف شناسی و ہجا فقیر احمد بخش چشتی متخلص بہ یکدل عفی عنہ تجویز کردہ، تا تمام صبیحہ ہا و بنات خائز فایدہ شوند۔ درینوقت بتاریخ دوازدہم۔ ماہ جمادی الثانی یعنی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمہ اللہ تعالے روز پنجشنبہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۷۔ماہ ماگھ سمت ۱۹۱۴ یعنی دیماہ الٰہی و موافق شہور عیسوی ۲۔ جنوری ۱۸۵۸ء در دار السلطنت لاہور حرسہا اللہ عن الحور بعد الکور بپاسخاطر نور چشمی بیگم بی بی عالیہ غرہا نوشتہ وباللہ التوفیق"۔

کتاب کے آخر میں چند دعائیں اور وظیفے بھی درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک وظیفہ برائے آشوب چشم حضرت کلیم اللہ شاہجہان آبادی کی سند سے درج کیا گیا ہے۔ اس کی اجازت انھوں نے مولوی غلام حسین چشتی کو عطا کی تھی۔

یہ رسالہ جس کے لیے تالیف کیا گیا ہے یعنی مسماۃ بیگم بی بی، مولوی یکدل کی بہو اور مولوی محمد علی پُردل چشتی کی اہلیہ تھیں۔ بیگم بی بی کے والد کا نام نور محمد نقاش بن حافظ محمد امین تھا۔

اوسط درجے کے سیالکوٹی کاغذ پر ۶"×۸" سائز میں لکھا ہوا یہ رسالہ ۲۲ اوراق

پر مشتمل ہے۔ اس رسالے کا نادر الوجود مخطوطہ راقم الحروف کے شخصی کتاب خانہ میں موجود ہے۔

۱۲۔ تحفۂ بکدل

تاریخِ لاہور کے موضوع پر لکھی ہوئی یہ کتاب علمی اور تاریخی قدر و قیمت کے اعتبار سے نادر و نایاب ہے۔ اس کتاب میں امیر تیمور گورگاں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر سکھوں کے عہدِ حکومت تک ہر بادشاہ کے دور کے اہم سیاسی ثقافتی اور مذہبی حالات و واقعات اور ان میں سے ہر بادشاہ کے عہد میں اولیائے چشت کے روحانی فیوض کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کا اختتام سلطنتِ کشمیر کے تفصیلی تذکرے پر ہوتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ بکدل کو اس کتاب کا مسودہ مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ کتاب مصنف کے آخری ایامِ حیات میں لکھی گئی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بکدل نے مثنوی "شرحِ احوال" پہلے اپنے روزنامچوں اور پھر بیاضِ اشعار مرتبہ ۱۲۷۸ھ میں درج کی ہے۔ اس کے بعد جب یہی مثنوی "تحفۂ بکدل" میں بھی نقل ہوئی تو زیرِ نظر کتاب میں شامل کرتے وقت اس کے کچھ اشعار میں اصلاح کر دی گئی ہے جبکہ روزنامچوں اور بیاضِ اشعار میں کسی بیت میں تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ کچھ واقعات اور عبارتیں بیاضوں سے شامل کی گئی ہیں۔ چنانچہ بیاض نمبر ۲ مکتوبہ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں نواب عبدالصمد کے ہاتھوں بندہ بیراگی کی اسیری اور میاں آفرین لاہوری کے شعر:

بندہ را عبدالصمد خاں بند کرد   آفریں صد آفریں صد آفریں

کو ورق ۱۱۵ پر جس تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے عیناً وہی تفصیل تحفۂ بکدل کے ورق ۳۲ پر موجود ہے۔

تحفۂ بکدل کے مطالعے سے جو اہم نکات نظر سے گذرتے ہیں درجِ ذیل ہیں:

۱۔ نمونۂ کلام مولوی محمد عاقل اورنگ آبادی ۔ مورثِ اعلیٰ خاندانِ چشتی در لاہور ف ۱۲

۲۔ تاریخِ وفات مولوی غلام حسین چشتی از فقیر سید عزیز الدین ف ۱۲

۳۔ تاریخِ وفات نواب زکریا خان از مولوی محمد ابراہیم چشتی ف ۲۱

۴۔ کلام مولوی محمد ابراہیم چشتی بر موقع مجرائے نادر و خطاب حسان العجم ف ۲۴

۵۔ یکدل کے نانا مولوی عصام الدین کا ذکر ف ۲۷

۶۔ تاریخِ وفات نواب عبدالصمد خان مصنفہ مولوی ضیاء الحق چشتی ف ۳۴

۷۔ احمد شاہ ابدالی لاہور میں سکھوں کے قلعہ علیار بنواتا ہے ف ۴۴

۸۔ احوالِ مصنف (منظوم) ف ۸۳

۹۔ رنجیت سنگھ کا لاہور میں داخلہ اور عمائدین کو انعام و اکرام ف ۱۰۰

۱۰۔ رنجیت سنگھ کی اخلاق سوز عادات ف ۱۰۲ تا ۱۰۳

یہ مخطوطہ ۱۲″ × ۵ ۷″ کے وزیری سائز میں ۶۵ اوراق یا ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ کاغذ انگریزی دور کا ہے اور آخری دو اوراق کے متن پر اور باقی اوراق میں سے بعض کے حواشی پہ پانی کے دھبے موجود ہیں ۔ تمام متن سالم اور طریق احسن قابلِ قرأت ہے ۔

تحفۂ یکدل کا مذکورہ بالا مخطوطہ کتاب خانہ شخصی راقم الحروف میں محفوظ ہے ۔ مقالے میں اس کے ابتدائی اوراق کے عکس شامل کر دیے گئے ہیں ۔

۱۴۔ روزنامچۂ یکدل (خطی بیاضیں)

اس روزنامچے کے مکمل کوائف راقم الحروف نے اپنی مرتبہ کتاب "یادگارِ چشتی" مولفہ مولوی نور احمد چشتی ، مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب لاہور کے باعث تحریر میں درج کر دیے تھے ۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ممتاز گوہر کے مقالے "پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء" میں بھی یہ کوائف موجود ہیں ۔ اس جگہ "یادگارِ چشتی" کے باعث تحریر کے حوالے سے ان روزنامچوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے ۔

"مولوی بیکدل مرحوم نے بیس جلدوں میں روزانہ کوائف کی یادداشتیں قلمبند کی تھیں۔ انیس بیاضیں ، ۱۹۱۷ء تک ان کے پوتے مولوی حامد علی چشتی مرحوم کے پاس موجود تھیں۔ ایک بیاض جو ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق تھی ، مولوی نور احمد نے انگریزوں کے ہاتھوں خطرۂ جان سمجھ کر ضائع کر دی تھی۔ ۱۸۹۲ء کے قریب مولوی حامد علی چشتی نے ان بیاضوں کا خلاصہ تیار کیا اور اہم واقعات کو تاریخ اور بیاض کے حوالے کے ساتھ ایک دفتر میں نقل کر دیا۔ حالات کی نامساعدت سے اصل بیاضیں جا بجا ضائع اور تلف ہو گئیں۔ انتخاب جو بجائے خود مفصل اور تمام اہم کوائف پر محیط ہے ، خوش قسمتی سے مولانا مسعود علی چشتی کے پاس محفوظ رہا۔ ۱۹۱۷ء میں سر عبدالقادر مرحوم نے مولوی بیکدل کے ان روزنامچوں پر ایک مقالہ لکھا تھا جس کی اشاعت پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے جرنل کی جلد ۶ شمارہ ۲ میں ہوئی تھی۔ سر عبدالقادر کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہ روزنامچہ ۱۸۲۱ء سے ۱۸۶۱ء تک اکتالیس برسوں کی یادداشتوں پر مشتمل ہے"۔

ان کی تفصیل مآخذ کی فہرست میں درج کی جائے گی۔[۲۵]

۱۵۔ مسودہ رسالہ شمسیہ بزبانِ اردو

اس رسالہ کا سببِ تحریر اور دیباچہ بزبانِ اردو پہلے درج کیا جا چکا ہے اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ رسالہ شمسیہ فقیر سید شمس الدین کے ایما پر لکھا گیا لہٰذا انہی کے نام کے ساتھ نسبت دے کر مولوی بیکدل نے اس کا نام "رسالہ شمسیہ" رکھا۔ یہ رسالہ مولوی بیکدل کی نثر کا بہترین نمونہ ہے ـــ نہ صرف یہ بلکہ اگر اس نثر کو انیسویں صدی کے اس نثری ادب میں رکھ کر دیکھا جائے جس کی تخلیق ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ

اپنے عہد کی بہترین نثر ہے۔ اس پر تفصیلی بحث خاندانِ چشتی کی اہم تصانیف
کے ذیل میں آئے گی۔

۱۶۔ سی حرفی یکدل (بزبانِ پنجابی)

مولوی یکدل کی سحرفی کے ابیات بیاضوں میں موجود ہے۔ مدوّن یا مطبوعہ صورت
میں دستیاب نہیں۔

۵۔ مولوی نور احمد چشتی متخلص بہ چشتی

مولوی نور احمد چشتی، مولوی احمد بخش یکدل کی پہلی بیوی مسماۃ فضل النساء کے بطن سے تھے۔ جو مولوی محمد بخش صحاف کی صاحبزادی تھیں۔ مولوی محمد بخش صحاف کی دوسری بیٹی امینہ مفتی علی الدین بن مفتی خیر الدین کی اہلیہ تھیں۔ اس اعتبار سے مفتی علی الدین مصنف "عبرت نامہ" مولوی نور احمد چشتی کے خالو تھے۔

مولوی نور احمد چشتی ۷۔ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۰۔ جون ۱۸۲۹ء کو بدھ کے روز متولد ہوئے۔[۱۹] ماں کی مانی ہوئی منت کے مطابق جھنڈ (یعنی موئے شکمی) اتارے نہیں گئے جس کے سبب بچپن میں جھنڈو کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ چھ سال کے تھے کہ والدہ انتقال کر گئیں اور مولوی نور احمد براہِ راست والد کے سایۂ عاطفت میں آگئے۔ اسی سال انہیں میاں عثمان کے مکتب میں داخل کروا دیا گیا۔ میاں عثمان، مولوی یکدل کے دوست اور لاہور کے معزز اساتذہ میں سے تھے۔ مولوی نور احمد چشتی چودہ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۴۳ء کے قریب تعلیم سے فارغ ہوئے اور اپنے والد کے بااثر شاگرد دیوان امرناتھ اکبری خلف راجہ دینا ناتھ سوز کی سفارش سے مثل فتح خان نون میں وکالت کے عہدے پر متعین ہو گئے یہاں آپ کو پانچ روپے یومیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کشمیر کے گورنر دیوان کرپارام اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خزانۂ عامرہ کے افسر بیلی رام کے بیٹوں کو اپنی خاندانی روایات کے مطابق درس دیتے رہے۔[۲۰]

مولوی نور احمد چشتی ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ دہلی گئے۔ مولوی نور احمد نے "تحقیقاتِ چشتی" میں لکھا ہے کہ وہ باپ بیٹا، راجہ دینا ناتھ کے بھائی کدار ناتھ کی شادی میں دہلی گئے تھے۔[۴۱] ان ایام میں مولوی نور احمد کے والد مولوی یکدل کی بہادر شاہ ظفر بادشاہ کے دربار میں باریابی ہوئی۔ بادشاہ نے یکدل کے علم و فضل کی قدردانی کرتے ہوئے انہیں خطاب اور زیرہ پارچے کا خلعت دیا۔ مولوی نور احمد کو بھی سات پارچے کا خلعت ملا۔ مولوی نور احمد چشتی نے خیالاتِ دانش میں لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں باریابی کے وقت ان کی عمر دس بارہ سال کی تھی۔ ۱۲۵۸ھ کے اعتبار سے یہاں دس بارہ سال نہیں، درست چودہ سال ہونے چاہییں۔ مولوی نور احمد کو تو صرف چار سال کا لیکن مولوی یکدل کو خود ایک جگہ پورے آٹھ سال کا مغالطہ ہوا ہے:

"در مکتوبات خودم بتکرار بقلم آمد کہ در ۱۲۵۰ھ بشاہجہان آباد پیوستم و ہشت ماہ در آنجا ماندم"۔[۴۲]

حالانکہ خطاب فخر الشعراء کے ساتھ عطا کی گئی مہر پر[۴۳] ۱۲۵۸ھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک خط بنام بہادر شاہ ظفر پر بھی یہی تاریخ ہے جو غالباً واپس آکر لکھا گیا۔ مولوی نور احمد نے خیالاتِ دانش میں "جرأت" کے زیرِ عنوان بہادر شاہ ظفر کے دربار میں اپنی حاضری سے متعلق ایک واقعہ بھی لکھا ہے جو ان کی عمر کے مدِ نظر خاصا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"در ایام خوردی کہ عمرم دہ دوازدہ سالہ بود، با برکات جناب بابا دام افضالہم کہ آنحضرت بتقریب شادی برادر زادۂ[۴۴] جناب راجہ دینا ناتھ صاحب بہادر تشریف بردہ بودند تا بدہلی رسیدم۔ بابایم بدربار حضرت فلک قدرت محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی عزتی پیدا کردند۔ روزی بروز عرس حضرت خواجہ قطب صاحب قدس سرہٗ بمرقد حضرت موصوف راقم را برای سلام بادشاہ ہمراہ بردند۔ حضرت بہادر شاہ بعد مصافحہ حضرت طیبات بر مسند جلوس فرمودند۔ بندہ ہیچمیرز بجلدی تمام دست خود بدست ملک رسانیدہ گفت کہ:

ندیدہ گہ کسی خلقِ محمد ﷺ بچشمِ خویش خلق اللہ دیدم

ہمہ ایں دربار حیراں شدہ پسندیدند و سہ گوشہ بہ پا بام کردند۔ فقط"[۳۵]

۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد مولوی نور احمد چشتی اس نئے سیاسی اور معاشرتی نظام کا ایک فعال رکن بن گئے۔ چنانچہ مشرقی علوم کے درس کی آبائی مسند کو چھوڑ کر انگریزی مدرسے کے معلم ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں ہی ڈاکٹر لوگن کے ایما پر مولوی صاحب ایک گھنٹہ روزانہ سول اور ملٹری دونوں اطراف کے انگریز افسروں کو اردو پڑھانے لگے۔ اس کام کے لیے انہیں میاں میر چھاؤنی میں جانا پڑتا تھا۔ تنخواہ بہت معقول تھی، ۲۰ روپے فی یوم یعنی ۶۰۰ روپے ماہوار۔ ۱۸۵۳ء میں مولوی صاحب انگریز افسروں کے معلمِ خاص مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۴ء یعنی ان کی تصنیف تحقیقاتِ چشتی کے سالِ تصنیف تک ان کے یورپین شاگردوں کی تعداد دو ہزار تک پہنچ چکی تھی۔[۳۶]

مولوی صاحب نے اپنی اکثر تصانیف اپنے یورپین دوستوں اور شاگردوں کے ایما پر ہی لکھی تھیں۔ مولوی نور احمد چشتی کے چند اہم انگریز شاگردوں کی فہرست راقم الحروف نے اپنی کتاب "یادگارِ چشتی" مصنفہ مولوی نور احمد چشتی کے دیباچے میں دی ہے۔[۳۷] اس فہرست میں:

سی ڈبلیو فورمن	آر سی ٹمپل
ایڈورڈ تھانٹن	ڈبلیو کولڈ سٹریم اور

لارڈ لارنس جیسی اہم شخصیتوں کے نام بھی آتے ہیں۔ اس کے علاوہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سی۔ یو۔ ایچیسن بھی مولوی نور احمد کے شاگردوں کی صف میں شامل تھے۔

۱۸۵۲ء میں مولوی نور احمد چشتی، الیگزنڈر میکلوڈ وغیرہ کو پڑھاتے تھے۔[۳۸]

۱۸۵۴ء میں مولوی صاحب اسی ملازمت کے سلسلے میں امرتسر چلے گئے جہاں وہ لاٹو رجمنٹ کو پڑھاتے تھے۔ دیوانِ چشتی میں قیامِ امرتسر کے ذکر میں اشعار موجود ہیں۔[۳۹] چنانچہ لکھتے ہیں:

چھوڑ لاہور کو آ بیٹھا ہوں امرتسر میں

کیا مزہ تھا جو مرے پاس پیارا ہوتا

۱

لاہور کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی مجھ کو
دل اب جو نہ دیکھے گا بنز ہوئے گا یا رب

لاہور میں کس منہ سے بتا جاویں گے چشتی!
جب تک کہ نیا فن کوئی پیدا نہ کریں گے

مولوی نور احمد چشتی کی پہلی شادی سولہ برس کی عمر میں سید بیگم بنت شاہ چراغ سبزواری سے ہوئی۔ شاہ چراغ سبزواری اور ان کے خاندان کے حالات "تحقیقاتِ چشتی" میں موجود ہیں۔ شاہ چراغ کا خاندان زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے بھی بہرہ مند تھا۔ ان کے بیٹے سید بہادر علی شاہ اعلیٰ درجے کے طبیب اور فارسی زبان کے بہت خوش گو شاعر تھے۔

سید بیگم کا انتقال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء میں ہوا۔ مولوی نور احمد نے مندرجہ ذیل تاریخ وفات موزوں کی:[۱۳۹]

سالِ وصلش جست چون چشتی ز دل
گفت رضوان شاہِ حورانِ بہشت

۱۲۷۸ھ

سید بیگم کے فراق میں لکھے ہوئے اشعار دیوانِ چشتی میں موجود ہیں۔[۱۴۰]

مولوی نور احمد چشتی محلہ چابکسواراں میں اپنے والد مولوی احمد بخش یکدل کے مکان کے پاس ہی اپنے زرخرید مکان میں سکونت پذیر رہے۔ اس مکان کا بیع نامہ راقم الحروف کے پاس ہے جس پر مندرجہ ذیل حدود اربعہ درج ہے:

۱۔ متصل بخانہ غلام حسن

۲۔ متصل دیوار بدیوار مولوی صاحب مولوی احمد بخش یکدل

۳۔ متصل کوچہ سربستہ

۹۔ متصل دیوار بدلیار خانہ بدرالدین و نتھو و امام بخش

مولوی نور احمد چشتی کی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں:

۱۔ فضل النساء

۲۔ خیر النساء

فضل النساء جواں سال فوت ہو گئیں۔ خیر النساء ۱۹۱۸ء تک زندہ تھیں۔

خیر النساء کی شادی نور الدین بن رحیم بخش بن کریم بخش عرف کمّا سے ہوئی تھی۔ موصوف کی وفات مئی ۱۸۹۴ء میں ہوئی[۴۲]۔ خیر النساء کا ایک بیٹا غلام محمد تھا جو بصرے میں جا کر مقیم ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں وہ ایک دفعہ لاہور آیا تھا، مولوی ممتاز علی چشتی نے اپنی یادداشتوں میں اس سے ملاقات کا ذکر کیا ہے[۴۳]۔

مولوی نور احمد چشتی کو حضرت فیض اللہ شاہ چشتی ساکن کرنال سے بیعتِ طریقت حاصل تھی جو کہ شیخ المشائخ حضرت غلام محمد عرف مسکین شاہ دہلوی کے مرید تھے۔ مولوی نور احمد نے تحقیقاتِ چشتی میں اپنا شجرۂ طریقت قلمبند کیا ہے[۴۴]۔ اس کے علاوہ وہ اپنے والد مولوی یکدل کے فیضان کا بھی اعتراف کرتے ہیں:

آقائے دو جہانی یکدل ہے باپ میرا
مرشد مرا وہی ہے اور پیر ہے تو یہ ہے
خاک اس کے در کی مجھ کو جوں قبلہ ساں مکرم
اے دوستانِ جانی اکسیر ہے تو یہ ہے[۴۵]

مولوی نور احمد چشتی کی وفات ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء کو ہیضے کی وبا میں ہوئی۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے مندرجہ ذیل تاریخ موزوں کی[۴۶]:

نور احمد بخطۂ لاہور بود مشہور شاعرِ چشتی
سال فوتش ازاں سبب دل را گشت مشہور شاعرِ چشتی

۱۲۸۴ھ

مولوی نور احمد چشتی کی تالیفات مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ نور الانشار	۲۔ حمایت الصبیان
۳۔ خیالاتِ دانش	۴۔ ذخیرۃ الظرافت
۵۔ ندیم الرمل	۶۔ فالِ اختر
۷۔ حل لغاتِ محاورہ	۸۔ دیوانِ چشتی
۹۔ تحفۂ چشتی	۱۰۔ یادگارِ چشتی
۱۱۔ عجائباتِ چشتی	۱۲۔ تحقیقاتِ چشتی
۱۳۔ مقامِ حیرت	۱۴۔ رقعہ مولوی نور احمد چشتی

ان کتابوں میں نمبر ا سے نمبر ۷ تک فارسی زبان میں ہیں اور پوری تلاش کے باوجود راقم الحروف کو ان میں سے صرف تین کتابیں مل سکی ہیں :

۱۔ نور الانشاد

۲۔ خیالاتِ دانش

۳۔ ندیم الرمل

تفصیل یہ ہے :

۱۔ نور الانشاء

حسب الارشاد سید آب سید جعفر علی خاں رضوی از جا بجا فراہم آوردہ فقیر بے مولوی نور احمد چشتی لاہوری نژاد ترتیب داد"

۲۔ خیالاتِ دانش

بہ سرپرستی مسٹر سمن صاحب بہادر

یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں لکھی گئی ۔ یہ کتاب سعادت یار خاں رنگین کی تصنیف مجالس رنگین سے متاثر ہو کر لکھی گئی ۔ اس کتاب میں دانش و حکمت کی کچھ باتیں ،

کچھ واقعات و حکایات مختلف موضوعات کے تحت درج کیے گئے ہیں۔

۲۔ ندیم الرمل:

یہ کتاب مولوی نور احمد چشتی کے لیے ان کے ایک شاگرد گنگارام کاشتھ اور عزیز الدین رسول نگری، دونوں نے مل کر نقل کی ہے۔ تاریخ ندارد

اختتام:

"تمام کام بدستخط برخوردار گنگارام کاشتھ و عزیزی عزیز الدین رسول نگری بہ تکلیف بندہ نور احمد چشتی عفی عنہ"۔

باقی تمام کتابیں اردو میں ہیں سوائے "مقامِ حیرت" کے جو پنجابی زبان میں لکھی ہوئی ایک سی حرفی ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

مقامِ حیرت:

یہ کتاب پنجابی نظم میں لکھی گئی سی حرفی ہے جس میں واقعاتِ کربلا اور مناقبِ شہداء بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ "برای آگاہی حالاتِ کربلا و جناب سیّد الشہداء کہ باختصار تمام دریا بہ کوزہ اندا ختۃ"۔

مقامِ حیرت کی پہلی اشاعت ۱۸۶۰ء/ ۱۲۷۷ھ میں مطبع پنجابی لاہور سے ہوئی۔ سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۱۲۔

دوسری اشاعت گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور سے ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ اس کی اشاعت کا انتظام مولوی ممتاز علی چشتی نے کیا تھا لیکن کتاب پر حسبِ فرمائش ظفر الدین صدیقی خلف الصدق مولوی امیر بخش صاحب لکھا ہوا ہے۔ مولوی ظفر الدین صدیقی کو مولوی ممتاز علی نے ماموں لکھا ہے۔ غالباً کتاب پر ان کا نام ازراہِ احترام درج کرایا گیا ہوگا۔ مولوی ممتاز علی کے روزنامچے میں اس اشاعت کے بارے میں مندرجہ ذیل یادداشت

ملتی ہے :

—"۲۱ دسمبر ۱۹۱۷ء۔

ماموں ظفر الدین صاحب کو مقامِ حیرت مصنفہ حضرت باباجان مولوی نور احمد چشتی مرحوم کی دے آیا تھا۔ انہوں نے پھر گلزارِ محمدی پریس، موری دروازہ لاہور میں کاپی کرنے کو دے دی تھی اور پھر بغرض تصحیح لے آئے تھے، جو ٹھیک کر دی گئی ہے۔ اس کا ٹائیٹل پیج استاد نور الدین کو کے واسطے دے آئے ہیں"۔

— بروز اتوار ۱۴ / جنوری ۱۹۱۸ء

"مقامِ حیرت مصنفہ حضرت مولوی نور احمد صاحب چشتی مرحوم، انڈین پریس لاہور میں ایک ہزار پچاس (۱۰۵۰) چھپائی ہے اور خرچ حسبِ ذیل ہوا۔ ٹائیٹل پیج عبداللطیف رشتہ دار (تایازاد بھائی) رشید بیگم (زوجہ ممتاز علی چشتی) نے بنا دیے :

	پائی	آنے	روپے
کاغذ ایک ریم جس میں ایک ہزار کاپی بنی	۰	۱۳	۵
لکھوائی محمد حسین کاتب	۰	۰	۲
چھپوائی	۰	۷	۲
کاغذ برائے ۵۰ کاپی	۰	۴	۱
کُل خرچ	۰	۸	۱۱

— فروخت مقامِ حیرت :

بدست آپا رحیمن (دختر مولوی محمد علی پُرہ دل)	۰	۰	۱
بدست آپا خیر النساء (دختر مصنف موصوف)	۰	۰	۱

بدست آپا نجم النساء

کل رقم: ۱۰۰۰ / ۲۰۰۰ [۴۹]

انڈین پریس لاہور کا کتاب پر نام نہیں، غالباً اس سے یہ کام گلزار محمدی پریس کی معرفت کرایا گیا ہوگا۔

مقامِ حیرت کی اس اشاعت پر سب سے پہلا ریویو ہفتہ وار "پیسہ اخبار" لاہور میں شائع ہوا۔ بعد میں کشمیری میگزین لاہور وغیرہ نے اس پر ریویو کیے اور اس کتاب کی تعریف کی۔

مولوی نور احمد چشتی کی اردو تصانیف پر اگلے باب میں تفصیلاً روشنی ڈالی جائے گی۔ وہ باب چشتی خاندان کی اہم اردو تصانیف کے لیے وقف ہے۔

۶۔ مولوی محمد علی چشتی المتخلص بہ پُردِل

مولوی محمد علی چشتی شوال ماہ ۱۲۵۲ھ / جنوری ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت ان کا نام محمد بخش رکھا گیا چنانچہ ان کے بیٹے مولوی حامد علی چشتی نے مادۂ تاریخ اس نام کے ساتھ موزوں کیا ہے:

"فہو حسبہٗ مولوی محمد بخش" [۵۰]

مولوی محمد علی چشتی کے والد مولوی احمد بخش یکدل نے لکھا ہے کہ:

"آں برخوردار را اوّل کنیت کہ زین العابدین است و بار اسم کہ مولوی محمد علی است نام تاریخی شد" زین العابدین مولوی محمد علی چشتی۔ [۵۱]

مولوی احمد بخش یکدل نے بیٹے کی پیدائش پر زائچہ بنا کر حکم لگایا کہ وہ کثیر الاولاد ہوں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مولوی محمد علی پُردل ایک سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور انہیں ایک

دایہ کی گود میں دے دیا گیا جسے "موبی" کہتے تھے۔ نام معلوم نہ ہو سکا۔ یہ خطاب غالباً اس کے بہرہ ہونے کے سبب اسے دیا گیا ہوگا۔

۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء کو آپ کے بڑے بیٹے حامد علی چشتی پیدا ہوئے۔ جد بزرگوار مولوی یکدل نے تاریخ ولادت لکھی:

"تاریخِ ولادت برخوردار حامد علی کہ کنیت او "نظام حق والدین است"۵۲

۱۲۷۸ھ میں پُردل کے چھوٹے بیٹے کی ولادت ہوئی۔ مولوی یکدل نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ:

"امروز ۱۲ مرداد ماہ الٰہی ۱۹۱۸ مطابق ۱۷ ماہ صفر المظفر در خانہ برخوردار محمد علی چشتی پدر مولوی حامد علی چشتی جناب لم یلد ولم یولد جلّشانہٗ فرزندی کرامت کردند، از صبحِ صادق باقی بود۔ الٰہی عمر دراز بہر سہ روزی باد بفضلِ ایزدی باسم احمد علی چشتی موسوم کردند"۔۵۳

احمد علی چشتی، بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ حامد علی چشتی کثیر الاولاد ہوئے۔ گویا یکدل کے زائچے نے مولوی حامد علی کے حوالے سے صداقت حاصل کی۔

مولوی محمد علی چشتی پُردل کی دو صاحبزادیاں بھی، ایک کا نام رحیم النساء عرف آپا رحیمن اور دوسری غنی النساء عرف اماں بی تادیر حیات رہیں۔ غنی النساء کی تاریخِ ولادت ۱۹۔ فروری ۱۸۵۹ء ہے۔

مولوی پُردل کی اہلیہ کا انتقال ۲۶۔ صفر ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۷۔ مارچ ۱۸۶۳ء کو ہوا۔ مولوی پُردل نے آخری عمر میں ملازمت کر لی تھی۔ مولوی حامد علی چشتی کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ مولوی محمد علی پُردل ۱۱۔ دسمبر ۱۸۸۸ء کو مشن سکول میں ملازم ہوئے۔ یہ مشن سکول وہی ہے جو رنگ محل شاہ عالمی گیٹ لاہور میں واقع ہے۔

مولوی پُردل نے سہ شنبہ ۶۔ شعبان ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۷۔ مارچ ۱۸۹۱ء کو منگل کے دن،

بدست آپا نجم النساء

کل رقم: ۱۰۰۰/۳۰۰۰ [49]

انڈین پریس لاہور کا کتاب پر نام نہیں، غالباً اس سے یہ کام گلزارِ محمدی پریس کی معرفت کرایا گیا ہوگا۔

مقامِ حیرت کی اس اشاعت پر سب سے پہلا ریویو ہفتہ وار "پیسہ اخبار" لاہور میں شائع ہوا۔ بعد میں کشمیری میگزین لاہور وغیرہ نے اس پر ریویو کیے اور اس کتاب کی تعریف کی۔

مولوی نور احمد چشتی کی اردو تصانیف پر اگلے باب میں تفصیلاً روشنی ڈالی جائے گی۔ وہ باب چشتی خاندان کی اہم اردو تصانیف کے لیے وقف ہے۔

۶۔ مولوی محمد علی چشتی المتخلص بہ پُر دِل

مولوی محمد علی چشتی شوال ماہ ۱۲۵۲ھ/ جنوری ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت ان کا نام محمد بخش رکھا گیا چنانچہ ان کے بیٹے مولوی حامد علی چشتی نے مادۂ تاریخ اس نام کے ساتھ موزوں کیا ہے:

"فهو حسبہٗ مولوی محمد بخش" [50]

مولوی محمد علی چشتی کے والد مولوی احمد بخش یکدل نے لکھا ہے کہ:

"آن برخوردار را اوّل کنیت کہ زین العابدین است و باز اسم کہ مولوی محمد علی است نام تاریخی شد" زین العابدین مولوی محمد علی چشتی"۔ [51]

مولوی احمد بخش یکدل نے بیٹے کی پیدائش پر زائچہ بنا کر حکم لگایا کہ وہ کثیر الاولاد ہوں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مولوی محمد علی پُر دل ایک سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور انہیں ایک

دایہ کی گود میں دے دیا گیا جسے "موبی" کہتے تھے۔ نام معلوم نہ ہو سکا۔ یہ خطاب غالباً اس کے بہرہ ہونے کے سبب اسے دیا گیا ہو گا۔

۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء کو آپ کے بڑے بیٹے حامد علی چشتی پیدا ہوئے۔ جد بزرگوار مولوی یکدل نے تاریخِ ولادت لکھی:

"تاریخِ ولادت برخوردار حامد علی کہ کنیتِ او "نظام حق والدین است"[۵۲]

۱۲۷۸ھ میں پُردل کے چھوٹے بیٹے کی ولادت ہوئی۔ مولوی یکدل نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ:

"امروز ۱۲ مرداد ماہ الٰہی ۱۹۱۸ مطابق ۱۷ ماہ صفر المظفر در خانہ برخوردار محمد علی چشتی پدر مولوی حامد علی چشتی جناب لم یلد ولم یولد جلّشانہ فرزندی کرامت کردند، از صبحِ صادق باقی بود۔ الٰہی عمر دراز بہرسہ روزی باد بفضلِ ایزدی باسم احمد علی چشتی موسوم کردند"۔[۵۳]

احمد علی چشتی، بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ حامد علی چشتی کثیر الاولاد ہوئے۔ گویا یکدل کے زائچے نے مولوی حامد علی کے حوالے سے صداقت حاصل کی۔

مولوی محمد علی چشتی پُردل کی دو صاحبزادیاں تھیں، ایک کا نام رحیم النساء عرف آپا رحیمن اور دوسری غنی النساء عرف اماں بی تادیر حیات رہیں۔ غنی النساء کی تاریخِ ولادت ۱۹۔ فروری ۱۸۵۹ء ہے۔

مولوی پُردل کی اہلیہ کا انتقال ۲۶۔ صفر ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۷۔ مارچ ۱۸۶۳ء کو ہوا۔ مولوی پُردل نے آخری عمر میں ملازمت کر لی تھی۔ مولوی حامد علی چشتی کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ مولوی محمد علی پُردل ۱۱۔ دسمبر ۱۸۸۸ء کو مشن سکول میں ملازم ہوئے۔ یہ مشن سکول وہی ہے جو رنگ محل شاہ عالمی گیٹ لاہور میں واقع ہے۔

مولوی پُردل نے سہ شنبہ ۶۔ شعبان ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۷۔ مارچ ۱۸۹۱ء کو منگل کے دن،

چار بجے صبح وفات پائی ۔ وفات کی خبر جن اخبارات میں شائع ہوئی ان کی تفصیل یہ ہے:

پنجاب گزٹ	سیالکوٹ	بابت ۲۸ مارچ	۱۸۹۱ء
آئینۂ ہند	لاہور	" ۲۶ "	"
ملاّ دو پیازہ	"	" ۲۳ "	"
صحیفۂ قدسی	دہلی	" ۲۲ "	"
سرمور گزٹ	انبالہ	" ۱۲ اپریل	"
پاٹے خاں	لاہور	" ۲۵ مارچ	"

مولوی پُر دل فارسی اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے اردو کلام پر الگ تبصرہ ہوگا۔

خاقانیِ ہند استاد ابراہیم ذوق کی وفات پر انہوں نے فارسی میں مادہ تاریخ قلمبند کیا تھا۔ یہاں وہ قطعہ ان کے فارسی کلام کے نمونے کے طور پر نقل کیا جاتا ہے[۵۹]:

شیخ ابراہیم عزرائیل دید و واہ گفت
فوق وتحت اے مولوی غمہا نمود و آہ گفت
سالِ او چون بُد مرید قطب چرخِ سلطنت
ہاتفیم شیخ ابراہیم اہل اللہ گفت

۱۲۷۱ھ

اس قطعہ تاریخ سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ مولوی محمد علی ۱۸۵۵ء تک مولوی تخلص کرتے تھے۔

۷۔ مولوی محرم علی چشتی المتخلص بہ چشتی

مولوی محرم علی چشتی المتخلص بہ چشتی ۶۔ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۳۔ جون ۱۸۶۳ء ہفتے کے دن

پیدا ہوئے۔ ماہِ محرم الحرام کی مناسبت سے ان کا نام محرم علی رکھا گیا۔ آپ کے والد گرامی مولوی احمد بخش یکدل چشتی نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخِ ولادت موزوں کیا:

بفضلہ چو محرم علی ولادت یافت
ششش محرم و یکشنبہ بود از میلاد
ششش محرم و یکشنبہ نیز شد تاریخ
مبارک است عزیزان بتاں مبارک باد

مولوی محرم علی کے والد جس طرح پہلے بیان ہوا، ۱۸۶۷ء میں فوت ہوئے تھے، اس وقت مولوی محرم علی کی عمر چار سال کے قریب تھی۔ گویا موصوف بچپن ہی میں والد کے سائے سے محروم ہو کر بڑے بھائی مولوی محمد علی پُردل چشتی کی سرپرستی میں آگئے۔ مولوی محرم علی کی والدہ مہرالنساء بیگم عرف مہراں نے ۲۔ دسمبر ۱۸۷۳ء کو وفات پائی، گویا مولوی محرم علی دس سال کے تھے کہ والدہ ماجدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ مولوی محمد علی پُردل نے چھوٹے بھائی کی تعلیم پر پوری توجہ کی۔ مولوی محرم علی نے بی۔ اے کی ڈگری نمایاں کامیابی سے حاصل کی۔ موصوف علی گڑھ کالج کے طلبائے قدیم میں سے تھے۔ علم و ادب کا جوہر وراثت میں ملا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ہفتہ وار اخبار رفیقِ ہند جاری کیا جس کا پہلا شمارہ ۵۔ جنوری ۱۸۸۴ء کو منظرِ عام پر آیا۔ اس اخبار کا مفصل تعارف اگلے باب میں پیش کیا جائے گا۔

۱۸۸۵ء میں مولوی محرم علی کی شادی قمرالنساء بنت حسن دین بن محمد بخش سے ہوئی جس کا والدین کی طرف سے نام چراغ بی بی تھا۔ مولوی حامد علی چشتی نے شادی کی تاریخ ۲۵۔ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۵۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء مطابق ۲۱۔ اسوج سمت ۱۹۴۲۔ ب، بیان کی ہے[۵۵]۔ یہ خاتون ایک سال تک دِق کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد ۹۔ مارچ ۱۸۹۲ء کو بدھ کے روز اذانِ صبح کے وقت وفات پا گئیں[۵۶]۔ اس سانحہ سے چند روز قبل خدا نے انہیں ایک بیٹی عطا کی تھی جس کا نام فخرالنساء رکھا گیا۔ فخرالنساء کی ولادت ۲۱۔ رجب ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۱۔ فروری ۱۸۹۲ء کو ہوئی۔ گویا ماں کے انتقال پہ

بیٹی صرف اٹھارہ دن کی تھی۔ قمر النساء سے بڑے دو بھائی مولوی قائم علی چشتی اور مولوی ابراہیم علی چشتی تھے۔

مولوی قائم علی چشتی ریاست جموں میں وکیل تھے اور علم و فضل میں شہرت رکھتے تھے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی سے خاص فیضان حاصل تھا اور انہی سے فاضل لاہوری کا لقب بھی ملا تھا۔ مولوی قائم علی چشتی کی تاریخ ولادت ۹ مارچ ۱۸۹۲ء ہے۔ مولوی قائم علی چشتی کی اولاد میں سے ایک لڑکا عثمان علی اور دو لڑکیاں سعیدہ اور حمیدہ موجود ہیں۔

مولوی ابراہیم علی چشتی تحریکِ آزادی کے سرگرم کارکن تھے اور قیامِ پاکستان کے سلسلے میں ان کی خدمات صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہیں۔ تمام زندگی مجرّد رہے۔

مولوی محرم علی چشتی نے پہلی بیوی کی وفات کے بعد یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو پشاور میں اپنے پیرِ طریقت حضرت مستان شاہ کابلی کی صاحبزادی سے شادی کی جس کی عمر شادی کے وقت ۱۶ سال تھی۔ مولوی حامد علی چشتی نے اس شادی پر مندرجہ ذیل یادداشت قلمبند کی ہے:

"یکشنبہ، یکم اپریل ۱۹۰۹ء، نکاحِ ثانی محرم علی ہمراہ دخترِ مستان شاہ مرحوم مرشدِ او، شانزدہ سالہ در پشاور شدہ۔ مستان شاہ سہ زوجہ گذاشتہ بود۔ یک یک بچہ از مستان شاہ آوردہ بود و مردند۔ این دختر کہ ہمراہ محرم علی منکوح شدہ از زوجہ سویم است"۔[۵۴]

مولوی محرم علی چشتی نے ۹۔ فروری ۱۹۰۹ء کو وکالت کا امتحان پاس کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک علم و ادب اور سیاست سے وابستگی کے ساتھ ساتھ وکالت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ مولوی محرم علی چشتی اپنے دور کی تیغِ بے نیام شخصیت تھے۔ ان کی اردو خدمات پر آئندہ باب میں بحث ہوگی۔

مولوی محرم علی چشتی نے ۸۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو صبحِ صادق کے وقت وفات پائی۔

مولوی محرم علی چشتی اردو اور فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر اور بلند پایہ نثر نگار اور صحافی تھے۔

۸- مولوی حامد علی چشتی المتخلص بہ حامد

مولوی محمد علی چشتی پرُدل ابن مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے بیٹے تھے۔ سالِ ولادت ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء ہے جو مولوی یکدل کے موزوں کیے ہوئے مندرجہ ذیل شعر سے برآمد ہوتا ہے:

بگفتہ ہاتفم از سالِ تولید
نظام الحق والدین جاوداں باد

۱۲۷۳ھ

راقم الحروف کے پاس مولوی حامد علی چشتی کے جو قلمی مسودے ہیں ان میں ایک کاغذ پر مولوی صاحب موصوف نے اپنے سوانحی کوائف لکھے ہیں۔ یہ کوائف بعینہٖ درج کیے جاتے ہیں:

حامد علی چشتی

تاریخ ولادت: اوّل دسمبر ۱۸۵۶ء - ۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۳ھ

رسم بسم اللہ: ۱۶ فروری ۱۸۶۱ء - ۵ شعبان ۱۲۷۷ھ

محکمہ تار ریلوے میں ملازم ہوا: ۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء

۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء کو ٹریفک مینجر کے وقفہ سے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں تبدیل ہوا۔

محکمہ آڈٹ ریلوے: ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء

ریٹائرمنٹ: ۱۹۱۶ء

شادی: ۱۷- اپریل ۱۸۷۱ء

مولوی حامد علی چشتی کی وفات ۱۸- اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ہوئی۔ مولوی صاحب موصوف کثیر الاولاد

تھے۔ ان کے سات بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جن کے نام یہ ہیں:

مولوی عبدالرحمن چشتی	مولوی عبدالمجید چشتی
مولوی عبدالحمید چشتی	مولوی احمد علی چشتی
مولوی عبدالرشید چشتی	مولوی عبدالحمید چشتی
محمود بیگم اکبری	مسعود بیگم اصغری

آپ کی اولاد کے مفصل کوائف چشتی خاندان کے شجرۂ نسب میں موجود ہیں۔

مولوی حامد علی چشتی کی شاعری اور اردو خدمات پر اگلے باب میں بحث ہوگی۔

۹۔ مولوی عبدالرشید چشتی

مولوی عبدالرشید چشتی بن مولوی حامد علی چشتی بن مولوی محمد علی پُر دل بن فخرالشعراء مولوی احمد بخش یکدل چشتی ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی حامد علی چشتی نے اپنے روزنامچے میں ان کے تولد کی تاریخ درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عبدالرشید چشتی چہار زدہ سہ پہر ۱۹۔ صفر المظفر ۱۲۹۱ھ مطابق ۷۔ اپریل ۱۸۷۴ء مطابق ۲۷ چیت ۱۹۳۱ سمت تولد شدند۔"[۱۵۱]

۱۱۔ نومبر ۱۸۷۸ء کو جبکہ ان کی عمر ساڑھے چار سال تھی، انہیں محلے کی مسجد میں قرآن خوانی اور فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم کے لیے حافظ عبدالعزیز مرحوم کے پاس بھیج دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں گورنمنٹ برانچ سکول میں داخل ہوئے جہاں سے مڈل پاس کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۸۹۲ء میں انٹرنس (میٹرک) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے ایف۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اسی سال آپ کی شادی کر دی گئی۔ آپ ازدواجی زندگی کو بے حد پسند کرتے تھے اور میاں بیوی کے درمیان افہام و تفہیم کے پائیدار رشتے استوار تھے۔ گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ کیا اور ۱۸۹۸ء

میں بی۔اے کے امتحان میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۲۲ نومبر ۱۸۹۸ء سے ۲۷۔ اپریل ۱۸۹۹ء تک آبزرور پریس لاہور کے مینجر رہے۔ ۱۹۰۰ء میں کچھ عرصہ کے لیے راولپنڈی چلے گئے جہاں موصوف اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسی طرح ۱۹۰۲ء میں چند ماہ کے لیے اسلامیہ سکول گوجرانوالہ نے ہیڈ ماسٹر کے طور پر آپ کی خدمات حاصل کیں۔

اسی اثنا میں آبزرور میں سب ایڈیٹر کی پوسٹ خالی ہوئی تو مولوی عبدالرشید چشتی کو ان کی ذہانت علم اور انگریزی زبان پر غیر معمولی عبور کی بنا پر انتخاب کر لیا گیا۔ چنانچہ ۲۲۔ مئی ۱۹۰۲ء کے بعد وہ آبزرور کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے جس سے وہ آخر دم تک وابستہ رہے۔

مولوی عبدالرشید چشتی کا انتقال ۶۔ مارچ ۱۹۰۴ء کو ہوا۔ ان کے سوگوار باپ مولوی حامد علی چشتی نے اس جانکاہ واقعے کو اپنی یادداشتوں میں یوں قلمبند کیا ہے:

"جمعہ گذشتہ، ۵ ذوی الحجہ ۱۳۲۰ھ مطابق ۶۔ مارچ ۱۹۰۴ء/ ۲۲ پھاگن سمت ۱۹۵۹ الحنت جگرم نور چشمی سرمایۂ عمر مستعارمن مولوی عبدالرشید چشتی بی اے بعد دوازدہ زدہ دو پہر این جہان فانی را ترک کرد"[۱۵]

مولوی عبدالرشید چشتی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی یادگار اردو میں لکھے ہوئے وہ بے شمار مقالات اور مضامین ہیں جو ان کے معاصر جرائد بالخصوص سر عبدالقادر کے مجلّے "مخزن" لاہور میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے ایک عزیز دوست میرزا اعجاز حسین نے آپ کے والد گرامی اور دیگر احباب کے تعاون سے ان تمام منتشر تحریروں کو یک جا کیا اور ان کی سوانح حیات پر مشتمل کتاب "حیاتِ رشید" میں انہیں شامل کر کے ۱۹۰۹ء میں شائع کر دیا۔ مولوی عبدالرشید چشتی اردو نظم اور نثر دونوں میں اسلوبِ خاص کے حامل تھے۔ ان کی نظمیں "حیاتِ رشید" میں موجود ہیں۔ چند نظموں کے عنوان یہ ہیں:[۱۶]

دل پُر درد : مطبوعہ مخزن۔ مارچ ۱۹۰۲ء

یہ عنوان مدیرِ مخزن نے خود قائم کیا ہے۔ یہاں ادارتی نوٹ کے بعد موصوف کی ایک اردو غزل اور چند اشعار درج کیے گئے ہیں۔ غزل کا مطلع ہے:

عشق زنجیر ہے اک دل کے جکڑنے کے لیے
حسنِ گُل دام ہے بلبل کے پکڑنے کے لیے

استقلال: بارِ اول مطبوعہ مخزن - اکتوبر ۱۹۰۳ء
کیفیتِ رنج: " " " جنوری ۱۹۰۴ء
کتّا: " " " فروری "
آرزوئے صحت: " " " مارچ "
بیٹا: " " " جنوری ۱۹۰۵ء

"حیاتِ رشید" میں دوستوں اور بھائیوں کے نام خطوط کے علاوہ ان کے جو ادبی شاہکار اشاعت پذیر ہوئے، درجِ ذیل ہیں:[62]

۱۔ دوستی
۲۔ اثر
۳۔ تاریخِ عالم کے اوراق
۴۔ انگلستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر
۵۔ دلِ افسردہ
۶۔ مشرقی اور مغربی زندگی کا مقابلہ
۷۔ سر سید احمد خاں مرحوم کی یاد میں: اشاعتِ اوّل "چودھویں صدی" راولپنڈی یکم اپریل ۱۹۰۰ء
۸۔ سید احمد خانی گدّی: اشاعتِ اوّل "اتفاق" مادھورہ۔ یکم فروری ۱۹۰۱ء

۹۔ گالیاں — اشاعتِ اوّل "مخزن" ستمبر ۱۹۰۱ء

۱۰۔ سر سید کی برسی — " "چودھویں صدی" راولپنڈی ۲۷۔ مارچ ۱۹۰۲ء

۱۱۔ " " — " "چودھویں صدی" راولپنڈی ۲۳ مارچ ۱۹۰۲ء

۱۲۔ بچوں کو اخبار کی مبارک — " بچوں کا اخبار۔ جون ۱۹۰۲ء

اردو نثر میں تراجم

۱۔ دماغی تعلیم

۲۔ حقوقِ رعایا — " "مخزن" ستمبر ۱۹۰۱ء

۳۔ امریکہ کی آزادی — " " جنوری ۱۹۰۲ء

۴۔ اصولِ حکومت — " " مارچ ۱۹۰۲ء

مولوی عبدالرشید چشتی سر سید احمد خاں مرحوم کی شخصیت، افکار اور اسلوبِ تحریر سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے "سر سید کی برسی" کے عنوان سے لکھے ہوئے مضامین اور تقریروں میں سر سید کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے، اس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ان کی شاعری میں مقصدیت اور مدعا پسندی کا وہی عنصر کارفرما ہے جو سر سید اور ان کے رفقا کی تحریروں کے لیے مخصوص ہے۔ ان کی نظم سپوت بیٹا اور استقلال، حالی کے رنگِ شعر کی آئینہ دار ہے۔ وہی اخلاقی درس اور وہی اصلاحِ قوم کا جذبہ ان نظموں میں بھی کارفرما ہے۔ اس جگہ ان کی نظم استقلال بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے:

پہاڑ اپنی جگہ سے ٹلے تو ٹل جائے\
اور آفتاب بھی قبلِ عروج ڈھل جائے

مگر نہ صاحبِ ہمت کا حوصلہ ٹوٹے
کبھی نہ بھولے سے اپنی جبیں پہ بل آئے

ہزار بار ارادہ میں گو نہ نصرت ہو
مگر نہ پائے صداقت کہیں پھسل جائے

رقیب لاکھ ہوں حاسد ہوں سینکڑوں بے ٹک
حسد کی آگ میں بد خواہ خود ہی جل جائے

ہمیشہ دستِ طلب میں ہو گرم رفتاری
ہزار عیش ہوں منہ موڑ کر نکل جائے

ہمیشہ فکر رہے دوسروں کا دامنگیر
دلِ حزیں کو نہ اس بے کلی سے کل آئے

نہ کارِ خیر میں گاہے ہو التوا ہرگز
جو کام آج ہو کرنا رہا نہ کل آئے

جو فتح ہو تو کبھی اس پہ شادمان نہ ہو
غرور و کبر سے سر میں نہ کچھ خلل آئے

مثالِ مرد ہر اک امتحان سے گذرے
لگے اگر کہیں ٹھوکر تو جھٹ سنبھل جائے

رہے جہان میں جب تک تو فکرِ کار رہے
اور آنکھ میچ کے سو جائے جب اجل آئے

جو مستقل ہو ارادے میں اس قدر اے دل
وہ کیوں نہ باغِ جہاں سے ہمیشہ پھل پائے

زمانہ خواہ کسی بیکس سے پھیر لے آنکھیں گمر نہ اس کا دلِ پُر وفا بدل جائے

نثر میں بھی سرسید کے اسلوب کی جھلک موجود ہے۔ سلاست، متانت اور پختگی ان کے اسلوبِ نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

۱۰۔ مولوی عبدالرحمٰن چشتی المتخلص بہ رحمٰن

مولوی عبدالرحمٰن چشتی، مولوی حامد علی چشتی بن مولوی محمد علی پُردل چشتی بن مولوی احمد بخش بیکدل چشتی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ۲۷ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۹۔اپریل ۱۸۷۲ء مطابق ۲۶ چیت سمت ۱۹۲۹ کو ہفتہ کے دن ایک بجے علی الصبح متولد ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ کثیر الاولاد تھے۔ چار بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں دو فرزند صاحبِ تصنیف و تالیف ہوئے جن کے نام مولوی ممتاز علی چشتی اور مولوی مسعود علی چشتی ہیں۔ دوسرے دو بیٹے منصور علی چشتی اور محمود علی چشتی تھے۔ آخر الذکر ۱۹۱۷ء تک زندہ تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ مولوی منصور علی چشتی کے ایک بیٹے عزیز منصور ہیں جن کے پانچ بچے ہیں: سلمٰی، منشی، شمس، کریم اور رؤف۔

مولوی عبدالرحمٰن چشتی اردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ "رفیقِ ہند" لاہور میں ان کی نظمیں اور قطعاتِ تاریخ شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ ۲۲۔مئی ۱۸۸۶ء کے رفیقِ ہند میں ان کا مصنفہ ایک قطعہ تاریخ موجود ہے جس میں منشی غلام حسین پنشنر ضلعدار کے بیٹے محمد اشرف کی ناگہانی وفات پر گہرے غم کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ نظم مولوی عبدالرحمٰن چشتیؒ کے کلام کا عمدہ نمونہ ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

آسماں درد و غم کی ہے تصویر ۔۔۔ یاس و حسرت سے ہے زمیں کا خمیر
دم میں ہوتی ہے بات کچھ کی کچھ ۔۔۔ سر پہ ہر آن ہے کھڑی تقدیر
نوجواں کیسے کیسے اے افسوس ۔۔۔ خاک میں مل گئے بلا تاخیر
جس طرح سے محمد اشرف کو ۔۔۔ آ لگا آن میں قضا کا تیر
پُتلا گویا تھا اک ذہانت کا ۔۔۔ عمر میں لڑکا، عقل میں تھا پیر
نورِ دانش جبینِ روشن پر ۔۔۔ یوں چمکتا تھا جیسے ماہِ منیر

یک بیک جب ہوئی قضا نازل — جی کی جی میں رہی ہر اک تدبیر
برگِ گل کو جو خار جانتے تھا — خاک کا ہوگیا وہ ہائے خمیر
نرگسیں چشم اور درِ زنداں! — بال جن میں بسے تھا عطر و عبیر
سب کے سب خاک کے بنے بستر — خواب میں گویا دیکھی تھی تصویر

ان کے اردو کلام کے نمونے کم ہیں۔ فارسی کلام قطعات اور مادہ ہای تاریخ کی صورت میں موجود ہے، مولوی عبدالرحمٰن چشتی صاحبِ علم وفضل تھے۔ ان کی ایک بیاض جس میں ان کے خاندان کے بزرگوں کی وفات پر احباب کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ درج ہیں، راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اس بیاض میں مولوی عبدالرحمٰن چشتی کے چند نثر پارے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون انہوں نے اپنے والد مولوی حامد علی چشتی کی یاد میں تحریر کیا ہے۔ نثر کا اسلوب بے تکلف متین اور سادہ ہے۔

مولوی عبدالرحمٰن چشتی نے یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو وفات پائی۔ روزنامہ انقلاب ۳۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں وفات کی خبر شائع ہوئی۔

۱۱۔ مولوی ممتاز علی چشتی المتخلص بہ ممتاز و خوشدل

مولوی ممتاز علی چشتی، مولوی عبدالرحمٰن چشتی کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ کا سالِ ولادت ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء ہے۔ مولوی ممتاز علی چشتی کا ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۸ء تک کا لکھا ہوا اردو روزنامچہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے جس میں ان کی نثر کے اعلیٰ اسلوب کے علاوہ ان کی شاعری کے نمونے بھی درج ہیں۔ تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

مولوی ممتاز علی چشتی کے ہاں ایک بیٹا ۱۲ فروری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوا جس کی ۲۴۔ فروری ۱۹۱۸ء کو وفات ہوگئی۔

مولوی ممتاز علی چشتی بہت با استعداد آدمی تھے۔ اپنے بزرگانِ خاندان کے علمی آثار جمع کرنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ مولوی نور احمد چشتی کی کتاب "مقامِ حیرت" اپنے خرچ سے شائع کی۔ روزنامچے میں

ایک جگہ مولوی نور احمد چشتی کی دوسری کتاب "عجائبات چشتی" کی نقل اور تصحیح کا ذکر بھی موجود ہے۔

مولوی ممتاز علی چشتی انڈین ریلوے میں ملازم تھے۔ اس ملازمت کے لیے ان کی سفارش سر محمد شفیع بار ایٹ لا نے کی تھی۔

مولوی ممتاز علی ۱۹۲۴ء میں طاعون کے اچانک حملے سے فوت ہوئے۔

۱۲۔ مولوی محمد ابراہیم علی چشتی

مولوی محمد ابراہیم علی چشتی، مولوی محرم علی چشتی ابن مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے فرزند تھے۔ ۱۳۲۵ھ/۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "افتخار احمد" تھا۔

۱۹۴۶ء میں آپ تحریکِ رفاقت کے پروونشل سیکرٹری تھے۔ اس تحریک کے صدر پنجاب کے وزیر اعظم خضر حیات خان تھے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مولوی محمد ابراہیم علی کی خدمات پاکستان شناسوں سے پوشیدہ نہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں نظامِ اسلام کے نفاذ اور اسلامی اصولوں کے مطابق آئین کی ترتیب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور ہم خیال مفکرین کی ایک جماعت بنائی جو پاکستان میں قرآن و سنت کی بالادستی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور اس کے خلاف ہر سازش کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے رہے۔ مولانا عبد الستار خاں نیازی اور میاں محمد شفیع (م۔ش) اسی جماعت کے رکن ہیں۔ یہ دونوں بزرگوار مولوی محمد ابراہیم علی چشتی کے گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ م۔ش کا ارادہ ہے وہ اولین فرصت میں چشتی صاحب پر تحقیقی کام کا آغاز کریں گے اور قیامِ پاکستان کے سلسلے میں ان کی کاوشوں کو منظرِ عام پر لائیں گے۔

مولوی محمد ابراہیم علی چشتی علم و فضل، زہد و تقویٰ، خاندانی شرافت اور نجابت کا نمونہ تھے۔ ان کی رہائش پیسہ اخبار لاہور میں تھی جہاں ان کا عظیم الشان علمی ذخیرہ اور نادر کتاب خانہ بھی موجود تھا۔ راقم الحروف بھی اسلامیہ کالج کے زمانہ طالب علمی میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک اپنے دوستوں کے ہمراہ باقاعدہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہے۔ آپ صورت اور سیرت دونوں کے اعتبار سے پسندیدہ اور

صاحب وجاہت تھے۔

انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے اچھے ادیب تھے۔ ان کی انگریزی تحریریں اکثر پاکستان ٹائمز میں شائع ہوتی تھیں اور انگریزی دان حضرات زبان کے اعتبار سے ان تحریروں کو خاص درجہ دیتے تھے۔ مولوی محمد ابراہیم علی کی اردو تصانیف کی ایک نا تمام فہرست درج ذیل ہے۔ یہ فہرست ہم نے گرامی قدر جناب م۔ش کے ذاتی کتاب خانے کی مدد سے تیار کی ہے:

۱۔ تزکِ ہٹلری : ترجمہ ناشر: لائٹ پریس لاہور

۲۔ انگریز کا راج کیوں ختم ہوا : ترجمہ ناشر: لائٹ پریس لاہور

۳۔ اردو قرآن مجید " دارالخلافت پیسہ اخبار لاہور۔ ۱۳۵۸ھ

۴۔ پاکستان کے لیے جدید اسلامی دستور " لائٹ پریس۔ شارع قائداعظم لاہور

۵۔ امت اور سنت (ترجمہ از مثنوی مولانا روم) " " "

۱۳۱۔ مولوی مسعود علی چشتی المتخلص بہ مسعود

مولوی مسعود علی چشتی المتخلص مسعود، مولوی عبدالرحمٰن چشتی کے فرزند تھے۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۴۔ جمادی الاوّل، ۱۳۱۷ھ مطابق ۲۹۔ ستمبر ۱۸۹۹ء ہے۔ تعلیم بی۔ اے تک تھی۔ ۹ مئی، ۱۹۱۷ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

راقم الحروف کو ان سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ چوک ناخدا چاہ میراں میں رہائش پذیر تھے۔ اپنی خاندانی روایات اور سوانح کا جیتا جاگتا دائرۃ المعارف تھے۔ حافظہ بے نظیر، کلام میں لذت! اپنے خاندان پر علمی کام کے سلسلے میں اہلِ علم اور محققین کی خدمت میں ہمیشہ مستعد رہے۔ پنجاب میں اردو کی تالیف کے وقت مولوی محمد ابراہیم چشتی خوشدل کے سوانح کے سلسلے میں حافظ محمود شیرانی نے،

مولوی مسعود علی چشتی سے مدد لی اور حاشیے میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ راقم الحروف کو زیرِ نظر مقالے کے لیے چشتی خاندان کے بارے میں مواد کی فراہمی بھی ان کی بزرگانہ عنایت کا ایک حصہ ہے۔

مولوی مسعود علی چشتی کی وفات کی خبر مجھے کچھ عرصہ پہلے ایک دوست سے ملی تھی۔ میں نے کئی جگہ ان کے لواحقین سے رابطہ قائم کیا لیکن کسی نے اس سانحے کی تفصیل نہیں بتائی۔ حق تعالےٰ مغفرت کرے نادرِ روزگار شخصیت تھے۔

مولوی مسعود علی چشتی کی دو صاحبزادیاں ہیں۔ ایک کا نام مقیاس اور دوسری کا نام انفاس ہے۔ مقیاس صاحبہ کے دو بیٹے حماد جعفر رضوی اور احفاد جعفر رضوی ہیں۔ انفاس صاحبہ کی دو بیٹیاں عائشہ اور آمنہ ہیں۔

مولوی مسعود علی چشتی کسی زمانے میں اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کی غزلیات کے مسودے راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔ اگلے باب میں ان کا انتخاب درج کیا جائے گا۔

حواشی ___ باب چہارم

۱۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی : تحفۂ یکدل (بخطِ مصنف) مملوکہ راقم الحروف۔ ف ۲۳

۲۔ مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی۔ ص ۸

۳۔ تحائفِ قدسیہ : تصنیف ۱۱۶۹ھ مملوکہ راقم الحروف

۴۔ تحقیقاتِ چشتی : ص ۷

۵۔ مولوی یکدل : تحفۂ یکدل۔ ف ۵۷ (بخطِ یکدل)

۶۔ دیوان امرناتھ اکبری : ظفر نامہ رنجیت سنگھ، لاہور ۱۹۲۸ء۔ ص ۱۰۹
اکبری نے 'صمد ماند، عبدالصمد خان نماند' والے مصرع کو مولوی ضیاء الحق کے بجائے زاہد خان ابدالی کی ملکیت قرار دیا ہے۔

۷۔ "ضیائی" فارسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔

۸۔ مولوی یکدل : تحفۂ یکدل (بخطِ مصنف) ف ۲۱

۹۔ ایضاً۔ ف

۱۰۔ ایضاً۔ ف ۴۲

۱۱۔ اس لفظ کی کتابت واضح نہیں۔ شادابی اور شادانی دونوں صورتوں سے پڑھا جاتا ہے۔

۱۲۔ مولوی یکدل : تحفۂ یکدل (بخطِ مصنف) ف ۴۲

۱۳۔ حافظ محمود شیرانی : پنجاب میں اردو، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور ۱۹۷۲ء۔ ص ۳۲۰۔۳۲۴

۱۴۔ مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی لاہور، ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۷۔ "اس اعتقادِ حق بنیاد سے بعضے جہلائے لاہور آپ کو تیغہ کہا کرتے تھے"۔

۱۵۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی : بیاضِ یکدل۔ شمارہ ۱۶۔ ف ۱۲۷

۱۶۔ ایضاً۔ نمبر ۱۲۔ ف ۱۹۳۔ یہ کبت مولوی غلام حسین چشتی کے حوالے سے مولوی مسعود علی چشتی نے بھی مجھے سنایا تھا۔

۱۷۔ مولوی یکدل : بیاضِ یکدل نمبر ۱۲۔ ف ۱۱۵

۱۸۔ ایضاً۔ شمارہ نمبر ۱۲

۱۹۔ ایضاً۔ شمارہ نمبر ۱۱

۲۰۔ دیوان امرناتھ اکبری : ظفرنامہ رنجیت سنگھ، لاہور ۱۹۲۸ء۔ ص ۱۸۶

۲۱۔ سرکار نے حکم دیا کہ اے مولوی احمد بخش! آپ سرکار کی نوکری کریں۔ انہوں نے جب اپنی والدہ ماجدہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہمارا موروثی پیشہ معلمی ہے۔ تم کو لازم ہے کہ تم اپنے موروثی کام پر کھڑے رہو۔ خدائے تعالیٰ جل شانہٗ جو رازقِ مطلق ہے اس کام میں برکت دے گا۔ جب مہاراج کی خدمت میں جنابِ والدم نے عرض کی کہ میری والدہ ماجدہ یوں فرماتی ہیں تو یہ سن کر مہاراج خوش ہوئے۔

مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۴

۲۲۔ مولوی یکدل : تحفۂ یکدل (بخطِ مصنف) مملوکہ راقم الحروف۔ ف ۷

۲۳۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۵

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ اس قطعہ کا مطلع حسبِ ذیل ہے:

جہانِ فضل ابراہیم ذوق آں مومنِ متقن
کہ در فکرت نگنجد شرحِ اوصافِ کمالِ او

۲۶۔ سر لیپل گرفن : رولرز آف انڈیا۔ ترجمہ مولوی نظیر حسین فاروقی۔ حیدر آباد، دکن ۱۹۲۲ء ص ۸۶

۲۷۔ مولوی یکدل : بیاضِ اشعار (بخطِ مصنف)۔ ف ۳۳ ب

۲۸۔ گوہر نوشاہی: یادگارِ چشتی (باعثِ تحریر)، لاہور۔ مجلس ترقی ادب ۱۹۷۵ء ص ۴
ممتاز گوہر، ڈاکٹر: پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء۔ مقالہ پی ایچ ڈی۔ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔ ورق ۲۴۰۔۲۴۱

ان روزنامچوں کی جلد دوم راقم الحروف کے ذاتی کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ باقی جلدوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا بھی راقم کو موقع مل چکا ہے۔ یکدل نے بیاضوں کے بارے میں آرزو کی تھی:

"باید کہ ہر یکی را کہ این بیاض بدست آید، لازم کہ خود مطالعہ شب و روز کند و حفظ کند و مسلمانان را بتقریر واضح اطلاع دہد"۔

۲۹۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: بیاضِ یکدل شمارہ ۱۰۔ مولوی نور احمد چشتی کی تاریخِ ولادت کا مصرع ہے۔ ع

"مہد دولت نور احمد مجتبیٰ"[۱] (تحقیقاتِ چشتی ص ۲۵)

۳۰۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۶

۳۱۔ مولوی نور احمد چشتی نے اپنی تصنیف "خیالاتِ دانش" میں برادر زادہ راجہ دینا ناتھ کی شادی لکھا ہے جو زیادہ قرینِ صحت ہے کیونکہ کدار ناتھ تو اس زمانے میں دو بچوں کے باپ تھے۔

۳۲۔ مولوی یکدل: اوراق ملکہ گلستانِ سعدی بخطِ یکدل۔ مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی۔

۳۳۔ مولوی نور احمد چشتی: خیالاتِ دانش (بخطِ مصنف) ورق ۱۲۔ مخطوطہ مملوکہ راقم الحروف۔

۳۴۔ مولوی نور احمد نے تحقیقاتِ چشتی میں برادر راجہ دینا ناتھ لکھا ہے۔

۳۵۔ مولوی نور احمد چشتی: خیالاتِ دانش۔ ورق ۴۳۔ تحقیقاتِ چشتی میں سہ گوشہ کی بجائے سات پارچہ کا خلعت لکھا ہے۔

۳۶۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی لاہور۔ ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۷:

"اور آج تک جو صاحبانِ اعلیٰ شان فدوی سے پڑھ کر بعدہ ہائی جلیلہ سرفراز ہیں، تقریب دو ہزار

کے ہوں گے"۔

۳۷۔ گوہر نوشاہی (مرتب) یادگارِ چشتی، لاہور۔ مجلس ترقیِ ادب ۱۹۷۵ء۔ ص ۵۸

۳۸۔ مولوی نور احمد چشتی: خیالاتِ دانش (بخطِ مصنف) ف ۱۹۔

۳۹۔ مولوی نور احمد چشتی: دیوانِ چشتی (بخطِ مصنف) مملوکہ راقم الحروف۔

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ مولوی حامد علی چشتی نے سیدہ بیگم کی وفات کے بارے میں مولوی یکدل کے ایک خط نوشتہ از جموں کی سند سے لکھا ہے کہ ازیں معلوم شد کہ او مئی یا آخر اپریل ۱۸۶۲ء فوت شد" : روز نامچہ حامد علی چشتی۔

۴۲۔ مولوی حامد علی چشتی: روز نامچہ حامد علی چشتی۔ ف ۳۲

۴۳۔ روز نامچہ مولوی ممتاز علی چشتی۔ ف ۵۱

۴۴۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۳۸

۴۵۔ مولوی نور احمد چشتی: دیوانِ چشتی؛ بخطِ مصنف۔ مملوکہ راقم الحروف

۴۶۔ منشی غلام سرور لاہوری: گنج خوبی، لکھنؤ، نولکشور ۱۸۷۷ء۔ ص ۲۱۶

۴۷-۴۸۔ مولوی ممتاز علی چشتی، روز نامچہ ممتاز علی چشتی، مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی، لاہور ورق ۱۴، ۱۷۔ راقم الحروف نے اس روز نامچے کے مکمل فوٹو سٹیٹ سے استفادہ کیا ہے۔

۴۹۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: بیاضِ یکدل شمارہ ۷

۵۰۔ مولوی حامد علی چشتی: حاشیہ بیاضِ یکدل نمبر ۷

۵۱۔ مولوی یکدل: بیاضِ اشعار۔ ف ۱۲۔ مملوکہ راقم الحروف

۵۲۔ ایضاً: اوراقِ منسلکہ گلستانِ سعدی بخطِ یکدل۔ مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی

۵۳۔ ایضاً: اوراقِ متفرقہ، مملوکہ مولوی مسعود علی چشتی

۵۴۔ ہفتہ وار کوہِ نور۔ ۲ جنوری ۱۸۵۵ء۔ ص ۷

۵۵۔ مولوی حامد علی چشتی: روزنامچہ مولوی حامد علی ۔ف : ۱۳

۵۶۔ ایضاً: ف ۱۴

۵۷۔ ایضاً: ف ۴۰۹۔ مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی لاہور

۵۸۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: اوراقِ متفرق، منسلکہ گلستانِ سعدی، بخطِ یکدل۔ مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی۔

۵۹۔ مولوی حامد علی چشتی: روزنامچہ مولوی حامد علی چشتی؛ مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی لاہور

۶۰۔ ایضاً

۶۱۔ میرزا اعجاز حسین: حیاتِ رشید، لاہور ۱۹۰۹ء۔ ص ۱۶۶ تا ۱۷۵

۶۲۔ ایضاً: ص ۱۶۴ تا ۱۶۵

باب پنجم

خاندانِ چشتی کی اہم اردو تصانیف

۱۔ دیوانِ یکدل اردو

از : مولوی احمد بخش یکدل

مولوی احمد بخش یکدل السنہ شرقیہ کے ماہر اور فارسی و عربی ادب کے مشہور اساتذہ میں سے تھے۔ ان کے معاصرین نے ان کے ان اوصاف کا اعتراف کیا ہے۔ مولوی صاحب علم و فضل کے ساتھ ساتھ خوش کلام شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ فارسی انشا پردازی نے انھیں پورے ملک کے ادیبوں اور انشا پردازوں میں ممتاز کر دیا تھا۔ شعر کے بہترین مذاق اور شاعری کی اعلیٰ صلاحیت نے موصوف کو اپنے عہد کے اساتذہ میں جگہ دی۔ چنانچہ مفتی غلام سرور لاہوری اور کنھیا لعل ہندی دونوں نے لکھا ہے کہ یکدل اپنے عہد کے مشاق شعرا میں سے تھے۔ فارسی، اردو، عربی اور پنجابی چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ہر زبان میں شاعری کے لیے الگ تخلص ہونے کے سبب کئی تخلصوں کے مالک تھے۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

"احمد بخش در ہر بیت بموجب آئین داخل کردم و یکدل در شعرِ فارسی و نثر و مہر فخر الشعراء در پروانہ والقاب و چشتی نزد فقرا، و در عربی متخلص بالقلب و در عوام بلفظ مولوی مشہورم و من عاجزم کہ ششش نام دارم۔ اما منسو جہوری

پیر بخش نام نہادہ بود۔ و آن ہمہ در طفلی مشہور بود۔ صاحب ہفت نام ہستم"۔

۱۸۴۲ء میں یعنی سفرِ دہلی سے پہلے بیکدل کے اشعار زیادہ تر فارسی اور پنجابی میں تھے۔ اردو اشعار کی تعداد بہت کم تھی۔ بیکدل اس وقت اردو میں اشعار صرف خاص مواقع پر کہتے تھے۔ مثلاً عید اور ہولی وغیرہ کے قطعات میں یا محض تفنّنِ طبع کے طور پر یا کبھی کبھی شاگردوں کی تربیت کے لیے۔ اس لحاظ سے ۱۸۴۲ء سے پہلے کے اشعار کو ان کی اردو شاعری کا پہلا دور کہنا مناسب ہوگا۔

دوسرے دور کی شاعری جس میں انہوں نے اردو زبان کو پوری سنجیدگی اور توجہ سے وسیلۂ اظہار بنایا اس جگہ ہماری بحث کا موضوع ہے۔

مولوی بیکدل نے شروع میں اپنی اردو غزلیات کو فارسی شاعری کی طرح اپنی یادداشتوں اور بیاضوں میں دیگر واقعات اور حالات کے ساتھ قلمبند کرنا شروع کیا اور انہیں الگ کسی اہتمام کے ساتھ جمع نہیں کیا۔ ۱۸۶۱ء میں انہوں نے اپنے عہد کے اردو شعرا نیز اپنے پسندیدہ بعض کلاسیکی شعرا کے کلام کا انتخاب "بیاضِ اشعار" میں جمع کیا تو اس میں اپنا اردو کلام بھی یکجا کر دیا۔ البتہ ۱۸۶۱ء کا ہی لکھا ہوا ایک اردو قصیدہ جس کے ممدوح حافظ الملک نواب معین الدولہ بہاول خاں رابع والی بہاولپور رہیں، اس بیاض میں موجود نہیں ہے اور وہ بیکدل کے متفرق اوراق سے دستیاب ہوا ہے۔ شاید یہ قصیدہ بیاض کی تدوین یا اختتام کے فوری بعد لکھا گیا ہوگا۔ دراصل ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد بیکدل اپنے آپ کو تنہا اور علومِ مشرقیہ کو بے سرپرست سمجھنے لگے تھے۔ وہ طبعاً انگریزوں کو ناپسند کرتے تھے اور یہ نفرت اس قدر شدید تھی کہ اس کے برعکس سوچنا فوری طور پر ان کے لیے ناممکن تھا یہ تو وقت اور انگریز اہل کاروں کے ان کے ساتھ اچھے برتاؤ نے انہیں ان کی طرف سے دل صاف کرنے پر مجبور کیا ورنہ ۱۸۶۲ء کی ایک یادداشت میں وہ انگریزی عہد کے بارے میں مندرجہ ذیل تاثرات قلمبند کرتے ہیں:

"ومن در عہد انگریزی تنہا شدہ وہمہ مردم مشغول ہوا و ہوس شدند۔ و امروز مردم ہمہ انگریزی خوان و پارسی و تازی یک لخت نابود شدہ و کسی را

پروای علوم نماندہ۔[۱۲]

چنانچہ اس صورت حال میں انہوں نے راجہ رنبیر سنگھ خلف راجہ گلاب سنگھ والیِ کشمیر سے اور حافظ الملک بہادل خاں رابع والی بہاولپور سے توسل پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی شان میں قصائد لکھ کر روانہ کیے۔ اس سلسلے میں خود بھی ۱۸۶۱ء سے پہلے بہاولپور اور ۱۸۶۲ء میں جموں (کشمیر) گئے۔[۱۳]

"بیاضِ اشعار" کی اردو غزلیات بیاضوں اور متفرق اوراق میں درج شدہ غزلیات سے تعداد میں زیادہ ہیں اس لیے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ غزلیں ۱۸۶۱ء تک کی اردو غزلیات کا مجموعہ ہیں۔

بیاضِ اشعار کے بعد یکدل نے اردو غزلیات کا ایک اور مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش کی۔ یہ بیاض بہت اہتمام سے تیار کی گئی تھی۔ کاغذ انگریزی، لوح منقش، جلد چرمی مزین باکار چپہ؛ عمل بہاؤالدین پشاوری؛ لیکن معلوم ہوتا ہے یکدل کو اسے مکمل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ۵ نومبر ۱۸۶۶ء کو یکدل پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس میں وہ ایک سال تک مبتلا رہے اور ۲- نومبر ۱۸۶۷ء کو وفات پائی۔ گمان غالب ہے کہ یہ بیاض اسی زمانے میں بنائی گئی ہوگی۔ مفلوج ہونے کے بعد اسے ان کے فرزند مولوی نور احمد چشتی نے استعمال کیا اور مولوی یکدل کے کلام کے ساتھ اپنا کلام بھی اس میں انتخاب کرنا شروع کر دیا لیکن مولوی نور احمد چشتی کو بھی بیاض مکمل کرنے کی مہلت نہ ملی۔ وہ ۱۱- اگست ۱۸۶۷ء کو ہیضہ کے اچانک حملے سے فوت ہو گئے۔ یہ بیاض صرف آدھی لکھی ہوئی ہے اور باقی اوراق خالی پڑے ہوئے ہیں۔

ان دونوں بیاضوں میں مولوی یکدل کی اردو غزلیات کی کل تعداد موجود نہیں۔ بے شمار متفرق اشعار "بیاضِ اشعار" میں درج ہیں۔ جن کی غزلیں ان میں سے دونوں بیاضوں میں موجود نہیں، یہ غزلیں گمنامی کے کس زندان میں پڑی ہیں، فی الحال بتانا مشکل ہے۔ جو غزلیں مل سکی ہیں ان کی کل تعداد ۳۴ ہے۔ ان میں سے صرف چار غزلیں "بیاضِ اشعار" میں نہیں ہیں۔

اب تک یکدل کی جو اردو غزلیات دستیاب ہوئی ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ ہجر میں مجھ پہ جو آیا مرا جی جانتا ہے

۲۔ رکھ کے جب وہ آئینہ بالوں کو سلجھانے لگے

۳۔ عارضِ پُرنور ہے کیا خالِ دلبر کے تلے

۴۔ سمندِ ناز ترا برق ساں جدھر جائے

۵۔ کوئی دن ہم دیکھ کر افلاک کے سایے تلے

۶۔ مری سی بھلا آبرو تھی کسو کی

۷۔ گر راز کہوں کا میں تجھے دل کی پڑی کا

۸۔ نمایاں ہے ترے ابرو پہ بسم اللہ کی صورت

۹۔ جاں مری گر تری گلی جائے

۱۰۔ چمن کی سیر کو دلبر چلے ہیں

۱۱۔ اگر میں آہِ آتش بار ماروں آسمان لرزے۔

۱۲۔ فلک لرزے ملک لرزے قضا لرزے قدر لرزے

۱۳۔ نازنیں جب سے سہی ہے میں جدائی تیری

۱۴۔ بمثلِ ابر بہے چشم جاری اس کو کہتے ہیں

۱۵۔ تا لگی ہے آنکھ، کیا پھر خاک سونا ہوئے گا

۱۶۔ سب تری زلفِ پریشاں کے مارے مارے

۱۷۔ زہد و تقویٰ سے میاں دل کو اٹھانا چاہیے

۱۸۔ ہم نے جو کچھ خیال میں دیکھا

۱۹۔ آج ہم نے وہ دلربا دیکھا

۲۰۔ جہاں بیں گر ترے سا ہو کر ہووے تو بیں بالوں

۲۱۔ کوئی بے درد، درد کیا جانے

۲۲۔ رشتہ دارِ شمع، پروانے کو بلواؤ ذرا

۲۳۔ وہ میں ہی تھا کہ خود کو رکھا خام اب تلک

۲۴۔ مجھے مست ہو جانے کی آرزو ہے

۲۵۔ جس دل میں رات دن مرے یارو خدا بسے

۲۶۔ جس نے اپنے سے مجھے آپ ہی منسوب کیا

۲۷۔ خاک تھے نور ہوئے، مظہرِ اسرار ہوئے

۲۸۔ فخرِ عالم کا جو نہی ابر جہاں پر برسا

۲۹۔ بوئے گل میں ہی ہوں اور بادِ صبا میں ہی ہوں

۳۰۔ مجھ کو سحر مصیبتِ بلبل کی یاد آئی

۳۱۔ گل کے تئیں دید سے تیرے لالے پڑے بلبل

۳۲۔ شمشیر گر لے آدے تو اچھا، گھٹوں کہیں

۳۳۔ کون کہتا ہے کس سے دل لگانا منع ہے

۳۴۔ آج گلشن میں کیا مزہ ہوگا

قصیدہ مذکورہ بالا در مدح بہادلخاں رابع، تاریخ وفات حافظ رمضان۔ تاریخ مطبع دریائے نور اور پہلے دور کا کلام اس سے الگ ہے۔ اس اعتبار سے یکدل کا اردو دیوان ان کے کلام کی قابلِ توجہ مقدار کا حامل ہے۔ (متفرق اشعار جن پر جا بجا "فرد" لکھا گیا ہے ان کی تعداد بھی بیس کے قریب ہے)۔

دورِ اول کے چند نمونے پیش کرنے کے بعد دورِ ثانی کے کلام پر بحث کی جائے گی۔ یہ کلام بیاضِ متفرق اوراق، بیاضِ اشعار، بیاضِ کلامِ اردو، سب میں موجود ہے۔ بیاضِ اشعار سے چند نمونے درج ذیل ہیں:

آخری بُدھ

آخری بدھ ہے اس مہینے کا سیر کو نکلا شہؐ مدینے کا
عاشقوں کے مزار جا کر دیکھ گر مزا چاہتا ہے جینے کا

بسنت

بسنت آئی بس انت آئی ہے شالا مار کو دیکھو
گل لالہ گل نرگس ہے جوشِ ارغوانی ہے
مزار پاک مادھو لال پہ دیکھو گل افشانی
بسنتی پگڑیاں دیکھو بہارِ زعفرانی ہے

دوسرے دور کی شاعری سے ثابت ہے کہ یکدل نے اردو شاعری کی طرف پوری توجہ دی ہے اور اسے اپنے فارسی کلام کے ہم پلّہ بنانے کی کوشش کو بروئے کار لائے ہیں۔ یہ دور جوان کی زندگی کے بیس سالوں پر محیط ہے اس دور میں لکھی ہوئی غزلیں مضامین کے تنوع اور موضوعات کی وسعت سے ہمکنار ہیں۔ ان میں دہلوی شعراء کی صحبتوں کا اثر بھی نمایاں ہے خاص طور پر بہادر شاہ ظفر سے ملاقاتوں اور قلعہ معلیٰ کی ادبی محفلوں نے یکدل کی زبان کو اہلِ دہلی کے محاورے اور لب و لہجے کے نزدیک کر دیا۔ یکدل نے ایک غزل کے مقطعے میں بہادر شاہ ظفر سے استفادے کا ذکر کیا ہے۔ اس غزل کا مطلع ہے:

وہ میں ہی تھا کہ خود کو رکھا تھام اب تلک
ورنہ تو کر چکی تھی قضا کام اب تلک

اور مقطع یوں ہے:

یکدل جو بول چال ہے اردو زبان کی
کرتا ہوں شاہ دہلی سے میں دام اب تلک

اس کے علاوہ ظفر کی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً ظفر کی غزل ہے:

جلوہ جب اس نے دکھایا مراجی جانتا ہے
کیا خدا ہے نظر آیا مراجی جانتا ہے[۵۴]

بیکدل نے اس زمین میں غزل کہی ہے جس کا ایک شعر ہے:

میں نے احوال کہا، مجھ کو دکھا زلف کا دام
انگلیوں کو جو لڑا ابا مراجی جانتا ہے

ظفر کی ایک اور غزل "خو تھی کسو کی" کے تتبع میں بیکدل کی غزل ہے:

مری سی بھلا آبرو تھی کسو کی   مری جاں رسن در گلو تھی کسو کی

اس غزل میں بعض نہایت عمدہ شعر نکالے ہیں:

نہیں باغباں چھیڑتا میں ترا گل   مجھے باغ میں آرزو تھی کسو کی
یہ بوئے وفا دیکھتے ہو جو مجھ میں   مجھے بلبلو جستجو تھی کسو کی

مقطع میں ظفر کی عظمت کا اعتراف یوں کیا گیا ہے:

شہنشاہِ دہلی سا ہو کون بیکدل   غزل بھی بھلا دوبدو تھی کسو کی

مولوی احمد بخش بیکدل جس طرح فارسی شاعری میں امیر خسرو دہلوی کے پرستار ہیں اسی طرح اردو شاعری میں بہادر شاہ ظفر، استاد ابراہیم ذوق سے بے حد متاثر ہیں۔ بیکدل نے ذوق کی وفات پر کوہِ نور لاہور میں اپنے تاثرات شائع کروائے تھے جس میں انہوں نے اپنی اور ذوق کے درمیان دہلی میں ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ قطعہ پچھلے باب میں درج کیا جا چکا ہے۔ بیکدل یقیناً بہادر شاہ ظفر کے کلام کی متانت، بے ساختگی اور صوفیانہ لب و لہجے سے اور ذوق کے پُر شکوہ آہنگِ شعر نیز علمی اور فنی طرزِ اظہار سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ بیکدل کے اپنے کلام میں بھی یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

بیکدل کے ہاں حسن و عشق اور تصوّف دو پسندیدہ موضوعات ہیں۔ بیکدل نے اپنے عاشقانہ طرزِ احساس اور جمال پرست رویّوں کا ذکر اپنی بیاضوں میں بار بار کیا ہے۔ یہ عاشقانہ رویّے ان کی

شخصیت کا حصہ ہیں تصوف کے مضامین نے ان روایتوں کو اور بھی دلفریب بنا دیا ہے۔ احساسِ جمال ان کے حواس، طرزِ احساس اور مشاہدے سے غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو سے واضح ہے:

پنہاں شدہ یکدل بمیانِ غزل خویش
تا بوسہ زند برلب تو چونکہ بخوانی

ذیل میں مولوی یکدل کی چند اردو غزلیں بطورِ انتخابِ کلام درج کی جاتی ہیں:

غزل

جاں میری اگر تری گلی جائے | پہنچے نہ کوئی اگر چلی جائے
واقف نہیں کوئی، میرے سر پہ | گر جائے بُری وگر بھلی جائے
اشکوں کے بہائے میں نے دریا | تس پر بھی یہ جاں مری جلی جائے
گلرو ترے منہ کی کیا کہوں بات | شرمندہ ہوئی جہاں کلی جائے
یکبارگی آگ لگ اٹھے گی | دوبارہ اگر حنا ملی جائے
چوکھٹ میں تری پہ سر رکھے ہے | گر آئے ہے قطب یا ولی جائے

اب دہلی سے تا بہ حیدرآباد
لاہور سے دھومِ یکدلی جائے

غزل

عارضِ پرنور ہے کیا خالِ دلبر کے تلے
چاند کے اوپر ہے اختر، چاند اختر کے تلے
سچ تو ہے ظالم کے سایہ سے بھی بچنا چاہیے
چین سے کوئی نہیں چرخِ ستم گر کے تلے

اے تمنائے شہادت، دم مجھے لینے تو دے
حسرتِ دیدارِ قاتل بھی ہے خنجر کے تلے

یا تو وہ دن تھے کبھی تلتے تھے پھولوں میں پڑے
اب فلک کے جور سے ہیں خاکِ بستر کے تلے

حالِ دل کا ہے یہی تیرے ستم سے اے صنم
شیشۂ نازک کو رکھ کر دیکھ پتھر کے تلے

یا الٰہی آرزو یکدل کی ہے تجھ سے یہی
حشر کو ہوں دامنِ آلِ پیمبرؐ کے تلے!

غزل

وہ میں ہی تھا کہ خود کو رکھا تھام اب تلک
ورنہ تو کر چکی تھی قضا کام اب تلک

یک جلوہ تیرے حسن کا مہتاب پر ہوا
جھانکا کرے ہے آ کے لبِ بام اب تلک

ساقی یہ چرخ دور ہلالی تو بھر چکا
خالی رہا ہے کیوں یہ مرا جام اب تلک

شورِ جنوں ہیں عیش میں تھا روز و شب غریق
میں نے نہیں سنا تھا ترا نام اب تلک

چیں چیں کرے ہے مرغِ دل اس دامِ زلف میں
آ ہوئے چیں سنبھل تو ستے ہے دام اب تلک

اس پند ہو جلوں تر سے ہندوئے خال پر
پر توسنِ فلک نہ ہوا رام اب تلک
گر اس کے دل کو میری طرف سے پھرا دیا
پادے نہیں ہے چرخ بھی آرام اب تلک
قطع نظر ہے خاص سے میں عام میں ملا
عامی نہیں سمجھتا مجھے عام اب تلک
یکدل جو بول چال ہے اردو زبان کی
کرتا ہوں شاہ دہلی سے میں دام اب تلک

۲- رسالہ شمسیہ اردو

مصنّفہ : مولوی احمد بخش یکدل چشتیؒ

رسالہ شمسیہ، مولوی احمد بخش یکدل کی اہم نثری تصنیف ہے۔ اس کتاب کا سببِ تالیف جیسا کہ مصنف نے بیان کیا شاہان گزشتہ کی سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے۔ چنانچہ بقول یکدل:

"یہی خیال ہوا کہ شاہانِ سلف کا حال اور ان کے تولد اور جلوس اور وفات اور مدفن کی کیفیت لکھی جاوے۔ . . . . اور عماراتِ قدیم مساجد اور معابد کا حال مشرح اگر کتابت میں آوے"۔

افسوس ہے کہ اس کتاب کا مدوّن نسخہ نہیں مل سکا۔ مولوی یکدل کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ۲۶ ورق راقم الحروف کو دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ جیسا کہ گزشتہ باب میں تحریر ہوا دو زبانوں (یعنی اردو اور فارسی) میں لکھا گیا تھا۔ مولوی یکدل اپنے معاصرین میں سب سے بزرگ ادیب تھے لہٰذا ان کی اردو نثر انیسویں صدی میں پنجاب کے نثری ادب کا اہم ترین نمونہ سمجھی جائے گی۔

مولوی یکدل کی نثر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اعلیٰ پائے کی ادبی نثر کے لیے مخصوص ہیں۔

مولوی یکدل فارسی زبان وادب کے استاد تھے۔ فارسی شعر کے آہنگ نے ان کی نثر کو داخلی ترنّم سے ہمکنار کیا ہے۔ اس قدر سادہ، سلیس اور بے تکلف نثر کے نمونے اس دور میں پنجاب تو ایک طرف، دہلی اور لکھنؤ کے ادبی مراکز میں بھی زیادہ تعداد میں میسّر نہیں۔ مولوی یکدل پنجاب میں مرزا غالب دہلوی کے ہم عصر ہیں۔ غالب کے خطوط کی نثر اور یکدل کی نثر میں مقابلہ کرنے سے یہ دلچسپ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ غالب جس اسلوبِ نثر کو علمی مضامین کے بیان کا وسیلہ نہ بنا سکے یکدل نے اسی اسلوب کو تاریخ کے صفحات مزین کرنے کا وسیلہ بنایا۔ یکدل چھوٹے چھوٹے سلیس اور خطِ منقسم میں چلنے والے جملے لکھتے ہیں۔ آہنگ کے چھوٹے چھوٹے واحد سے مرتّب کرتے ہوئے قرأت کو ڈرامائی لہجہ دیتے جاتے ہیں اور یوں پڑھنے والا اکتاہٹ سے دوچار نہیں ہوتا۔

انگریزی دور سے متاثر جدید اردو نثر کے اسالیب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علمی نثر میں جو کام انجمن پنجاب نیز سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں انجام دیا اس کی داغ بیل اس سے پہلے مولوی یکدل کے ہاتھوں پڑ چکی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یکدل نے بظاہر اردو نظم و نثر کی طرف دبے سے توجہ دی لیکن وہ اپنی بیاضوں میں اردو نثر کی اہمیت اور فصاحت و سلاست کی ذاتی پسندیدگی کا حوالہ ایک مدت سے دے رہے تھے۔

اس جگہ رسالہ شمسیہ سے ایک اقتباس بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

"نادر شاہ نے خبر پا کر قدم باہر خیمے سے رکھا اور رضا قلی میرزا فرزند کلاں کو واسطے استقبال کے بھیجا۔ شاہ نے خیمہ نثار کر کے بہ حسن و زیب چند قدم آگے بڑھ کر السلام علیکم کہا اور خیر مقدم اور نعم المجی کہا اور ہاتھ میں ہاتھ لے کر داخل خیمہ ہوئے اور ایک مسند پہ دونوں کا اجلاس ہوا۔ شاہ نے بہت سی تعظیم اور تکریم مہمانداری کی۔ سبحان اللہ! عجب مہمان و عجب میزبان۔ جب محمد شاہ تشریف لائے تو اس وقت جواہر کوہ نور اور دریائے نور دونوں طرف تاج کے سُفتہ کر کر باندھ آئے تھے۔ نادر شاہ نے اس کی چمک کی

تاب نہ لاکر کہا کہ یہ تاج جو میرے سر پہ ہے آپ سر پر رکھ لیں اور یہ تاج جو آپ کے سر پہ ہے، میرے سر پر رکھ دیں کہ تم ہمارے دینی بھائی ہو اور دستار بدلی اس کا نام رکھا جائے۔ کہتے ہیں محمد شاہ نے سب جواہرات اور خزانے سے ہاتھ دھوئے۔ نادر شاہ نے بہ حیلہ ایسا حیلہ کیا کہ محمد شاہ کو کچھ نہ ملے، میرے پاس رہے پہلے ہی ایسا داؤ دیا کہ کسی ذی فہم کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ الغرض دونوں بادشاہ بسواری پالکی داخل قلعہ مبارک شاہجہان آباد ہو گئے اور قلعہ مبارک میں اور شہر میں آئین بندی ہوئی اور وہ آتش بازی چلی کہ سو برس کی شب براتوں کا سامان یک جا جمع ہوا اور ساری رات محفل رقص و نشاط اور سرود رہی۔"

۳۔ دیوان حافظ؛ منظوم اردو ترجمہ

از: مولوی یکدل

اس اردو تصنیف کا حوالہ مولوی احمد بخش یکدل نے اپنی بیاضوں میں دیا ہے۔ باوجود تلاش اور کوشش کے اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ چشتی خاندان کے کسی فرد کے پاس اس کا نسخہ نہیں ہے۔ مولانا مسعود علی چشتی، پروفیسر قرۃ العین چشتی وغیرہ اس کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔ یہ کتاب غالباً مولوی یکدل کے آخری ایام میں ہی کھو گئی ہوگی کیونکہ مولوی حامد علی چشتی نے اپنی یادداشتوں میں اپنے خاندانی کتب خانے کی جو فہرست دی ہے اس میں اس کتاب کا نام نہیں ہے۔ مولوی یکدل نے بھی نام کے علاوہ اس کتاب کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی۔

۴۔ واسع باری از مولوی احمد بخش یکدل

اس کتاب کے بارے میں گزشتہ باب میں لکھا جا چکا ہے کہ اس کا موضوع اردو نہیں بلکہ

یہ فارسی لغات کے پنجابی مترادفات پر مشتمل ہے اور نظم کی بحر بھی پنجابی ہے۔ اس وجہ سے اردو تصانیف میں اس پر سیر حاصل بحث کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

۵۔ تحقیقاتِ چشتی

مصنفہ مولوی نور احمد چشتی

تحقیقاتِ چشتی، مولوی نور احمد چشتی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب تقریباً سوا سو سال سے شائقینِ سوانح اور تاریخ کے دلوں پر حکمرانی کر رہی ہے اور پنجاب میں ثقافتی اور صوفیانہ سرگرمیوں کی کوئی تاریخ اس کے حوالے یا ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس کے موضوع کی وسعت صدیوں پر محیط ہے۔ یہ کتاب برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک پنجاب میں صوفیائے کرام کی سرگرمیوں اور ان کے تہذیبی اثرات کا دفتر ہے۔ اس کتاب کو ہر دور میں پنجاب کی سیاسی تاریخ، فرہنگ اور آثار پر ایک اہم دستاویز مانا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نادر تالیف کی یہ اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

تحقیقاتِ چشتی، مولوی نور احمد چشتی کی آخری اردو تصنیف ہے۔ اس سے پہلے وہ اردو نثر میں بے شمار تصانیف شائع کر چکے تھے، مثال کے طور پر یادگارِ چشتی، عجائباتِ چشتی، تحفۂ چشتی وغیرہ نیز اردو شاعری میں بھی ان کا دیوان تحقیقاتِ چشتی سے بہت پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ ہر چند کہ دیوان کو اشاعت کا موقع نہ ملا تاہم مولوی نور احمد چشتی ان کتابوں کے حوالے سے نظم و نثر میں ایک مشاق شاعر اور ادیب تسلیم کیے جاتے تھے۔ پنجاب پر انگریزوں کے قبضے یعنی ۱۸۴۹ء کے بعد جن لوگوں نے اردو کی ترویج کو ملکی اور قومی سطح پر انجام دیا۔ ان میں مولوی نور احمد چشتی کا نام سرِ فہرست ہے۔ ۱۸۴۹ء کے بعد پنجاب، کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا کام سرکاری سرپرستی میں شروع ہوا اور حصولِ علم کی غرض سے بے شمار تصانیف سامنے آئیں۔ غرض کوئی بھی ہو اس حوالے سے پنجاب کے بارے میں علمی معلومات کا خزانہ جمع ہو گیا اور اردو ادب کی خوش بختی یہ ہے کہ یہ سب مواد اردو زبان میں ترتیب

دیا گیا۔ صرف چند کتابیں ایسی ہیں جو فارسی زبان میں ہیں مثلاً بوٹے شاہ کی تاریخ پنجاب، مفتی علی الدین کی تصنیف عبرت نامہ یا سید احمد شاہ بٹالوی کی تاریخ پنجاب وغیرہ۔ باقی کتابوں میں سے اکثر اردو میں ہیں جن میں سفرنامہ امین چند، تاریخ پنجاب و تاریخ لاہور از کنہیا لال ہندی، حالات ضلع لاہور از مفتی تاج الدین، تاریخ مخزن پنجاب از مفتی غلام سرور لاہوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان سب کتابوں میں کچھ باب مشترک ہیں اور باقی ابواب میں اسلوب کے فرق کے ساتھ مواد تقریباً ایک جیسا ہے۔ مثلاً ان سب کتابوں میں سکھوں کی سیاسی تاریخ کو بطور تاریخ زیر بحث لا کر پنجاب میں خالصہ عہد کو تاریخ کا بدترین اور تاریک ترین عہد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انگریزی عہد کی برکات کو گنواتے ہوئے جنگِ آزادی کو مفسدہ کہا گیا ہے الحاقِ پنجاب کے غاصبانہ عمل کو حق بجانب اور جائز ثابت کیا گیا ہے۔ پنجاب کی معاشرت اور رسم و رواج پر ایک ایک حصہ مخصوص کیا گیا ہے وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے گزیٹیئر مرتب کراتے تو ان کتابوں سے خام مواد کا کام لیا گیا۔

تحقیقاتِ چشتی اور یادگارِ چشتی بھی انہی کتابوں میں سے ہیں لیکن فی الحقیقت کتابیں ہونے کے باوجود ان کتابوں کے مصنف مولوی نور احمد چشتی کا دائرہ کار دوسرے مصنفین سے الگ ہے۔ یادگارِ چشتی پر بحث الگ عنوان کے تحت ہوگی۔ یہاں تحقیقاتِ چشتی کے بارے میں چند اہم نکات کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تحقیقاتِ چشتی پنجاب کی دوسری تاریخوں کی طرح سیاسی کوائف پر مبنی نہیں۔ بلکہ جس طرح دوسرے مصنفین نے سیاسی احوال کے ساتھ ضمناً پنجاب کی فرہنگ اور یہاں کے تاریخی اور مذہبی آثار کا بھی ذکر کر دیا ہے اسی طرح مولوی نور احمد چشتی نے تاریخی اور مذہبی آثار اور پنجاب کی ثقافت اور فرہنگ پر کتاب مرتب کرتے ہوئے ضمناً اس خطے کی سیاسی تاریخ پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی فہرستِ مطالب کا اجمالی خاکہ دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو یہ ہے:

۱۔ ہندو عہد ۲۔ تذکرہ شاہانِ اسلام
۳۔ سکھوں کا عہد ۴۔ احوالِ صوفیاء بزرگاں
۵۔ تکیے اور مختلف قبور ۶۔ مرطبیاں اور غیر مسلم فقیر

۷۔ باغات ۸۔ مواضع اور متفرق عمارات

۹۔ مساجد ۱۰۔ مقابر صوفیاء

۱۱۔ مقابر سلاطین و دیگر

مولوی نور احمد چشتی کے سامنے ایسے کام کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ اس کتاب کی پوری تنظیم یا سکیم ان کے اپنے تخیل کا کمال تھا۔ مولوی نور احمد چشتی جیسا کہ گزشتہ باب میں بیان ہوا، ۱۸۴۹ء کے بعد انگریز افسران کو اردو پڑھانے پر مامور ہو گئے تھے۔ اس ماموریت نے ان کے تعلقات کا دائرہ وسیع کر دیا تھا۔ ہر ذمہ دار انگریز افسر اپنا منصب سنبھالنے سے پہلے ان سے اردو زبان کی سند حاصل کرتا تھا۔ ان کی قابلیت اور علم و فضل سے متاثر ہوتا تھا اور پھر جب تک پنجاب میں اس کا تقرر رہتا دوستی اور افہام و تفہیم کی یہ فضا برقرار رہتی۔ مولوی نور احمد چشتی نے اپنی اردو تالیفات کے لیے ان تعلقات سے کافی حد تک فائدہ اٹھایا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی ہر کتاب یا تو کسی کی فرمایش پر لکھی گئی ہے یا کسی انگریز افسر کے فائدے کے واسطے تحریر کی گئی ہے۔

تحقیقاتِ چشتی کا خاکہ مولوی نور احمد چشتی نے ڈبلیو گولڈ سٹریم اسسٹنٹ کمشنر پنجاب کے سامنے پیش کیا جنہوں نے پنجاب میں ملازمت کے وقت ۱۸۶۲ء میں ان سے اردو پڑھی تھی۔ مولوی نور احمد نے مسٹر گولڈ سٹریم سے مالی اعانت کے ساتھ ساتھ اثر و نفوذ استعمال کرنے کی خواہش بھی کی، جس کی تعمیل ہو گئی۔ چنانچہ مسٹر گولڈ سٹریم، مولوی نور احمد چشتی کے برادر زادے مولوی حامد علی چشتی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں جب اول پنجاب میں ۱۸۶۲ء میں آیا تو نور احمد چشتی سے فارسی اور اردو پڑھتا رہا اور پھر ۱۸۶۴ء میں جبکہ میں وہاں اسسٹنٹ کمشنری پر تعینات ہوا، نور احمد چشتی ان دنوں لاہور میں، اگر صرف وہی نہیں، تو اول منشی یا دیسی زبانوں کے اتالیق تھے۔

۱۸۶۵ء میں جبکہ میں ان سے پڑھتا تھا انہوں نے لاہور اور اس کے مضافات

کی قدیم عمارات کے حالات پر کتب لکھنے کے لیے کچھ میرے خرچ سے بھی حالات جمع کیا تھا اور یہ کتاب بعد ازاں "تحقیقاتِ چشتی" کے نام سے طبع ہوئی۔ یہ نہایت قابلِ قدر تجسس سے لکھی گئی تھی اور اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو بڑی تقطیع کے ۵۰۰ یا ۶۰۰ صفحوں پر شائع ہوئی تھی۔ جب کبھی لاہور کی قدیم عمارات کی تفصیل لکھی جائے گی تو اس کتاب سے بیش قیمت امداد ملے گی۔"

مولوی نور احمد چشتی نے کتب کے سببِ تالیف میں کولڈ سٹریم ہی کو کتاب کا محرک قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"اب ان ایام فرصت انجام میں جنابِ خداوند نعمت آقائے نامدار عالی وقار، قدر دانِ اہلِ علم و ہنر، مجموعہ اخلاق برگزیدۂ آفاق، صاحب فیض عمیم جناب مسٹر ولیم کولڈ سٹریم عالی جاہ بہادر دام اقبالہٗ اسسٹنٹ کمشنر نے اس کمترین کو حکم دیا کہ حالاتِ عمارات و مزارات و مقابر و مساجد نواحِ لاہور مفصل تحریر کر دوں۔"

مواد کی فراہمی اور مسودات کی پاک نویسی کے لیے مولوی نور احمد چشتی نے جن صاحبِ علم اور ماہرینِ تاریخ سے مدد لی ان میں مولوی صاحب کے والد مولوی احمد بخش یکدل اور ان کے دوست مفتی غلام سرور لاہوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کی ڈائریوں میں تاریخی اور سوانحی مواد کی کثرت ہے یکدل کو تاریخ، ادب، فنونِ لطیفہ اور آثار سے دلچسپی تھی۔ تصوف ان کی ذات کا حصہ تھا۔ ان موضوعات سے متعلق ان کی تحقیقی یادداشتیں موجود ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی نے نہ صرف ان سے رہنمائی حاصل کی بلکہ ان سے معلومات لے کر انہیں بعض جگہ اپنے پیرائے میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً مخدوم علی ہجویری حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت مادھو لال حسینؒ اور حامد قادری کے ترجمے فارسی زبان میں یکدل کی بیاضوں کا حصہ ہیں۔

مفتی غلام سرور لاہوری، تحقیقاتِ چشتی کی تدوین اور مسودے کی تیاری میں مولوی نور احمد کے معاون تھے۔ اس کام کے لیے انہیں غالباً معاوضہ ملتا تھا۔ مولوی نور احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ مفتی غلام سرور کا تذکرہ خزینۃ الاصفیا دراصل تحقیقاتِ چشتی کے مسودوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"بوقت تصنیف کتاب ہٰذا میاں غلام سرور صاحب مفتی ایک کتاب الموسوم بہ خزینۃ الاصفیاء چند مدت سے حالاتِ اولیاء اللہ تصنیف کر رہے تھے اور ان کو باوجود سعی موفورہ اکثر حالات خصوصاً حال حضرات نواح لاہور دستیاب نہ ہوتے تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ کمترین کو منجانب حکام یہ حکم ملا ہے تو میرے پاس تشریف لا کر مظہر ہوئے کہ یہ حکم آپ کو ملا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھ غریب پر نہایت مہربانی کی ہے بعض مدت سے میں متلاشی حالات حضرات نواحِ لاہور کا تھا اور وہ دستیاب نہ ہوتے تھے کیونکہ حضرت سجادہ نشینان خدا جانے کس واسطے حال اپنا بیان نہیں کرتے۔ امیدوار ہوں کہ جب آپ کو باقبالِ سرکار یہ حالات دستیاب ہوں تو آپ مجھ کو بھی نقل ان کی عنایت کریں تو نہایت شاکر ہوں گا۔

لہٰذا اس عاجز نے ان کو بخیالِ محبت کہا کہ بقول مرتضوی "جزاء البخل عند اللہ نار" ہر چہ در بغداد ملک خلیفہ مگر بایں شرط کہ آپ میرے مسودات کو نقل صاف کر کے تحریر کر دیا اور اجرتِ تحریر لے لیا کریں اور جو جو حالات مطلوب ہوں بے شک اپنی کتاب میں درج کریں۔

سو انہوں نے قبول فرمایا اور تمام حالات نواحی لاہور اس کتاب سے لے کر اپنی کتاب میں درج کیے اور اس وجہ سے اکثر حضرات کی تاریخیں مصنفہ ان کی درج ہیں۔"[1]

خزینۃ الاصفیا مصنفہ مفتی غلام سرور کے اندراجات اور تراجم کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو مولوی نور احمد کی بہت سی باتیں محلِ نظر معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بات تو قرین قیاس ہے کہ مفتی صاحب نے تحقیقات چشتی کے لیے جمع شدہ خام مواد سے استفادہ کرنے کی خواہش ظاہر کی ہو۔ یہ مواد مولوی نور احمد کی ذاتی کاوش یا تحقیق کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اکثر مطالب لوگوں نے انہیں مدوّن صورت میں بغرض اندراج ارسال کیے تھے۔

اس سے استفادے کا حق سب مصنفین کے لیے یکساں ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تحقیقاتِ چشتی اور خزینۃ الاصفیا کے موضوعات اور ان کے مصنفین کے نقطہ ہائے نظر میں اشتراک کے باوجود کافی اختلاف ہے۔ تحقیقات، حضرات صوفیا اور بزرگانِ دین کے حالات، آثار اور خاندانی کوائف کی تفصیل مہیا کرتی ہے جبکہ خزینۃ الاصفیا میں بے حد اختصار سے کام لیتے ہوئے محض صوفیا، علما اور بزرگانِ دین کے مختصر سوانحی کوائف اور کشف و کرامات کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ مفتی غلام سرور نے اگر تحقیقات کے مسودے سے استفادہ کیا ہوگا تو خزینۃ الاصفیا میں ان مطالب کے اندراج کے وقت انہیں از سرِ نو اپنے ڈھب سے تسوید اور ترتیب دی ہوگی۔ کیونکہ مفتی صاحب کے جس تذکرے میں سوانح اور کوائف کی تفصیل درج ہے وہ ان کا اردو میں لکھا ہوا تذکرہ حدیقۃ الاولیاء ہے اور اس کا ذکر مولوی نور احمد چشتی نے نہیں کیا۔ تحقیقات کے مسودے سے مفتی صاحب نے جس قدر بھی استفادہ کیا، اس کے برعکس مولوی نور احمد کو جو خدمات پیش کیں وہ معمولی نہیں۔ پوری تحقیقاتِ چشتی میں زیادہ تر تاریخی مادے مفتی غلام سرور ہی کے موزوں کیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی نور احمد کے سوانح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تنگی معاش، عدمِ فرصتی کو اگر کسی کی توجہ اور محنت نے تحقیقاتِ چشتی جیسے عظیم علمی کارنامے کی تکمیل کے قابل بنایا تو وہ مفتی غلام سرور ہی تھے۔ مولوی نور احمد نے ان کا شکریہ ادا نہ کر کے وضع داری کا ثبوت نہیں دیا۔

تحقیقاتِ چشتی اپنے عہد کی عظیم الشان تصنیف ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی، ادبی اعتبار سے بھی اور فنی اعتبار سے بھی۔ تحقیقاتِ چشتی کو پنجاب میں "آثار الصنادید" کا درجہ حاصل ہے بلکہ یہ کام بعض پہلوؤں سے سرسید کے کام سے عظیم تر اور مشکل تر ہے۔ کیونکہ مولوی نور احمد کو مآخذ خود مہیا کرنے پڑے۔ ان کے سامنے پنجاب کے آثار اور احوالِ صوفیا پر کوئی مفصل کتاب نہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اس ضخیم کتاب میں بعض ایسی خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو اعلیٰ پائے کے علمی کاموں کا حصہ ہوتی ہیں۔

تحقیقاتِ چشتی اردو کے نثری ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل تین سو سے اوپر مطالب کی تحریر میں اسلوب اور بیان کی یکسانیت ایک بہت بڑا کام ہے جسے مولوی نور احمد چشتی جیسے تجربہ کار اور مشاق ادیب نے انجام دیا۔ تحقیقاتِ چشتی کی نثر سلاست، روانی اور متانت

میں بے مثال ہے۔ انگریزوں کے اتالیق ہونے کی حیثیت سے مولوی نور احمد چشتی کو انگریزی میں بھی دسترس حاصل تھی اور وہ انگریزی تحریر کے ڈھب سے آشنا تھے۔ اس لحاظ سے تحقیقات چشتی میں اس اسلوب کی تاثیر کا وجود بعید از قیاس نہیں۔ اس کے علاوہ مولوی نور احمد چشتی بنیادی طور پر مشرقی زبانوں کے استاد تھے اور ان کی تحریر فارسی اور عربی اسالیب ادب کی گود میں پروان چڑھی تھی لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے مولوی نور احمد چشتی کے اسلوب میں مشرق و مغرب کا امتزاج ہے، ہر چند کہ مغرب کا کم اور مشرق کا زیادہ ان کے ان جملوں کی مفرد اور غیر ساخت ان کے مغربی اسلوب سے آشنائی کا پتہ دیتی ہے اور انداز کا عالمانہ دروبست نیز نثر میں شاعرانہ آہنگ انہیں مشرق کی ادبی روایات سے دور نہیں ہونے دیتا۔

تحقیقات چشتی کی نثر میں سب سے اہم خوبی اس کا براہِ راست اور بلا تکلف ابلاغ ہے۔ مولوی نور احمد واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس قدر عام فہم زبان میں مرقع نگاری کا ڈھب اردو نثر کو انیسویں صدی کے آخر میں نہیں بلکہ تحقیقات چشتی کی صورت میں انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی نصیب ہو گیا تھا۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

میلہ چراغاں

"چراغوں کے میلے کا تو یہ حال ہے کہ کئی میلوں سے ہزارہا مخلوقات بامیل تمام مائلِ زیارات ہو کر آتے ہیں اور باوجود اس قدر وسعتِ باغ شالامار کے وہاں قدم رکھنے کی جگہ اس روز نہیں رہتی۔ سبحان اللہ! اس روز وہاں عجب لطف ہوتا ہے کہ بوٹے بوٹے کے نیچے ناچ و راگ رنگ ہوتا ہے اور ایک دن اور ایک رات زائرین و حاضرین کی کثرت کا یہ حال ہوتا ہے اور باغ اور مقام خانقاہ پر اور وہاں سے تا دروازہ لاہور اس قدر ازدحام مخلوق کا ہوتا ہے، کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اور اس ایام میں بھی باوجود خلق بے کاری سے

نالاں ہے۔ امرتسر سے بسواری ریل ساٹھ ستر ہزار آدمی تخمیناً شریکِ جلسہ چراغاں ہوتا ہے اور سواران یکہ و پیدل و بگی و اونٹ وغیرہ ریل سے علیحدہ آتے ہیں اور خرید و فروخت اشیائے حلوائیاں کا کیا خیال کیا جاوے" ۔ ص ۴۲۰

خانقاہ

حضرت شاہ شرف کی خانقاہ جاتے ہی داہنے طرف سڑک جیل کے متصل ٹیلہ ہائے جاںداری موجود ہے۔ یہ مزار ایک چبوترہ خشتی پر واقع ہے اور اس چبوترے پر تین قبریں ہیں۔ ایک تو شاہ شرف کی دوسری ان کے مرشد محمد فاضل صاحب کی اور تیسری ان کے مرید محمد عزیز اللہ کی اور کوٹھے کے شرق رویہ ایک قبر پرانی چبوترہ پر موجود ہے۔ یہ قبر مہر شاہ نامی مرید حضرت شاہ شرف کی ہے اور گرد نواح قبرستان عامہ ہے اور جو چاہ شرق رویہ ہے اس کا پانی بہت اچھا شیریں ہے"۔ ص ۵۲۲

حالات حضرت احمد یار صاحب ۔ مصنف کے چشم دید

"اگرچہ راقم بھی قدیم سے ساکن لاہور ہے اور وہ حضرت بھی مدت مدید سے یہاں فروکش ہیں مگر کم تر ہی کا اتفاق صحبت ظاہرا کبھی نہ ہوا تھا مگر اکثر اوصاف ان کے لوگوں سے سنے جاتے تھے ...... اب میرا بھی اتفاق ملاقات بمراد تحقیقات ہذا پڑا۔ سبحان اللہ! عجب طبیعت کا مرد ہے کہ ہر وقت قال اللہ اور قال الرسول فرماتے رہتے ہیں اور توحید کے مسائل بوجہ احسن بیان فرماتے ہیں کلام فاضلانہ و عارفانہ رکھتے ہیں۔ وضع صورت آپ کی یہ ہے کہ اوّل تو مدت بارہ چودہ سال صرف ایک چادر ستر عورت کے واسطے زیر و بالا رکھتے تھے اور

سر برہنہ رہتے تھے۔ اب عرصہ چھ سات سال سے تہ بند و کرتا و مربع وسرپیچ رکھتے ہیں اور جوتا بھی زردوزی، لباس ظاہر اامیرانہ مگر بشکل فقیرانہ وضع دار رکھتے ہیں۔ اگرچہ سرکار کی جانب سے آپ کو کچھ جاگیر و پنشن نہیں مگر ہمیشہ خوش پوش و خوش لباس رہتے ہیں"۔ ص ۶۴۹

یہ اقتباسات مختلف مقامات سے مختلف مواقع کے اظہار کے نمونے کے طور پر انتخاب کیے گئے ہیں تاکہ مولوی نور احمد کی قدرتِ ابلاغ کا اندازہ ہو سکے۔

تحقیقاتِ چشتی کی تصنیف کا کام ۱۸۶۴ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ مولوی نور احمد چشتی اور ان کے دوستوں میں سے مفتی غلام سرور لاہوری اور مولوی غلام فرید نے قطعاتِ تاریخ موزوں کیے تھے۔ مفتی غلام سرور کا ایک قطعہ درج ذیل ہے۔ اس میں بکمال چشتی سن یعنی ۱۲۸۱ اسمت ہے:

بلطفِ حق ہوئی جس دم تھی تیار عجب یہ عمدہ تصنیفاتِ چشتی
لکھی سرور نے تب تاریخِ تالیف کہ ہو مقبول تحقیقاتِ چشتی

تحقیقاتِ چشتی کی تالیف میں جو اہم مصادر استعمال کیے گئے، ان کی فہرست کتاب مذکور طبع لاہور ۱۹۶۴ء کے صفحہ ۲۸ پر موجود ہے۔

اس فہرست میں بعض نہایت اہم اور مستند کتابوں کے نام بھی موجود ہیں۔ تحقیقاتِ چشتی کے بارے میں یہ خیال آرائی کہ وہ محض سینہ بسینہ روایات اور شنید پر مشتمل ہے، اس فہرستِ ماخذ کی موجودگی میں بے بنیاد ہو جاتی ہے[11]

۶۔ یادگارِ چشتی

مصنفہ: مولوی نور احمد چشتی

مولوی نور احمد چشتی کی اردو تصانیف میں اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں اہل پنجاب کے رسم و رواج، طرزِ معاشرت، عقائد اور عوامی احساسات کو موضوع بنایا گیا ہے

کتاب انیسویں صدی کے پنجاب کو دیکھنے کی ایک ایسی دیدگاہ اور مرکزِ نظارہ ہے جس سے اس دور کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا کافی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں اہل پنجاب کو مختلف معاشرتی اور طبقاتی گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کے رسم و رواج اور پھر ان کے گروہی اختلافات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں جارج او بارنس کے پاس خاطر سے تصنیفی مرحلے میں داخل ہوئی اور سی۔ ڈبلیو۔ فورمن کی تشویق پر تکمیل تک پہنچی۔ ۱۸۵۸ء میں مطبع کرانیکل لاہور نے بڑی تقطیع پر اسے شائع کیا۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں راقم الحروف نے تین سال محنت کی۔ اس پر مفصل مقدمہ تحریر کیا اور متن کی تفہیم کے لیے ضروری مقامات پر حواشی لکھے۔ اس ایڈیشن کو ۱۹۷۵ء میں مجلس ترقی ادب، لاہور نے شائع کیا۔

"یادگار چشتی" میں عوامی رسم و رواج کو یوں ترتیب دیا گیا ہے کہ بچے کی پیدائش سے لے کر آدمی کی وفات تک تمام رسوم کا مرحلہ وار بیان کیا ہے۔ پھر ہر مرحلے کو مختلف معاشرتی گروہوں کے حوالے سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب "دستور تولد و تناسل اہل اسلام" ہے جس میں خوشی کے موقع پر اہل پنجاب کے ردِ عمل کو مختلف شکلوں میں دکھایا گیا ہے۔ اس طرزِ اظہار میں دین اور دنیا دونوں سے وابستگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان رسوم میں بچے کی پیدائش پر اگر اس کے بازو سے اسمائے الٰہی کا تعویذ باندھا جاتا ہے تو اس جشنِ مسرت میں اہلِ طرب اور اہلِ رقص و سرود کا شامل ہونا بھی ضروری ہے۔

"یادگار چشتی" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے پنجاب میں معاشرتی واحدے اپنے کام اور پیشوں کے اعتبار سے تشکیل پاتے تھے۔ مولوی نور احمد نے جہاں سید، شیخ اور راجپوتوں کو ذاتوں اور گوتوں میں دکھایا ہے وہاں کناری باف، شالی کوب، چھپر بند، دبہ گر، مجلدی اور پھلیرے یعنی پھول بیچنے والے بھی الگ معاشرتی شناخت رکھتے ہیں۔

یادگار چشتی کی اردو نثر اظہار و ابلاغ کی خوبیوں سے مزین ہے۔ اس کتاب کی عبارت کا آہنگ اگرچہ تحقیقاتِ چشتی کی نسبت بُریدہ اور نامرتب ہے اس کے باوجود اظہارِ مطالب کے لیے کامیاب ہے اور

دلچسپی سے خالی نہیں۔ مغلق اور ناہموار الفاظ کا استعمال بہت کم ہے۔ حتیٰ کہ فارسی زبان کے الفاظ بھی التزاماً کم استعمال کیے گئے ہیں۔ اس میں بھی انگریزوں کے طرزِ اظہار کی نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس دور کے انگریز پسند دانشمندوں کی طرح "حضرت محمد صاحب" لکھا ہے۔ اس کتاب کا لہجہ بے حد دھیما اور علمی مطالب کے اظہار کے لیے موزوں ہے۔ چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

کناری باف

"کناری باف بھی ایک قوم ہے۔ یہ اوّل میں ڈھالی لوگوں کا کام ہے۔ بعدازاں ہر قوم میں سے ان میں کسب شریک ہو گئے۔ یہ لوگ گوٹہ کناری بُنتے ہیں۔ جو کوئی غیر قوم ان میں ملنا چاہتا ہے تو وہ ان کی شاگردی کرتا ہے اور بہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر سُرگباشی جب کوئی شریک یعنی شاگرد بننا چاہتا تھا تو کسی کناری باف کے پاس جاتا تھا اور مبلغ پچیس روپیہ سیل کا دے کر شاگرد ہوتا تھا۔ اور سیل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں سے نصف تو مال سرکار ہوتا تھا اور نصف مال برادری کا۔ اور یہ دونوں حصے جمع رہتے تھے۔ برس کے بعد سب استادوں نے حساب کیا۔ سرکار کا حصہ تو سرکار نے داخل کیا اور برادری کا حصہ برادری میں کھانا پکا کر تقسیم ہوا۔ بلکہ باغ میں جمع ہوتے اور وہاں کھانا بھی پکایا اور ناچ راگ رنگ بھی کرایا اور جب کوئی شاگرد کام سیکھ چکا اور اپنی دکان خود بنانے لگا تو پھر استاد کو کوئی دس، کوئی بیس روپے دیتا تھا اور ہمراہ اس کے پوشاک۔ یہ روپیہ بھی نصفا نصفی مال سرکار تھا"۔ : ص ۱۲۵

پھلیرا

"فروری اور مارچ میں گلفروش اکثر گلاب کے پھول لاتے ہیں۔ اس موسم میں ان

کی فروخت کا بازار گرم رہتا ہے یعنی کوئی تو عرق گلاب کے واسطے پھول لیتا ہے اور کوئی گلقند بنواتا ہے اور یہ دونوں چیزیں بکثرت تیار ہوتی ہیں۔ کیونکہ مریضوں کے واسطے بہت کام میں آتی ہیں اور ہر ایک علی قدر مراتب گلاب کے پھول گھر میں عورتوں کے پہننے کے واسطے لے جاتا ہے۔ بعضے گلاب کے ہار بنوائے جاتے ہیں اور بعضے کانوں کے واسطے گچھے بنوا کر لے جاتے ہیں۔ گچھے کے معنی ہیں کہ دو تین پھولوں کو ایک دھاگے میں پرو یا اور بند کیا۔ پھر اس گچھے کو عورتیں بالیوں میں پہنتی ہیں اور اسی موسم میں گل بید مشک آتا ہے وہ بھی عرق کے واسطے بہت بکتا ہے اور پھر ماہ جولائی اور اگست اور ستمبر اور اکتوبر میں موتیا کے پھول آتے ہیں۔ یہ پھول بہت اچھا مست بو ہوتا ہے۔ خوشبو اس کی بدرجۂ کمال مست اور دلچسپ۔ جب اس کو سونگھیے تو دل خواہ مخواہ خوش ہوتا ہے۔ اس پھول کو اکثر عورتیں کان میں پہنتی ہیں اور ان کے ہاروں کا بھی بہت بکاؤ ہوتا ہے۔ جوَن سے پھول کہ عورتیں کان میں پہنتی ہیں وہ اکثر دو دو پھول ہوتے ہیں۔ بعضے دھاگے سے جوڑتے ہیں اور بعضے خدا کی قدرت سے دو دو ہوتے ہیں۔ اس کا نام لڑکی ہے۔ ہر قوم میں اس پھول کا بہت بکاؤ ہوتا ہے۔" : ص ۱۸۷

۷۔ دیوانِ چشتی اردو

تصنیف : مولوی نور احمد چشتی

دیوانِ چشتی کے دو مخطوطے بخطِ مصنف ہمارے کتاب خانے میں ہیں :

۱۔ سائز ۳۰ × ۲۰ ۔ نہم ماہ رمضان ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۱۔ مارچ ۱۸۶۲ء منگل کے دن لاہور میں مکمل ہوا۔ اس نسخے کے[۱۶] آخر میں حاکمانِ وقت کی توجہ، انعام اور صلے کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔

اس نسخے کا کاغذ ولایتی ہے جسے ایرانی اصطلاح میں ترمہ کہتے ہیں ۔

۲۔ سائز ۲۲ × ۱۸ ۔ کاغذ سفید بخارائی ۔ دیمک خوردہ ۔ خط شکستہ ۔ پہلے صفحے پر لکھا ہے :

"مصنف دیوان فقیر نور احمد متخلص بہ چشتی لاہوری عفی عنہ ۔"

یہ قلم بھی مصنف کا ہے ۔ یہ نسخہ مصنف کے بھائی مولوی محمد علی پسر دلی کے پوتے مولوی ممتاز علی چشتی کی ملکیت رہا ہے ۔

ان دونوں نسخوں میں غزلیات کی تعداد یکساں ہے ۔ اس کے علاوہ مخمس ، واسوخت اور رباعیاں بھی دونوں نسخوں میں ایک جیسی ہیں ، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چشتی نے ۱۸۶۴ء کے بعد یا تو شاعری کی طرف توجہ نہیں کی ، کیونکہ اس زمانے سے پہلے اور بعد وہ تحقیقات چشتی کی تدوین اور بعدہٗ اشاعت کے سلسلے میں مصروف تھے ۔ دیوان کے دونوں مخطوطے ایک ہی سال کے کتابت شدہ معلوم ہوتے ہیں یا ممکن ہے مخطوطہ نمبر ۲ کچھ دیر پہلے کا ہو کیونکہ بے تاریخ ہے ۔

دیوان اردو کی تفصیل یوں ہے :

غزلیات :	۱۴۷
مخمس :	۴
واسوخت :	۱
رباعیات :	۲
مرثیہ :	۱
مادہ ہای تاریخ :	۲
مناجات :	۱

مولوی نور احمد چشتی کا اردو کلام بعض خصوصیات کی بنا پر قابل توجہ ہے ۔ ان کی وضاحت سے پہلے لازم ہے کہ اس ماحول کے بارے میں چند باتیں ذہن نشین کر لی جائیں جس میں چشتی کی شاعری وجود میں آئی ۔

چشتی کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کا ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کی حکومت تھی۔ اس عہد کی نمایاں خصوصیت تاریخ نویسی ہے۔ شعر و شاعری مخصوصاً اردو زبان میں شاعری اور نثر کا رواج کم تھا۔ کیونکہ سرکاری زبان فارسی اور عوامی زبان پنجابی تھی۔ اردو کو محض مسلمانوں کی تہذیبی زبان کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اردو میں صرف وہ شاعر یا ادیب لکھتے تھے جو یا تو مسلمان تھے یا مسلمانوں کی تہذیب ان کے اندر رچ بس چکی تھی۔ دربار کی طرف سے اردو شاعری یا ادب کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں تھی۔ رنجیت سنگھ کے جانشینوں میں سے راجہ شیر سنگھ علم و ہنر کا قدر دان تھا اور فنونِ لطیفہ کا بھی ذوق رکھتا تھا۔ اس نے فارسی نظم و نثر کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی دلچسپی لی اور بعض اردو شاعروں کی قدر دانی کی۔ مثلاً نثار علی نکہت اور مولوی غلام حسن خرم اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ یہ دو نام منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ممکن ہے اور بھی اردو شاعر اس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوں۔ راجہ شیر سنگھ کو زندگی نے مہلت نہ دی اور اردو شاعری کی خالصہ عہد میں سرپرستی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

ان حالات میں کسی کا اردو شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کرنا اور اس پر اضافہ یہ کہ صاحبِ دیوان ہونا بجائے خود ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے اردو شعراء مثلاً فقیر سید نور الدین منور، دیوان امر ناتھ اکبری، مولوی احمد بخش یکدل، مولوی نور احمد چشتی، مولوی غلام حسن خورم کا کلام اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے تو بار ارزش ہے لیکن مقدار کے اعتبار سے بے حد مختصر اور ناچیز ہے[۱۷]۔ مولوی یکدل کی معلومہ غزلوں کی تعداد پچاس سے بھی کم ہے۔ مولوی فرید کا اردو دیوان دستیاب نہیں۔ فقیر نور الدین منور نے اپنے فارسی دیوان کے حواشی پر اردو غزلیں کہی ہیں لیکن ان کے موضوعات نعت اور مناقب سے تجاوز نہیں کرتے۔ گویا اس دور کی اردو شاعری کی نمائندگی ایک لحاظ سے صرف تین دیوانوں کو نصیب ہوئی ہے:

۱۔ دیوانِ خورم بعنوان مضحکاتِ خورم

۲۔ دیوانِ اکبری اور

۳- دیوانِ چشتی

ان میں سے صرف دیوانِ اکبری شائع ہوا ہے۔ باقی دونوں دیوان تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔

مولوی نور احمد چشتی اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز اردو شاعر ہیں۔ امرناتھ اکبری ایک لحاظ سے ان کے استاد بھائی تھے کیونکہ اکبری اور چشتی دونوں شاعری میں مولوی احمد بخش یکدل سے اصلاح لیتے تھے۔ اکبری کے کلام پر آخری باب میں بحث کی جائے گی۔

مولوی نور احمد چشتی پنجاب اور دہلی کے جن نامور غزل گو شعراء سے متاثر ہیں ان میں مظہر (مظہر حسن)، اکبری (امرناتھ)، یکدل (مولوی احمد بخش) اور ظفر (بہادر شاہ) قابلِ ذکر ہیں۔ ان معاصرین سے استفادے کا اعتراف انہوں نے بعض غزلوں کے مقطعوں میں کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

مظہر، مظہر حسن[۱۲]:

مظہرا دیکھو یہ چشتی کی غزل کیسی ہے　　　نور کے کوہ سے گویا کہ تجلّی اٹھا

اکبری، امرناتھ:

اکبری گو کہ بدلتا ہے سدا نام مرا　　　لیک صد شکر کہ مجھ سے نہیں شکوہ اٹھا

ظفر، بہادر شاہ:

چشتیا! کہہ دے ظفر کو حسبِ حال اپنا تو یوں
غم مرا غمخوار ہے میں نکمے غمخوار دں میں ہوں
ظفر کے قول پر اقرار اب تو نے کیا چشتی
کہ شکلِ عاشقِ دلگیر پہچانی نہیں جاتی

چشتی کے اردو کلام میں دہلوی شعرا کی تقلید کے باوجود پنجاب کا مقامی رنگ اور طرزِ فکر نمایاں ہے۔ ان غزلوں میں بحروں کے انتخاب سے لے کر زبان کی دروبست تک میں پنجاب کا مخصوص طرزِ زندگی جھلکتا ہے۔ غزلوں میں حسن و عشق کے مضامین موجود ہیں لیکن ان کے ہاں معشوق کا تصور موہوم یا خیالی نہیں بلکہ پنجابی شاعری کی طرح صنفِ مخالف سے بے محابہ تخاطب موجود ہے۔ انہوں نے ایک غزل میں بیوی کا

نام لے کر کیا ہے:

سید بیگم نز سے آرام نہ بھولیں گے کبھی

تجھ سے کوئی بات خرافات نہ ہونے پائی

آنکھ جیوں بادام لب جیوں پستہ چہرہ حور مثال!

ایسے چہرے کے مقابل ماہ حسرت کھائے ہے!

غزلوں سے زیادہ مقامی رنگ ان کی ان نظموں میں ہے جو ہولی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ہولی پر دیوان چشتی میں دو مخمس ہیں ان میں ایک کے کچھ بند درج کیے جاتے ہیں:

نمود کرتی ہے ہر شاخسار ہولی میں

بہت ہے خوب کھلا سبزہ زار ہولی میں

تمام یاروں سے ہیں کامگار ہولی میں

غرض کہ خوب کھلی ہے بہار ہولی میں

کہو تو دخل کرے خاکسار ہولی میں!

فلک بھی کھیلے ہے ہولی اڑا عبیر و گلال

بنا کے قمقمے تاروں کے اور قمر کا تھال

تمام روئے زمیں کو کرے شفق سے لال

جناب حضرتِ خورشید بھی اڑا دیں بال

غرض فرشتے ہوئے مے گسار ہولی میں

کبھی جو عاشقوں کے حال سے تو ہو ماہر

تو اپنی ساری تمنّا کو میں کروں ظاہر

تو سرخ زرد نہ ہو اتنا اے مرے طاہر

مجھے تو رنگ سے بھر کر نکال اب باہر

کہ میرے بخت بھی ہوں بخت یار ہولی میں
مبارک اے دل شیدا کہ یاد آتا ہے
تمام سال کا رنج والم گنواتا ہے
یہ تیرا عطر عبیر آکے سب اڑاتا ہے
اگر یہ سچ ہے تو چشتی خدا سے چاہتا ہے
کہ راگ رنگ ہوں سب بار بار ہولی میں

چشتی کی شاعری کا اہم موضوع حسن و عشق ہے۔ یوں تو تمام غزلیات میں اس کا اظہار بھرپور اور والہانہ ہے تاہم ان کی ایک نظم واسوخت اس جذبے کی بطور خاص عکاسی کرتا ہے۔ اس واسوخت میں اس دور کی معاشرتی زندگی کی بعض جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں:

بیٹھ کر غیروں میں کہتے ہو بلا کر مجھ کو
میں نے جو تجھ کو کہا تو نہ ملا کر مجھ کو
خوب ہی اس کو جتاتے ہو جتا کر مجھ کو
اصل میں اس کو سناتے ہو سنا کر مجھ کو
گر بظاہر بکسی خلق نکو خواہی کرد
شوخ باما تو چہ کردی کہ بادخواہی کرد
میں نے تو جور اٹھایا ہے جفا کاری کا
تم نے ہی دور کیا نام وفاداری کا
میں تو پیچھا نہیں چھوڑوں گا کبھی یاری کا
تم نے تو طور نکالا ہے جفا کاری کا
کسی عاشق کو نہ معشوق نے مارا ایسا:
مجھ کو برباد کیا تم نے بیار سے جیسا:

دیوانِ چشتی کے حصہ غزلیات سے چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کیے جاتے ہیں:

جس وقت کہ چل جاتی ہے تقدیر زباں پر
کچھ دوستو آتی نہیں تدبیر زباں پر
جب میں نے کہا وضع تری واہ، تو بولے
مت لائیو اس وضع کی تقریر زباں پر

وہ جو پہلو سے اٹھے درد کچھ ایسا اٹھا
درد کی تاب نہ باقی رہی، چلّا اٹھا
عشق کے رمز و کنایہ کی سمجھ میں یارو
مجنوں مشہور تھا پر چشتی بھی ویسا اٹھا

آنکھ اور زلف کا جس گھر میں کہ سودا اٹھا
اس کی حیرانی پریشانی کا شہرہ اٹھا
کل کیا قتل سرِ عام مرے قاصد کو
اچھا، اچھا ہوا ہر روز کا جھگڑا اٹھا
پانی پانی ہوئے لے چادرِ غیرت مہ و مہر
جس گھڑی یار کے چہرے سے دوپٹا اٹھا
رات مجنوں نے جو روتا ہوا دیکھا مجھ کو
ہوش جاتے رہے اور رشک سے تھرّا اٹھا
دیکھا چشتی کا جو "مظہر" نے یہ چرچا ہر سُو
بولا اب ہند میں لاہور کا چرچا اٹھا

دل کو اب الفتِ گلشن سے اٹھا لے بلبل
آمدِ بادِ خزاں ہے نہ جفا لے بلبل

الفت میں اک زمانے کو بد ظن بنا لیا
اک دل رہا تھا دوست سو دشمن بنا لیا
یہ آب و تاب رونے میں ہے ان دنوں مری
گلخن پہ گر جو بیٹھا تو گلشن بنا لیا
زاہد تُو کر عبادتیں جنت کے واسطے
ہم نے تو کوچۂ یار کو مسکن بنا لیا
یاں تک لکھا میں کرتا ہوں حالِ مہاجرت
ہر استخواں میں اپنے کو قط زن بنا لیا
تاثیر آہ و نالہ کی ہوتی نہیں تجھے
دل کیسا تو نے اسے بُتِ پُرفن بنا لیا
چاہیں وہ گر رقیبوں کو تو ہم کو کچھ نہیں
اب ہم نے اپنے دل کو بھی آہن بنا لیا
میں معتقد ہوں اس بتِ کافر خلش کا ہاں
چشتی اہلِ دیں کو برہمن بنا لیا[۱۴]

۸۔ تحفۂ چشتی

مصنفہ: مولوی نور احمد چشتی

اس کتاب کا موضوع علمِ قواعد اور تشریحِ اضافت وغیرہ ہے۔ یہ کتاب پادری جان ہنٹر ٹارسن

کے لیے لکھی گئی۔ سببِ تالیف میں مولوی نور احمد لکھتے ہیں:

"راقم فقیر نور احمد المتخلص بہ چشتی لاہوری عفی عنہ نے جب جناب رابرٹ ڈوری گرفن صاحب بہادر اور ایلیگزنڈر میکلوڈ اسٹوارٹ صاحب بہادر کے امتحان اور جناب فریڈک تھومسن میں برچ صاحب بہادر اور پرنٹ اشبرنر صاحب بہادر کی تعلیم سے فراغت پائی تو خوبیٔ قسمت سے صاحبِ موصوف کی خدمت میں مشرف ہوا اور رائے جہان افروز اسی بات کی مقتضی ہے کہ قواعدِ فارسیہ اور محاورہ اردو عربیہ حاصل ہو۔ نظر برآں ایک رسالہ علمِ قواعد اور تشریح اضافت وغیرہ میں حسبِ محاورہ تصنیف کرتا ہوں۔ یقین کلی ہے کہ پادری صاحب بہادر موصوف بھی بہ نظر قدر دانی ملاحظہ فرماویں گے اور نام اس کا تحفہ چشتی رکھا ہے"[۵]

تحفۂ چشتی اردو میں فنی اور دستوری نثر کا خوبصورت نمونہ ہے۔ گرامر کے پیچیدہ اور خشک مطالب کو سلیس، عام فہم اور مترنم زبان میں ادا کرنا مولوی نور احمد چشتی کے کمالِ فن کا مظہر ہے۔ زبان کا معیار اور اظہار کا حسن کسی جگہ بھی مجروح نہیں ہونے دیا اور جگہ جگہ اردو اشعار کی مثالیں دے کر موضوع کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔

ایک اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:

"کلام میں وہ نسبت جو درمیان دو کلموں کے ہے اسی طرح پر ہوتی ہے کہ بسبب اس کے سکوت صحیح ہوتا ہے اور اس کو اسناد کہتے ہیں۔ پس وہ کلمہ کہ جس کی اسناد کسی کی طرف پھیر دیں اس کو مسند کہتے ہیں اور جس کی طرف مسند ہو اس کو مسند الیہ کہتے ہیں اور مسند اور مسند الیہ کا کلام میں واقع ہونا دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو دونوں اسم ہوں تو اس کلام کو جملہ اسمیہ کہتے ہیں اور مسند الیہ کو مبتداء اور مسند کو خبر کہتے ہیں۔ پھر وہ دونوں اسم خواہ جامد ہوں،

جیسے وہ زید ہے، وہ مبتدا اور زید خبر اور "ہے" حرفِ ربط خواہ ایک جامد اور دوسرا مشتق یا ایک اسم اور دوسرا فعل"۔ [۱۵]

تحفۂ چشتی کا پہلا ایڈیشن پنڈت بشن ناتھ مشتاق خلف پنڈت اجودھیا پرشاد کے اہتمام سے ۲۱، جمادی الثانی، ۱۲۷۰ھ مطابق ۲۱، مارچ ۱۸۵۴ء کو مطبع لاہور گزٹ سے شائع ہوا۔ یہ نایاب ایڈیشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ دوسرا ایڈیشن منشی محمد عظیم کے اہتمام سے ۱۲۷۳ھ بمطابق ۱۸۵۶ء کو مطبع پنجابی لاہور نے شائع کیا جو راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے۔

۹۔ عجائبات چشتی

مصنفہ: مولوی نور احمد چشتی

یہ فارسی مصادر کی گردانوں پر مشتمل کتاب ہے۔ لیفٹیننٹ جارج۔ ڈبلیو۔ سی۔ پلوڈن کے پاسِ خاطر سے لکھی گئی۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۲۷۶ھ بمطابق ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی۔ مولوی نور احمد نے مادہ تاریخ موزوں کیا:

جب میں نے کہا کہ دوستو تم — چشتی کے یہ مضحکات دیکھو
بولا ہاتف یہ سنِ ہجری — چشتی کی عجائبات دیکھو

۱۲۷۶ھ

سببِ تالیف میں لکھتے ہیں:

"مجھ کمترین جزو ہیچمیرز نے، بپاس خاطر جناب خداوندِ نعمت لیفٹیننٹ مسٹر جارج۔ ڈبلیو۔ سی۔ پلوڈن صاحب بہادر اور رفاہ عامہ کے چند مصادر معہ ترانسلیشن جمع کیے اور نام اس کا عجائبات چشتی رکھا۔ الٰہی! مقبولِ خاص و عام ہو۔"

اس کتاب کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ان میں سے صفوۃ المصادر، تفتیح المصادر اور

مصدر فیوض کے نام مولوی نور احمد نے لیے ہیں۔ آخر میں علمِ کلام اور علمِ ہندسہ کا مختصر بیان بھی شامل کیا گیا ہے۔

یہ کتاب سالِ تالیف یعنی ۱۲۷۶ھ میں ہی پہلی مرتبہ مطبع مصطفائی لاہور سے شائع ہوئی۔ دوسرے ایڈیشن کی داغ بیل مصنف کے بھائی مولوی محمد علی پُردل چشتی کے پڑپوتے مولوی ممتاز علی چشتی نے ڈالی تھی۔ اس کی اشاعت کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کوئی نسخہ کسی وسیلے سے دستیاب نہیں ہوتا۔ یقین ہے کہ اشاعت نہ ہو سکی ہوگی۔ مولوی ممتاز علی اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں:

"پرسوں (۱۰۔ فروری ۱۹۱۸ء) میں مولوی عبدالمجید چشتی سے ایک نسخہ عجائبات چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی لایا تھا۔ اس کی نقل کر رہا ہوں۔ آج مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۱۸ء بوقت صبح عجائبات چشتی کو ختم کر لیا ہے"۔[۱۷]

۱۰۔ دیوانِ اُردو (ارمغانِ چشتی)

مصنفہ: مولوی محرم علی چشتی

مولوی محرم علی چشتی کی علمی اور ادبی شہرت "رفیقِ ہند" سے وابستہ ہے۔ اس کا بیان الگ عنوان سے ہوگا۔ صحافتی، علمی، دینی اور فلاحی خدمات کے ساتھ ساتھ مولوی محرم علی شاعری بھی کرتے تھے۔ اردو اور فارسی کلام کے کئی مجموعے ارمغانِ چشتی کے نام سے موجود ہیں۔ مولوی محرم علی چشتی کا تخلص بھی اپنے برادرِ بزرگ مولوی نور احمد کی طرح "چشتی" تھا۔ مولوی محرم علی حضرت مستان شاہ کابلی کے مرید خاص اور فنافی الشیخ کے درجے پر فائز تھے۔

ارمغانِ چشتی میں زیادہ تر اردو غزلوں اور نظموں کا موضوع صوفیانہ ہے۔ ان کے کلام میں زیادہ تر نظمیں حضرت مستان شاہ کابلیؒ، حضرت پیر مہر علی گولڑویؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت شاہ دولہؒ دریائی اور دیگر پیرانِ چشت اہلِ بہشت کے مناقب نظر آتے ہیں۔ سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی مدح کے اشعار حسبِ ذیل ہیں:

لطف و رحمت کا ترےؒ کب ہو سکے مجھ سے بیاں
مجھ کو خود درگاہ میں بلوا کے رکھا میہماں
یا معین الدین خواجہؒ مالکِ ہر درد را
تیرا جلوہ ہے جہاں میں درعیاں و در نہاں
سرور اعظم ہے تو اُس خاندانِ چشت کا
تجھ سوا ہوں استغاثے دردمندوں کے کہاں
آپؒ کے دامن گرفتہ کو ستائے گر کوئی
آپؒ کو غیرت ہے اس کی جب ہو وہ نوحہ کناں
ہو گوارا کس طرح آقا کو توہینِ غلام
چشتیٔ دل خستہ کا سن لیجیے آہ و فغاں[۱۸]

مولوی محرم علی چشتی نے تصوف کے موضوع پر بہت کام کیا۔ آپ نے حضرت مستان شاہ کابلی کا فارسی کلیات مرتب کر کے اس پر سیر حاصل مقدمہ تحریر کیا۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ چند ایک کے نام درجِ ذیل ہیں:

۱۔ قصیدہ الغیاثیہ چشتیہ	مطبوعہ رفاہ عام سٹیم پریس لاہور	۱۳۲۲ھ
۲۔ اسرار التصوف (علم تصوف پر ایک تقریر)	اسلامیہ سٹیم پریس لاہور	۱۹۰۲ء
۳۔ منظوم فارسی دیباچہ مثنوی بحر الاسرار	حمیدیہ پریس لاہور	۱۹۱۰ء
۴۔ ایک نئی بات (انجمن حمایت اسلام میں تقریر)	انوارِ احمدی پریس لاہور	
۵۔ شجرات المشائخ والاولیاء	نولکشور گیس پرنٹنگ ورکس	۱۹۰۸ء

صوفیانہ مضامین کی شاعری اور حمد و نعت و منقبت کے علاوہ مولوی محرم علی چشتی نے صحافتی نظمیں بھی لکھیں جن کا اپنے زمانے میں بڑا شہرہ تھا۔ انہی میں سے ایک نظم انہوں نے مشہور ریفارمر مسٹر گوکھلے

کی لاہور میں آمد پر کہی تھی، جسے غلام قادر فصیح نے اپنے جریدے پنجاب جرنل سیالکوٹ میں شائع کیا۔ یہ فروری ۱۹۰۷ء کا واقعہ ہے۔ نظم درج ذیل ہے:

رنج و راحت کے عجب در آج ہم پر دو کھلے
اس طرف تھا رنجِ قید اس طرف آئے گوکھلے

بندھ گئے تھے قیدِ غم میں خادمانِ ملک دو
شکر ہے صد شکر کہ بالفعل تو دونوں کھلے

اس تردد پر بھی شوقِ میہماں ہے بس عزیز
شور ہے چاروں طرف اب گوکھلے ہی گوکھلے

مشکلاتِ ملک کو کھولیں گے یہ ہمدردِ ملک
دیکھ لینا آپ کے آنے سے عقدے جو کھلے

گوکھلے نے کھل کے باغِ کو مہکا دیا
ایسی خوشبو کب ہے ان غنچوں میں پہلے جو کھلے

ہے غنیمت روحِ قومی ملک میں پھونکی گئی
ہندو و مسلم بغیر اس کے نہیں بالکل کھوکھلے

گوکھلے چشتی مگر کیا لطف تم چپ چاپ ہو
جب مزا الفت کا ہے کچھ میں کھلوں کچھ تو کھلے[۹۵]

۱۱۔ رفیقِ ہند

مرتبہ: مولوی محرم علی چشتی

انیسویں صدی کی صحافت میں رفیقِ ہند کو اہم مقام حاصل تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ اس اخبار کا رویہ متوازن اور لہجہ سنجیدہ اور متین تھا بلکہ اس لیے بھی کہ رفیقِ ہند تنہا اخبار تھا جو پنجاب میں مسلمان

توہین کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد دیسی اخبارات میں سے بعض کو اشاعت کی اجازت تو مل گئی لیکن ان پر کڑی نگرانی بھی جاری رہی۔ پنجاب میں یہ عمل اور بھی محتاط تھا۔ اس لیے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد پنجاب میں علم و دانش کی بساط بچھی اور سیاسی اور تہذیبی شعور کی جڑیں یہاں زیادہ گہری ہونے لگیں۔

رفیقِ ہند کا پہلا شمارہ ۵ جنوری ۱۸۸۴ء کو منظرِ عام پہ آیا۔[۲۰] اس کے ایڈیٹر محرم علی چشتی ایک بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے خاندانی تشخص، دنیاوی تعلیم، دینی مسائل سے آگاہی، مشرقی اور مغربی ادب کے مطالعے اور انگریزی، فارسی، عربی اور اردو پر کامل عبور نے انہیں میدانِ صحافت میں قدم رکھنے کے لیے خود اعتمادی سے ہمکنار کیا۔ پہلے شمارے کا افتتاحی مقالہ ملک کے نامور دانشمند اور عالی قدر مصلح سرسید احمد خاں نے تحریر کیا۔ اس مقالے میں انہوں نے رفیقِ ہند کی ضرورت اور اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اس کی کامیابی کا یقین دلایا اور اس کے لیے دعا کی۔ انہوں نے لکھا کہ ہر اخبار کی کامیابی کا سہرا اس کے ایڈیٹر کے سر ہوتا ہے جس کی صحافتی سوجھ بوجھ اور سیاسی اور علمی بصیرت اخبار کو رہنمائی اور پالیسی مہیا کرتی ہے۔ سرسید نے اس سلسلے میں رفیقِ ہند کے ایڈیٹر مولوی محرم علی چشتی کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے ملک کے اخباروں میں پنجاب کے اخبار بلاشبہ سب سے عمدہ ہیں۔ میں ان کو منزہ نہیں کہتا مگر اعلیٰ اور عمدہ کہتا ہوں۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ان عمدہ اخباروں میں ایک اور اخبار "رفیقِ ہند" کا اضافہ ہوتا ہے جس کی نسبت توقع ہے کہ نیو ایئرز ڈے کو نیا اخبار پیدا ہونے والا ہے۔ ہمارے شفیق مولوی محرم علی چشتی جن کی ذہانت، جودتِ طبع، تیزیِ خیالات اور ہمدردیِ قوم مشہور و معروف ہے، اس اخبار کو نکالتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اخبار تمام صفتوں کے ساتھ سلیم الطبع اور متحمل مزاج ہوگا اور جس قدر ممکن ہے ملک کو فائدہ پہنچائے گا۔ اے خدا! تو ایسا ہی کر! آمین!!"[۲۱]

اس سرآغاز مقالے کا ایڈیٹوریل میں ذکر کرتے ہوئے مولوی محرم علی چشتی نے اپنے بزرگ دانشمند کی محبت اور دلچسپی کا شکریہ ادا کیا اور لکھا:

"ہمارے آنریبل قبلہ عالی جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی نے رفیقِ ہند کے جاری ہونے کا حال معلوم کر کے براہ رحمت بزرگانہ ہمیں مندرجہ ذیل مضمون عطا فرمایا ہے جس کے اندراج سے ہم سب سے پہلے اپنے ایڈیٹوریل کالموں کو مفتخر کرتے ہیں۔"[۱۱]

رفیقِ ہند کی پالیسی پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک ادارتی مقالے میں لکھا:

"ہمارے اہل الرائے کا عموماً اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ دیسی زبان کے اخبارات میں ابھی تک ایک ایسے قومی اخبار کی ضرورت باقی ہے جو انگریزی اخبارات کے پورے نمونے پر آزادی سے اپنے قومی اتحاد کے وسائل پیدا کر کے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو ایک پولیٹکل پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرے اور راست بازی سے ان کے خلاف قانونی زیادتیوں کو گورنمنٹ اور ملک کی خدمت میں پیش کرتا رہے جو بعض سرکاری عہدہ داروں کے ہاتھ سے ہندوستانی رعایا خصوصاً بیرونجات سرزد ہوتی ہیں، جہاں لوگ اپنے حقوق سے اچھی طرح واقف نہیں۔ نیز ہندوستان والیانِ ریاست کو بھی ان کے انتظامی امور سے مطلع کرتا رہے اور حاکم و محکوم میں جو باعثِ تفرقہ کے ہیں ان کو دفع کرنے کے وسائل پیدا کرے۔ غرضیکہ ایک پورا اور سچا خادمِ قوم ہو۔

کوہِ نور لاہور کی ایڈیٹری سے قطع تعلق کے بعد ان سب مراتب کے خیال سے میرے احباب نے بالاتفاق بڑے اصرار سے مجھے ایک نئے اردو اخبار کی اشاعت کے لیے ترغیب دی۔ میں اپنی نسبت ہرگز وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ فی الحقیقت میں ان تمام قومی فرائض کو پورے طور پر ادا کرنے کے قابل ہوں گا جو ایسے اخبار

سے مقصود ہونے چاہییں مگر اس میں شک نہیں کہ اگر میری ناچیز خدمات کسی قابل بھی سمجھی جاویں تو میرے لیے اس سے زیادہ فخر کی کوئی بات نہیں کہ اپنے برگزیدہ احباب کے ارشاد اور قومی خدمت کے لحاظ سے اپنے فرائض کو حتی الامکان کامل طور پر پورا کرنے کی کوشش کروں اور چونکہ زبانی جمع خرچ سے قطع نظر کر کے ہر ایک چیز کو اپنی نسبت خود بتا دینا چاہیے کہ وہ کیسی ہے اس لیے میں اس بات کا فیصلہ آیندہ کے لیے زیادہ تر پبلک پر چھوڑ دوں گا کہ کہاں تک میں نے اپنے وعدے کے ایفا میں کوشش کی ہے۔

ہندوستان کی موجودہ عام حالت کے بموجب آزادی اور قومی ہمدردی جس قسم کا بھاری جرم سمجھا جاتا ہے اس کے لحاظ سے بخوبی ان مشکلات کی نسبت پیش گوئی کی جا سکتی ہے جو رفیقِ ہند جیسے پرچے کے لیے لاحق ہونا یقینی ہیں۔ پس ایک ایسا قومی اخبار اپنے قائم رکھنے کی کوئی سبیل نہیں رکھ سکتا، سوائے اس کے کہ بحیثیت مجموعی قوم ہی اس کی ذمہ داری اپنے سر پر لے، کیونکہ دیانت اور صداقت کی پوری پابندی کے باعث کوئی ناجائز ذریعہ معاش کا اس کے لیے کھلا نہیں رہ سکتا۔ پس یہ قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنے جاں نثار "رفیق" کی خدمات کی قدر کرے اور ہر ایک عملی ذریعہ اس کے قائم رہنے کو مہیا کرے۔

ہمیں بڑے فخر سے اس بات کے اظہار کا موقع حاصل ہے کہ اس ناچیز پرچہ میں خیالات کی روح ڈالنے کے لیے براہِ قومی ہمدردی ہندوستان کے بڑے بڑے مشاہیر اور اوّل درجہ کے مسلم الثبوت صاحبِ قلم بہت شوق اور محبت سے آمادہ ہیں۔ اب پبلک کی امداد کے بھروسے پر اس امر کا اعلان دیا جاتا ہے کہ ۵۔ جنوری ۱۸۸۴ء سے یہ اخبار سرِ دست بڑی تقطیع کے سولہ صفحوں کی ضخامت میں ہفتہ وار شائع کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں جہاں تک اہلِ وطن حوصلہ دلائیں اس کی

ترقی کے دوسرے سامان پیدا کرنے کی سعی کی جائے گی"۔[۲۳]

اس ایڈیٹوریل میں انہوں نے اخبار کے بارے میں ایک ایسی پالیسی اور منشور کا اعلان کیا جو آخری دم تک "رفیقِ ہند" کا نشانِ امتیاز رہا۔ آخری پیرے میں انہوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ.... رفیقِ ہند کے ساتھ قلمی تعاون پر ملک کے نامور مشاہیر اور صفِ اول کے ادیب آمادہ ہیں۔ یہ تعاون پہلے دن سے لے کر رفیقِ ہند کے آخر دم تک برقرار رہا۔ رفیقِ ہند ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۵ء تک کبھی مسلسل اور کبھی مجبوریوں کے تحت غیر مرتب صورت میں شائع ہوتا رہا۔ مولوی محرم علی چشتی کی حق گوئی اور بے باکی نے کئی دفعہ انہیں مشکلات اور صعوبتوں سے دوچار کیا۔ انہیں قید و بند کی تکالیف جھیلنی پڑیں لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ رفیقِ ہند کو ۱۸۹۴ء۔۱۸۹۵ء کے قریب بند کرنا پڑا لیکن ۱۸۹۹ء میں دوبارہ جاری کر دیا گیا۔

اسی طرح ۱۸۸۵ء میں محرم علی چشتی کو ان کی بے باک تحریر کی پاداش میں جیل ہو گئی اور یہ سزا ایک ماہ کی مدت کے بعد ختم ہوئی۔ رفیقِ ہند کی ۲۰ مارچ ۱۸۸۵ء کی اشاعت میں کسی اخبار سے ایک خبر مندرجہ ذیل الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

"آج (۱۷۔مارچ ۱۸۸۵ء) ۴ بجے شام لاہور سے ایک ٹیلی گرام پُر از اندوہ و غم یہ خبر لایا کہ مولوی محرم علی چشتی ایڈیٹر رفیقِ ہند قوم کی خدمت میں اپنی ہی قوم کے ہاتھوں ایک مہینے کے لیے الگ کر دیے گئے ہیں"۔

مولوی محرم علی کی رہائی کی خبر رفیقِ ہند کے ضمیمے میں مندرجہ ذیل الفاظ میں شائع ہوئی:

"جس زور شور اور تزک و احتشام کے ساتھ ایڈیٹر "رفیقِ ہند" کا استقبال ۱۷۔اپریل کی صبح کو جیلخانہ سے رہائی کے وقت ہوا وہ ایک تاریخی معاملہ ہے"۔[۲۴]

اس عرصے میں رفیقِ ہند کے صفحات پر جن ادیبوں کے رشحاتِ قلم نظر آتے ہیں ان میں سر سید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، محسن الملک، سید اقبال علی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد علی پُر دل، فقیر سید جمال الدین، مولوی مرزا فتح محمد جالندھری، مولانا غلام قادر گرامی، ڈاکٹر لائٹنر

اور مولانا وحید الدین سلیم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

خود مولوی محرم علی چشتی زندگی کے ہر پہلو اور تقاضائے وقت کے مطابق ہر موضوع پر برجستہ لکھنے کی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی تحریر سادہ، برجستہ، مدلل اور عام فہم ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے والد اور جلیل القدر بھائیوں کا حصہ تھا جو حق گوئی اور راست بازی میں کسی قسم کی مفاہمت کے قائل نہ تھے۔ مولوی احمد بخش یکدل کی بیاضوں سے ثابت ہے کہ انہوں نے تاریخ نگاری میں حق گوئی کو اپنایا اور سچی بات کہنے میں کسی صاحبِ جاہ کی پرواہ نہیں کی۔ انہوں نے مغلوں، سکھوں افغانیوں اور انگریزوں کی حکومتوں پر ناجائز پالیسیوں پر یکساں تنقید کی ہے۔ انہوں نے تبلیغ علم اور تبلیغِ دین کے سلسلے میں راست بازی سے کام لیا۔ مولوی محرم علی میں بھی اسی خون کی تاثیر تھی۔ وہ حق گوئی اور حق خواہی کے لیے سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ ان کے اخبارات کی سچائی ان کے اسلوب میں تاثیر کی ضامن ہے۔ رفیقِ ہند میں وہ ایڈیٹوریل یا اداریے کے علاوہ مقالات اور مضامین بھی لکھتے تھے ذیل میں چند تحریروں کا حوالہ دیا جاتا ہے جو رفیقِ ہند میں جنوری ۱۸۸۷ء سے ستمبر ۱۸۸۷ء تک شائع ہوئیں۔ یہ فہرست ڈاکٹر ممتاز گوہر کے مقالے میں بھی شامل ہے[۲۵]:

۱۔ پبلک سروس کمیشن کے سامنے شہادت

۲۔ کلکتہ کانگرس

۳۔ اخبار ٹریبون اور پبلک سروس کمیشن

۴۔ نیشنل کانگرس اور بعض بنگالیوں کی چالیں

۵۔ اہلِ حدیث یا وہابی؟

۶۔ ہندوستان کے حاجیوں کے لیے سہولت اور آسائش کا انتظام

۷۔ لکھنوی مسلمان اور نیشنل کانگرس

۸۔ ریاست جموں کشمیر کی نئی منسٹری

۹۔ نیشنل کانگرس اور مسلمان

۱۰۔ مسلمانانِ لاہور اور جشنِ جوبلی

۱۱۔ ریاست جموں میں انتظامی زلزلہ

۱۲۔ ہوشیار پور کے حالات

۱۳۔ پنجاب یونیورسٹی کا عہدہ رجسٹراری

۱۴۔ ایک اخبار نویس کی سوانح عمری

۱۵۔ ہمارے نئے لاٹ صاحب اور پنجاب کی آیندہ امیدیں

۱۶۔ تین مسلمان یتیم بچوں کا مقدمہ

۱۷۔ شمس العلماء کا خطاب

۱۸۔ پنجاب نیٹو پریس ایسوسی ایشن

۱۹۔ مدرسہ اسلامیہ امرتسر

۲۰۔ دہلی کے مسلمانوں پر آفت

۲۱۔ پنجاب میں عید الاضحیٰ اور گاؤکشی

۲۲۔ انگلستان میں ہندوستانی مسلمانوں پر کیا سلوک ہوا؟

محرم علی چشتی کے علاوہ رفیقِ ہند کے قلمی معاون جن کی فہرست پہلے درج کی جا چکی ہے اس اخبار کے ذریعے مندرجہ ذیل کاوشیں منظرِ عام پر لائے:

سرسید احمد خاں:

مقالہ افتتاحیہ رفیقِ ہند

ستارۂ شرقی (لطیف)

نیشنل کانگرس بیں بدرالدین طیب جی کے خط کا جواب

مبارک باد جشنِ جوبلی

مسلمانوں کی تعلیمی حالت

نیشنل کانگرس کے بارے میں اطلاع

مولانا محمد حسین آزاد:

مسافر ایران

فرہنگِ آصفیہ پر ریویو

ڈاکٹر لائٹنر:

اسلام اور اسلامی مدارس

مولوی ذکاء اللہ:

فرہنگِ آصفیہ پر ریویو

مدرسہ دار العلوم علی گڑھ

مولانا الطاف حسین حالی:

فرہنگِ آصفیہ پر ریویو

قصیدہ در تہنیتِ جوبلی

قادر بخش، خان بہادر:

تعلیمِ نسواں

عبد الحلیم شرر:

فرہنگِ آصفیہ پر ریویو

وحید الدین سلیم:

قومی نوحہ

رفیقِ ہند کی مختلف اشاعتوں میں لسانی اور ادبی موضوعات پر جو مقالے شائع ہوئے۔ ان کی فہرست بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی:

۱۔	انگریزی محاورات کو اردو میں لانے کا بیان	عبدالقدوس قدسی	۸ فروری ۱۸۸۴ء
۲۔	انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال	عزیزالدین احمد	یکم مارچ "
۳۔	اردو لٹریچر میں نئے مذاق کی بنیاد	نامہ نگار	" " "
۴۔	اردو کی زبان دانی	محرم علی چشتی	۱۵ " "
۵۔	انگریزی اور اردو کا رشتہ	پادری رجب علی	۲۹ " "
۶۔	" "	" "	۱۹۔ اپریل "
۷۔	" "	" "	۱۰۔ مئی "
۸۔	پادری رجب علی اور حضرت قدسی	بجنوری	۷۔ جون "
۹۔	اردو زبان پر ایک منصفانہ نظر	جوہر	۲۳۔ اگست "
۱۰۔	ہم اور ہمارا لٹریچر	شہسوار علی بجنور	۷ مارچ ۱۸۸۵ء
۱۱۔	ہمارے حکام کی ناواقفیت ہماری زبان سے	محرم علی چشتی	۲۸۔ نومبر "
۱۳۔	" "	" "	۵ دسمبر "
۱۴۔	آدابِ تحریر	خلیل الرحمٰن	۱۹۔ جون "

یہ صرف دو سالوں کے فائلوں کی نامکمل فہرست ہے۔ رفیقِ ہند نے زبانِ اردو کی ترویج و ترقی پر پوری توجہ دی اور اس میں اس کے ایڈیٹر مولوی محرم علی چشتی کے ذوقِ سلیم کا زیادہ دخل تھا۔

رفیقِ ہند کا سب سے بڑا کام ۱۸۸۴ء میں سرسید کی پنجاب میں آمد پر کوائف نگاری ہے۔ یہ کام اس قدر دقت اور مہارت سے کیا گیا کہ اس دور کے کسی اخبار کو یہ وقتِ نظر میسر نہ آئی۔ سرسید کے ہر جلسے میں مولوی محرم علی چشتی یا ان کا نمایندہ شریک تھا اور ان کی تقاریر کا مکمل ریکارڈ رفیقِ ہند

میں درج ہوتا تھا۔ یہ مواد مولوی اقبال علی کے مرتبہ "سفرنامہ پنجاب" سے کہیں زیادہ ہے۔ مولوی اقبال علی نے اپنی کتاب میں جا بجا مولوی محرم علی چشتی کی ذہانت، قابلیت اور استعداد کا ذکر کیا ہے۔

پنجاب میں سرسید کی آمد کے سیاسی، تعلیمی اور دینی ردِعمل پر تفصیلات رفیقِ ہند میں موجود ہیں۔ مولوی محرم علی چشتی پنجاب میں سرسید کے سب سے بڑے مداح تھے۔ عقیدت کا یہ سلسلہ کسی وقت بھی منقطع نہیں ہوا۔ نہ اس وقت جب بقول مولوی اقبال علی، چشتی صاحب سرسید کی بگھی پر کوچوان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے اعزاز میں شائع شدہ "رفیقِ ہند" کا ضمیمہ بانٹ رہے تھے نہ اس وقت جب سرسید کے ہر جلسے میں مولوی محرم علی رپورٹر کی حیثیت سے خود بیٹھے ہوئے تھے اور نہ اس وقت جب دینی مسئلے پر ان سے اختلاف رائے ہو گیا تھا۔ دراصل ہمارے اربابِ دانش کی دسترس میں رفیقِ ہند کے فائل اور مولوی محرم علی چشتی کی تحریریں نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سرسید اور مولوی محرم علی کے درمیان اختلاف کے سمجھنے میں وہ انصاف سے کام نہیں لے سکے۔

مولوی محرم علی اور سرسید کے اختلاف کی وجہ ذاتی نہیں، اصولی تھی۔ سرسید نے سارا دورہ خیر و خوبی سے انجام دینے کے بعد مقطع میں سخن گسترانہ بات کر دی تھی جس سے نہ صرف مولوی محرم علی چشتی بلکہ سارے پنجاب اور یوپی کے علما کو اختلاف ہو گیا تھا۔ اس فہرست میں سرسید احمد خاں کے استاد اور دنیائے علم و ادب کی مایہ ناز شخصیت مولانا فیض الحسن سہارنپوری کا نام بھی موجود ہے جنہوں نے اپنے پرچے "شفاء الصدور" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ مولوی اقبال علی نے ان امور کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ اس صورتِ حال میں مولوی محرم علی کو سرسید کا مخالف کہنا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ یہ تو دوستوں کی حاشیہ آرائیاں تھیں اور علی گڑھ کے بعض بہی خواہوں کی خوش فکری جس نے پنجاب کے علما اور سرسید کے درمیان فاصلہ بڑھانے میں حصہ لیا لیکن مذہبی مباحث سے قطع نظر اہلِ پنجاب اور مخصوصاً مولوی محرم علی چشتی نے کبھی بھی سرسید کی تعظیم کو ترک نہیں کیا اور نہ ہی کبھی ان کے لیے سوقیانہ یا گستاخانہ جملہ استعمال کیا۔

رفیقِ ہند کے ادبی، تہذیبی اور سیاسی نتائج دور رس ہیں۔ اس اخبار میں مسلمانوں کے حقوق کو کسی معذرت خواہانہ انداز میں پیش نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حکامِ وقت کو مسلمانوں کی من حیث القوم اہمیت کا

احساس دلایا جاتا تھا اور اپنا حق آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مانگا جاتا تھا۔ مولوی محرم علی چشتی کے اس ضمن میں دو اہم کارنامے بطور مثال سامنے رکھے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ مولانا حالی کو ان کی تحریک پر شمس العلماء کا خطاب ملا اور دوسرا یہ کہ دیسی اخباروں کو اظہار و ابلاغ کی آزادی انہی کی قائم کی ہوئی صحافی یونین "انجمن حافظین دیسی اخبارات" کی جدوجہد کا نتیجہ تھی۔

راقم الحروف نے رفیقِ ہند کے فائل بزرگوار جناب م۔ش کی عنایت سے پڑھے۔ میاں صاحب کے پاس ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۲ء تک کے مکمل فائل ہیں۔ صرف وہی کم ہیں جب پرچہ شائع نہ ہوا ہو یا بند کر دیا گیا۔ جناب م۔ش نے از راہِ نوازش راقم کو ان میں سے بعض فائلوں کے فوٹوسٹیٹ حاصل کرنے کی بھی اجازت دی اور یوں رفیقِ ہند کا جوہر فوٹوسٹیٹ کی صورت میں راقم کے پاس موجود ہے۔

۱۲۔ دیوانِ ممتاز

مصنف: مولوی ممتاز علی چشتی

مولوی ممتاز علی چشتی، مولوی عبدالرحمٰن چشتی کے صاحبزادے تھے۔ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے اور عین عنفوانِ شباب یعنی ۱۹۲۴ء میں فوت ہو گئے۔ ممتاز علی چشتی ممتاز اور خوش دل تخلص کرتے تھے لیکن خوشدل کے تحت ان کی غزلیں موجود نہیں۔ دیوانِ ممتاز میں تمام غزلیں ممتاز تخلص کے تحت ہی لکھی گئی ہیں۔

دیوانِ ممتاز کا نسخہ بخطِ مصنف، راقم نے مولوی مسعود علی چشتی صاحب کے پاس دیکھا تھا۔ درسی نوٹ بک پر لکھا ہوا یہ دیوان آغاز یا اختتام کی تاریخ سے محروم تھا۔

مولوی ممتاز علی اپنے عہد کے اچھے شاعر تھے۔ لاہور کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے۔ ایک مشاعرے کو یاد کرتے ہوئے اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں:

"۲۱۔ جولائی ۱۹۱۷ء بروز یک شنبہ بوقت ۶ بجے صبح ایک مشاعرہ محمڈن ہال

میں منعقد ہوا۔ صدرِ جلسہ راجہ نریندر ناتھ صاحب ایم۔اے تھے۔ یہ مشاعرہ جنگی نظموں کے متعلق تھا۔ حضرت اقبال نے بھی رباعی پڑھی۔ ماہ دولت و اقبال شریکِ جلسہ تھے۔"[۱۱۹]

گویا اس اقتباس میں مولوی ممتاز علی نے مشاعرے میں اقبال کے ساتھ اپنی موجودگی پر فخر کیا ہے۔

دیوانِ ممتاز میں غزلیات کے علاوہ سہرے، مرثیے، قطعات اور مثنویات بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی سیاسی نظمیں بھی ہیں جن میں سے بعض اُس دور کے اخبارات میں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک نظم کا عنوان ہے" دنیا میں قیامت"۔ یہ نظم زمیندار لاہور میں شائع ہوئی تھی:

دوستوں کی ہم نے الفت دیکھ لی آشناؤں کی مروت دیکھ لی
جن پہ تھا ہم کو بھروسہ ہر طرح ان عزیزوں کی محبت دیکھ لی
دختر و مادر میں ہوتی جنگ ہے باپ بیٹوں میں عداوت دیکھ لی
حکمرانوں میں ہے اک محشر بپا بادشاہوں کی رقابت دیکھ لی
ایک دشمن ایک کا ہے ان دنوں بھائیوں کی ہوتی چاہت دیکھ لی
جو محبت کا بھرا کرتے ہیں دم ان کے دل میں بھی کدورت دیکھ لی
ظاہری اخلاق سے ملتے ہیں سب دیکھ لی ہر اک کی عادت دیکھ لی
ہر طرف آفت کا بادل چھا گیا رونقِ بزمِ خلافت دیکھ لی
ہوگئی زندانِ عسرت میں اسیر قوم نے راہِ ہلاکت دیکھ لی
خود غرض ہو کر نظر آئے سبھی ہم نے دنیا میں قیامت دیکھ لی

انقلابِ دہر سے گھبرا گئے
آپ کی ممتازؔ ہمت دیکھ لی

اسی طرح ایک اور نظم ہے" فریادِ مرغِ اسیر"۔ اس میں بھی سیاسی رنگ صاف نظر آرہا ہے

مطلع ہے:

ہمیں پَر کاٹ کر آزاد کرنا ذرا انصاف اے صیاد کرنا

ممتاز کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ تشبیہ و استعارہ اور وارداتِ قلبی کا بیان قدیمی ہے:

الٰہی خیر ہو آنکھیں مری پھڑکتی ہیں
مثالِ ماہیِ بے آب بے قرار ہوں میں
مجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہوا مجھ کو
شبیہِ وہم ہوں تصویرِ حالِ زار ہوں میں
غضب ہے ٹوٹ پڑا آسمان سر پہ مرے
ستم ہے زخمِ مصیبت سے دلفگار ہوں میں

ممتاز علی چشتی کی اہلیہ بھی شاعرہ تھیں۔ ان کا نام خورشید سلطانہ تھا۔ مولوی مسعود علی چشتی کے جمع کیے ہوئے تراشوں میں رسالہ "شبابِ اردو" کا ایک مطبوعہ ورق ہے جس پر خورشید سلطانہ کی مندرجہ ذیل نظم چھپی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایڈیٹر کی طرف سے ایک نوٹ بھی ہے۔ چونکہ اس نوٹ سے مولوی ممتاز علی چشتی کے بارے میں بعض نئی معلومات دستیاب ہوتی ہیں اس لیے ذیل میں نظم مع نوٹ درج کی جاتی ہے۔ یہ نظم مولوی ممتاز علی چشتی کی یاد میں لکھی ہوئی ہے۔ خورشید سلطانہ چشتی خاندان کی واحد خاتون شاعرہ ہیں جن کی صحیح معنوں میں شاعری قابلِ اعتنا ہے:

یادِ ممتاز

"جناب ممتاز علی صاحب ممتاز، شبابِ اردو کے زندہ دل معاون تھے۔ توسیعِ اشاعت میں سرگرم رہتے تھے۔ افسوس صد افسوس طاعون نے انہیں عالمِ شباب میں شہید کر دیا۔ صرف آٹھ دن بیمار رہے۔ کچھ بہتری کی امید ہو چلی تھی کہ دفعتہً پیغامِ اجل آ گیا۔ ہلالِ عید غم والم کا تبغہ ثابت ہوا۔ مرحوم کے پانچ بچے ہوئے لیکن ایک بھی زندہ نہ رہا کہ اس وقت بہن مسز ممتاز کے لیے باعثِ تسکین ہوتا۔

ہماری دعا ہے کہ دعائے کارسازِ مرحوم کو فردوس نصیب کرے۔ ان کی تربت کو عنبریں کرے۔ مسز ممتاز اور دیگر متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ مسز ممتاز نے عالمِ بے تابی اور بے قراری میں چند دلریش اور جگر خراش اشعار بھیجے ہیں ——
درجِ ذیل ہیں:

آگ لگ جائے الٰہی ہجر کے آزار کو
سر چڑھا رکھا ہے اس نے آہِ آتش بار کو

آہ وہ خورشید تھا، مہتاب تھا، سیّارہ تھا
گردشِ دوراں دکھا دے پھر مرے سیار کو

ٹھہر اے مواجِ دریا! تجھ کو دریا کی قسم
ڈھونڈ کر لادو ہمارے گوہرِ شہوار کو

جب سے وہ گم ہوگیا برباد ہے میرا سنگھار
لگ گئی کس کی نظر میرے گلے کے ہار کو

اے فضائے آسماں کے کالے کالے بادلو!
کیوں چھپایا تم نے میرے ماہِ پُر انوار کو

گر برسنا ہے تو برسو جلد کھُل جاؤ کہیں
کیوں ستاتے ہو عبث مجھ تشنۂ دیدار کو

تیری خوشبو کہہ رہی ہے نکہتِ بادِ نسیم
تُو پسے بیٹھی ہے پہلو میں مرے دلدار کو

لالہ و گل سے خدارا کوئی مجھ کو پوچھ دے
کس جگہ ڈھونڈوں میں اپنے آتشیں رخسار کو

پانچ غنچے تھے مرے، سب بن کھلے مرجا گئے
بادِ صرصر نے کیا ویران گل و گلزار کو

آہ آخر خرمنِ امید پہ بجلی گری
خاک کر ڈالا جلا کر جان سے بیزار کو

چل بسا شوہر مرا اور لٹ گیا میرا سہاگ
رو رہی ہوں میں اکیلی زخمِ دامن دار کو

وہ مرا سرتاج تھا جو مر تھا اسے دستِ اجل
چھین کر نادار تو نے کر دیا نادار کو

ظلم سے طاعون کے وہ تھا نحیف و ناتواں
ہو نہ کچھ تکلیف اسے تربت مرے بیمار کو

چشتی خاندان کے مصنفین کا متفرق اردو کلام

ان تصانیف کے علاوہ اس خاندان کے کئی اہم شعراء ایسے ہیں جن کے مدوّن دیوان یا مرتب شدہ نثری تصانیف موجود نہیں لیکن ان کے ادب پارے مختلف ادبی رسالوں اور ان کی یادداشتوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں مولوی محمد علی چشتی پُردل، مولوی حامد علی چشتی، مولوی منصور علی چشتی اور مولوی مسعود علی چشتی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی محمد علی پُردل ابن مولوی احمد بخش یکدل ایک کہنہ مشق اور پُر مغز شاعر تھے۔ زیادہ کلام فارسی میں ہے۔ اردو غزلیات اور قطعات کو آپ کے اخلاف نے اپنی بیاضوں میں محفوظ کیا ہے مولوی پُردل کے مادہ ہائے تاریخ انیسویں صدی میں مطبوعہ اہلِ پنجاب کی کئی تصانیف میں موجود ہیں۔ انہیں تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ مولوی یکدل نے بھی ان کے کہے ہوئے فارسی قطعات اپنی بیاضوں میں درج کیے ہیں۔ پُردل کا کلام معاصر اخبارات کوہِ نور، رفیقِ ہند، سرمور گزٹ وغیرہ میں شائع ہوتا تھا۔

ذیل میں آپ کی ایک غزل درج کی جاتی ہے۔ یہ غزل پہلی بار سرمور گزٹ کے ۱۲۔ اپریل ۱۸۹۱ء کے شمارے میں اور دوسری مرتبہ پیسہ اخبار لاہور میں شائع ہوئی:

بشر میں عاشقی کرنے کو حق نے جان رکھی ہے
بچے گر فاسقی سے وہ تو کیا ہی شان رکھی ہے

نہ کر غافل غرور جاہ و مال و زر کہ خالق نے
بنا دنیا کی، کلُّ من علیہا فان رکھی ہے

جو ان شہروں میں رہتے تھے کبھی شان و تجمل سے
انہوں نے اب سکونت اپنی گورستان رکھی ہے

تکبر تھا جنہیں زر پر انہوں نے اب ندامت سے
لحد میں جا کے دیکھو منہ پہ چادر تان رکھی ہے

سفر در پیش ہے بھاری، ملا ہے حکمِ جبّاری
ہوئی چلنے کی تیاری، بتا کیا ٹھان رکھی ہے

تباہ کی عمر سب اپنی ارے ظالم گناہوں میں
پھر اس خلد کی امید اے نادان رکھی ہے

الٰہی اب دکھا جلدی مجھے تو کعبہ و یثرب
کروں میں نذر وہ پوری جو دل میں مان رکھی ہے

خدا سے کیا کہیں گے وہ جنہوں نے زر کمانے کو
کتابِ دیں میں مطلب کی جو دیکھی چھان رکھی ہے

نہیں ہندوستاں میں کچھ مزا رہنے کا اے بُرؔدل
ہے اچھا جو ہوائے ملکِ عربستان رکھی ہے

مولوی حامد علی چشتی کی شاعرانہ حیثیت اور علم وفضل کا ان کے زمانے میں شہرہ تھا۔ سرسید کی لاہور میں آمد پر مولوی حامد علی حامد نے ایک قصیدہ لکھا تھا جو "سفرنامہ پنجاب" مصنفہ مولوی اقبال علی میں موجود ہے۔ اس کا مطلع ہے:

شب از شغل گیتی چو فارغ شدم
بہ بستر پئے خواب پہلو زدم

یہ قصیدہ فارسی زبان میں مولوی حامد علی کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ مولوی حامد علی چشتی نے سرسید کے ورودِ لاہور کی تاریخ بھی کہی تھی جو درجِ ذیل ہے:

سیّد قوم وطبیب دلِ اہلِ ہندی
حامد آمد بجنابت پئے درماں طلبی

مولوی حامد علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک چھوٹی سی بیاض راقم الحروف کے پاس ہے جس میں مولوی احمد بخش یکدل اور مولوی نور احمد چشتی کی چند غزلیں اور اپنی چند اردو غزلیں درج کی ہیں۔ انہی میں سے ایک غزل نقل کی جاتی ہے:

دم عیسیٰ کرے جو کچھ بدن سے — صبا آ کر کرے جیسا چمن سے
زراعت سے کرے باران جو کچھ — شمع آ کر کرے جو انجمن سے
دکھائے تیرے آنے نے یہ سب کام — یہ نعمت پائی میں اپنے وطن سے
ترے خلقِ عنایت بیں، بُیں آیا — ہوا ہوں خوش میں فضلِ ذوالمنن سے
الٰہی دولت و اقبال سے تُو — رہے اور ہو عدو رنج و محن سے
ملاقی ہونے کا تھا شوق مجھ کو — ہمیشہ مانگتا تھا میں زمن سے

سو حاصل ہو گئی مجھ کو یہ دولت
نہ دے حامدؔ تو اب تکلیف تن سے

مولوی مسعود علی چشتی کے کلام میں متانت اور حسنِ بیان کا عنصر موجود ہے۔ تغزل کے علاوہ ان کی نظموں میں گہرا سیاسی شعور موجود ہے۔ وہ اپنے عہد کے فکری اور احساساتی رویّوں سے عاری نہیں ہیں۔ چند سال پہلے میں نے ان کے پاس ان کے دیوانِ اشعار کا مسودہ دیکھا تھا جس میں فارسی اور اردو کلام جمع کیا گیا تھا۔ مسعود صاحب بے حد باوضع، خوش گفتار، صاحبِ ذوق اور عالی ظرف انسان تھے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی طرح صداقت اور تاثیر لیے ہوئے ہے۔ ذیل میں ان کا نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے:

جب روسیوں کے ملک میں ارمن رواں ہوئے!

جوہر جو تیغ ناز کے تھے سب عیاں ہوئے
بسمل ہوئے بہت سے کئی نیم جاں ہوئے
اس درجہ ظلم کون سے مذہب میں ہے روا
اور کونسی کتاب میں ایسے بیاں ہوئے
وہ کونسی خطا ہوئی جس سے کہ آج ہم،
مطعونِ خلق اور ذلیلِ جہاں ہوئے
باقی ہیں اور جو ابھی تیری نگاہ میں
رسوا بنے قتیل ہوئے بے مکاں ہوئے
جس قوم کے عروج میں دشمن تھے سست حال
اس کو ہوئی ہے دید جہاں سے نہاں ہوئے
رسوائیوں کو اپنے مٹایا ہے یوں رقیب!
جس کے جفا اٹھائے بہت ناتواں ہوئے
تم میں نہ تھی مجال جو ہوتا صلاحِ دیں
یا اس کے جانشیں، جو کبھی حکمراں ہوئے

ترکوں کی آبرو کا نہ رکھا کوئی خیال
ایسے خطا پذیر سے بھی کم عیاں ہوئے
باقی رہا یقیں نہ کوئی اس کی بات کا
وعدہ شکن کے قول سے ہم بدگماں ہوئے
جوں بندگانِ کفر دیا ہم نے تیرا ساتھ
جب روسیوں کے ملک میں ارمن رواں ہوئے
تم دوست بننے والے تھے کب اہلِ دین کے
ہم بندگانِ حق عملاً کرسٹاں ہوئے
ہم اپنے کردگار کے ظاہر بنے سے چور
جب بندگانِ کفر پہ ہم مہرباں ہوئے
سچی تو بات یوں ہے کہ اس دورِ کفر میں
اور تیرے زیرِ سایہ بہت بے ایماں ہوئے
مسعود کی دعا ہے خدائے جلیل سے
عزت مری بچائیو کفرِ دلیل سے

غزل

وہ ستمگر اب جو مجھ پر مہرباں ہو جائے گا
مجھ پہ خوش پھر مالکِ کون و مکاں ہو جائے گا
رازِ عشق ماہر دیاں جب عیاں ہو جائے گا
سر پھر اپنا وقفِ شمشیرِ بتاں ہو جائے گا

گر نقاب اس نے اٹھایا اس شبِ تاریک میں
اس کے رخ کے نور سے روشن جہاں ہو جائے گا

اے شہِ خوباں مبارک سلطنت ہو حسن کی
تیرے ہی اب نام کا سکّہ رواں ہو جائے گا

حال گر بے اعتنائی کا رہا یہ آپ کی
جانِ جاں اس جان کا یونہی زیاں ہو جائے گا

بلبلِ شوریدہ گل کے واسطے نالہ نہ کر
کچھ دنوں میں سبز یہ سب گلستاں ہو جائے گا

عشق کا دعویٰ کیا تو ہنس کے فرمانے لگے
اچھا اچھا چپ رہو کل امتحاں ہو جائے گا

دل تو یہ کہتا ہے کہہ دے رازِ دل اس شوخ سے
ہے یہ ڈر مجھ کو زمانہ رازداں ہو جائے گا

آ گرا کوہِ ستم مسعودؔ یہ کیا تھی امید
وقفِ جورِ آسماں یہ نوجواں ہو جائے گا

مولوی ممتاز علی چشتی سے چھوٹے مولوی مسعود علی چشتی اور مولوی مسعود علی چشتی سے چھوٹے مولوی منصور علی چشتی تھے۔ منصور تخلص تھا۔ ان کی ایک قومی نظم مولوی مسعود علی چشتی کے تراشوں سے ملی ہے جو درجِ ذیل ہے:

غیر سمجھے تھے ہمارا ہوا اب کام تمام
اور سنبھالے سے نہ سنبھلے گا اب اسلام کا نام

اور پھر بعض بزرگوں نے جو ہمت باندھی
لاج اسلام کی رکھی یہ کیا احسن کام
مدرسہ کھولے مسلمانوں کے بچے پڑھ جائیں
فرض تعلیم کی حجت کا ہو جس سے اتمام
اور خواتین کو رہِ علم پہ ڈالا ایسا
جس سے گھر گھر ہوا تعلیم کا اب چرچا عام
پھر یتیموں کی حمایت کا بڑا کام کیا
ایسے کاموں کا خدا ہی سے ملے گا انعام
انجمن تو یونہی بس خادمِ اسلام رہے
تا ابد زندہ زمانے میں ترا نام رہے

حواشی ــــ باب پنجم

۱۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی : بیاضِ یکدل نمبر ۱۳۔ اس اقتباس میں "بیت" سے مراد ہے پنجابی زبان میں شعر یا سی حرفی کا ایک بند۔

۲۔ مولوی یکدل : اوراق منسلک با گلستانِ سعدی (بخطِ یکدل) مکتوبہ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء۔ مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی۔

۳۔ سفر بہاولپور کا ذکر "بیاضِ اشعار" (مکتوبہ ۱۸۶۱ء) میں اس طرح ہے :

"خطبہ دیوان واقف کہ دستخطی ایشان در سرکارِ خانصاحب بہاول خاں عباسی بمطالعہ فقیر آمدہ"۔

اور قیامِ جموں کا ثبوت یکدل کے وہاں سے لکھے ہوئے خطوط ہیں جن میں سے ایک کا حوالہ پچھلے باب کے حواشی میں دیا جاچکا ہے۔

۴۔ یکدل : بیاضِ اشعار ۔ ف ۸۸

۵۔ پوری غزل بیاضِ اشعار ف : ۳۱ پر موجود ہے۔

۶۔ ڈبلیو کولڈسٹریم کے خط کا یہ ترجمہ "حیاتِ رشید" مرتبہ میرزا اعجاز حسین لاہور ۱۹۰۹ء کے ضمیمہ نمبر۱ میں درج ہے۔

۷۔ مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۷

۸۔ مولوی یکدل سے استفادے کا ذکر تحقیقاتِ چشتی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء کے ص ۱۹۱ پر موجود ہے

۹۔ مولوی نور احمد چشتی : تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۳۱

۱۰۔ خود مفتی غلام سرور لاہوری سے استفادے کا مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات میں کئی جگہ اعتراف

کیا ہے:

"اور زبانی مفتی غلام سرور صاحب وغیرہ سکنائے موضع مرزنگ اور حسب تحریر داراشکوہ

ثابت ہوا کہ . . . . . " تحقیقات: ص ۲۲۹

"کتاب سیدالمعارف سے مفتی غلام سرور صاحب مولف کتاب خزینۃ الاصفیاء

نقل کرتے ہیں کہ حضرت بہاول شیر کی عمر جب سو برس کی ہوئی تو آپ کی ریش مبارک

برآمد ہوئی تھی"۔ ایضاً: ص ۲۵۹

۱۱۔ تحقیقاتِ چشتی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۷ء میں مطبع کوہ نور سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کے اہتمام سے چھپا اور تیسرے ایڈیشن کی اشاعت پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور کی طرف سے ۱۹۶۴ء میں سید احسان علی کے اہتمام سے شائع ہوئی۔

۱۲۔ اس دور کا ایک اور اہم شاعر مظہر حسن مظہر بھی تھا جس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف چشتی اور اکبری دونوں نے اپنے مقطعوں میں کیا ہے۔ ان کا اردو دیوان بھی گمنامی کے اندھیرے میں چھپا ہوا ہے۔

۱۳۔ مظہر حسن مظہر کی ایک غزل مولوی احمد بخش یکدل نے بیاض نمبر ۱ میں نقل کی ہے جس کا مطلع ہے:

دیکھ اے ماہ جبیں آج ہوا عید کا چاند
تجھ کو ہر سال مبارک ہو سدا عید کا چاند

یکدل کو اس غزل کا یہ شعر بے حد پسند تھا ؎

شبِ معراج براقِ نبوی جب دیکھا
آ گیا شوق سے زیرِ سُمِ پا عید کا چاند

۱۴۔ مولوی نور احمد چشتی: دیوانِ چشتی۔ مکتوبہ مصنف بخطِ شکستہ مملوکہ راقم الحروف

۱۵۔ مولوی نور احمد چشتی: تحفۂ چشتی، لاہور مطبع پنجابی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء۔ ص ۷

۱۶۔ ایضاً: ص ۹ تا ۱۰

۱۷۔ مولوی ممتاز علی چشتی: روزنامچہ ممتاز علی چشتی، مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی لاہور۔ راقم الحروف

نے فوٹو سٹیٹ سے استفادہ کیا ہے۔

۱۸۔ مولوی محرم علی چشتی : ارمغانِ چشتی، ضمیمہ ہفتم، لاہور ۱۹۱۰ء۔ ص ۴

۱۹۔ پنجاب جرنل سیالکوٹ : جلد ۱، شمارہ ۱۔ مارچ ۱۹۰۷ء۔ ص ۲۱

۲۰۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے "پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا" میں رفیقِ ہند کے اجرا کے وقت ملک کی سیاسی اور صحافتی صورتِ حال کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس جگہ محض رفیقِ ہند کی اردو خدمات پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

۲۱۔ رفیقِ ہند (ہفتہ وار) لاہور۔ ۵ جنوری ۱۸۸۴ء۔ ص ۱

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ایضاً۔ ۱۲۔ جولائی ۱۸۸۴ء۔ ص ۳۲

۲۴۔ ضمیمہ رفیقِ ہند۔ ۱۸۔ اپریل ۱۸۸۵ء

۲۵۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر : پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا (مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی)، غیر مطبوعہ۔ ص ۱۹۲

۲۶۔ مولوی ممتاز علی چشتی : روزنامچہ مولوی ممتاز علی : ورق ۵۶ بخطِ مصنف۔ مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی لاہور۔

۲۷۔ انتخاب از مجموعہ اوراق مملوکہ مولوی مسعود علی چشتی لاہور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

باب ششم

چشتی خاندان کے ادبی و تہذیبی اثرات

چشتی خاندان کے جدِ اعلیٰ مولوی ضیاء الحق کے علم و فضل کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اور پنجاب کی سرزمین ان کے فیضان سے بالخصوص مستفیض تھی۔ ناظمِ لاہور نواب عبدالصمد خاں نے اپنے بیٹے زکریا خاں کو ان کی شاگردی میں دیا، جس سے امرائے سلطنت کے دل میں آپ کے احترام کا اندازہ ہوتا ہے۔ نواب عبدالصمد خاں خود نوشاہی قادری درویش تھا۔ وہ حضرت پیر محمد سچیارؒ نوشہروی خلیفہ حضرت حاجی محمد نوشاہ گنج بخش کے بیٹے سلطان عبدالجلیل کا مرید تھا۔ سلطان عبدالجلیل کے بیٹے سلطان محمد اکرم، نواب زکریا خاں کے گھر آیا جایا کرتے تھے کیونکہ نواب موصوف انہیں اپنے والد کا مرشد زادہ سمجھتے تھے۔ اس موقع پر نواب زکریا ہمیشہ گھر میں درویشوں کی دعوت کیا کرتے تھے ایسی ہی ایک دعوت کا ذکر پیر کمال لاہوری نے مثنوی مخالفِ مذہبیہ میں بھی کیا ہے جس میں لاہور کے مرجع خلائق درویش اور پیر کمال لاہوری کے پیرِ طریقت حضرت شہمیر قلندر لاہوری بھی تشریف رکھتے تھے۔[1]

مولوی ضیاء الحق چشتی حاکمِ لاہور کے خاندان کے علاوہ متعدد بلند مرتبہ خاندانوں کے استاد اور اتالیق تھے۔ آپ کا ہر شاگرد علم و دانش کا مینارۂ نور تھا۔ سکندر خاں خاکوانی جو کمسن عمری میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں وکیلِ ملکیرہ کی حیثیت سے آتے تھے، مولوی ضیاء الحق کے شاگرد تھے۔

ان کے بارے میں مولوی نور احمد چشتی نے لکھا ہے :

"اس اثنار میں ملک سکندر خاں صاحب وکیل منکیرہ، لاہور میں واسطے ملاقات راجہ رنجیت سنگھ کے آئے اور شہر میں تلاش کی کہ کوئی شخص اولاد میں، مولوی بہاء الحق اور مولوی ضیاء الحق سے یہاں ہے کہ نہیں۔ لوگوں نے والد ماجد بندہ کا نام لیا اور وہ آپ کو اپنے پاس بلوا کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ : "میں حضرت مولوی ضیاء الحق کا شاگرد تھا"۔[۲]

امرناتھ اکبری نے ۱۸۰۸ء کے واقعات میں سکندر خاں خاکوانی کے تدبرّ اور فراست کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے :

"عالیجاہ سکندر خاں خاکوانی کہ از اعزۂ افغانیہ و در دانائی و پیش بینی ہمچو او در آن سرزمین کم بہم می رسد"۔[۳]

اور مولوی احمد بخش یکدل لکھتے ہیں :

"حضرت سکندر خاں خاکوانی، ملتانی چہ تہوّر در میدان طریقت داشت و کنارہ از معاصی و اجتناب از زخارف (کذا) و خود را مولف سحر و شام داشتی سبحان اللہ چہ کلام و چہ اصراف بر اسرار قلوب"۔ (بیاض یکدل نمبر ۱۴)

ظاہر ہے کہ یہ سب مولوی ضیاء الحق کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔

مولوی ضیاء الحق چشتی کے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم خوش دل چشتی کا نواب زکریا خاں بہادر والی لاہور کے دربار میں بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ آپ اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ نادر شاہ بادشاہ ایران نے لاہور میں انہیں "حسّان العجم" کا خطاب دیا تھا جس کا ذکر گذشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ اس خطاب کے بعد آپ کا حلقۂ اثر اور حلقۂ ارادت بہت وسیع ہو گیا تھا۔ لاہور میں اسلامی سلطنت کے خاتمے اور سکھوں کی حکومت کے زمانے میں بھی آپ کے احترام میں فرق نہ آیا حتیٰ کہ لاہور کے تین ظالم حاکموں گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ وغیرہ کے زمانے میں بھی آپ کی بزرگی و تقدس کو

مدِ نظر رکھتے ہوئے سرکار کی طرف سے آپ کی مدِ معاش کا بندوبست برقرار رہا۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مولوی محمد ابراہیم چشتی کی ساری ہمدردیاں اسلامی حکومت کے ساتھ تھیں اور انہیں افغانوں کے شہر سے بے دخل ہونے اور سکھوں کے قبضہ کر لینے پر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس قبضے کے تہذیبی اور معاشرتی نتائج سے آگاہ تھے۔ انہیں علم تھا کہ یہ قبضہ لاہور میں نہ صرف اسلامی حکومت کے خاتمے کا باعث ہوگا بلکہ اہلِ لاہور کے تہذیبی اور تمدنی افکار سے پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ چنانچہ اس وقت مولوی محمد ابراہیم چشتی کے دوست مفتی محمد اکرم کے دستخط تو اس محضر پر نظر آتے ہیں جس میں اہلِ لاہور کی طرف سے رنجیت سنگھ کو حملے کی دعوت دی گئی تھی لیکن مولوی محمد ابراہیم چشتی کا نام کسی تاریخ میں یادداشت نہیں کیا گیا۔

سکھوں سے اس نفرت نے مولوی غلام حسین چشتی کو پہلے دنیا سے لاتعلق ہو کر پیرِ طریقت کی تلاش میں نکلنے اور پھر ترکِ وطن کر کے افغانستان جانے پر مجبور کیا۔ مولوی ضیاء الحق نے افغانستان سے واپس آ کر تبلیغِ علم و دین کی ایک نئی راہ دریافت کی اور وہ یہ کہ غیر مسلموں یعنی اہلِ ہنود اور سکھوں کے بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ اس تدریس کے دوررس تہذیبی اثرات مرتب ہوئے۔

سب سے پہلا نتیجہ جو مولوی غلام حسین چشتی کی تدریس سے برآمد ہوا، یہ تھا کہ پنجاب میں غیر مسلم بلکہ اسلام دشمن حکومت کے باوجود عوام نے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، اسلامی علوم کی بالادستی قبول کر لی۔ کوئی راجکمار یا کنور اس وقت تک مسندِ اقتدار پر بیٹھنے کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک اس کے نام پر مولوی غلام حسین چشتی یا ان کے خاندان کی علمی فضیلت کی مہر ثبت نہ ہوتی تھی۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی اقتدار تو غیر مسلموں کے ہاتھ میں رہا لیکن تہذیبی اور سماجی اقتدار مسلمان اہلِ علم و دانش کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے اربابِ ریاست معمولی عامل سے لے کر مہاراجہ تک مسلمان معلّمین کے سامنے زانوئے ادب و نیاز تہ کر دیتے تھے۔ مولوی غلام حسین چشتی کے ہندو شاگردوں نے ان کے فارسی زبان کے علاوہ اردو ادب کی بھی تربیت حاصل کی۔ شِبد ناتھ مشتاق

مولوی صاحب ہی کے شاگرد تھے۔ مشتاق کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت نے الحاد اور کفر کی بجائے اسلام سے اثر قبول کیا تھا۔ ظاہر ہے جب استاد مسلمان ہوگا تو شاگرد اسلام دشمن کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اور بات ہے کہ وہ دائرہ اسلام میں نہ ہو لیکن اسلام دوست ہونا بھی بہت بڑی خوبی ہے۔ یہ خوبی تقریباً مولوی صاحب کے تمام شاگردوں میں تھی۔ مشتاق کی ایک غزل مولوی احمد بخش یکدل نے اپنی بیاض میں درج کی ہے اس کے دو اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن کی زبان مشتاق کے اندازِ فکر کی آئینہ دار ہے[۱۲]

اے باغباں تو دیکھ لے اپنا چمن کہ ہم

جوں بلبلِ خزاں زدہ دامن اٹھا چلے

"اللہ اکبر" اب تو ہمیں لوٹنا پڑا

کر ذبح منہ ہماری طرف سے پھرا چلے

اللہ اکبر کا استعمال اس تہذیبی عمل کی نشاندہی کرتا ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں پنجاب کے غیر مسلم معاشرے میں شروع ہو چکا تھا۔

اس تہذیبی عمل کو مولوی غلام حسین چشتی کے بیٹے مولوی احمد بخش یکدل کی کوششوں نے اور زیادہ وسعت دی۔

مولوی احمد بخش یکدل کا دائرۂ احباب وسیع تھا۔ ہندو مسلمان سکھ ہر قوم کے اکابرین ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ استادِ زبان وادب ہونے کے حوالے سے نجابتِ خاندانی کے سبب سے اور ذاتی علم وفضل کی بنا پر ان کا احترام اور ان کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے یوں تو ہندو مسلم کئی خاندانوں کو تعلیم دی لیکن جو فیضان دیوان دینا ناتھ کے خاندان کو ملا وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ حالانکہ ان کے مسلمان شاگردوں میں سے ملتان کے نواب عبدالمجید خان جیسے صاحبِ استعداد شخص بھی تھے اور ہندو شاگردوں میں بیج ناتھ خلف دیوان اجودھیا پرشاد، گلاب رائے بھیم سین، اشودت رائے پنڈت، رتن چند داڑھی والا[؟] اور گنپت رائے جیسے خاندانی اور بااثر گھرانوں کے

چشم و چراغ موجود تھے، ان میں سے بیج ناتھ اور شو دت رائے نے نوادر و ادب میں بھی اپنے آپ کو متعارف کرایا۔ ان کے اشعار بیاضوں میں پراگندہ صورت میں موجود ہیں لیکن راجہ دینا ناتھ کے خاندان کو ایک خاص سعادت نصیب ہوئی کہ وہ نہ صرف یکدل کے ہاتھوں زیورِ علم و ادب سے آراستہ ہوئے بلکہ اس خاندان کے افراد کی فکری اور ذہنی تربیت یکدل کی خواہش کے مطابق ہوئی۔ دیوان دینا ناتھ تو فارسی کے بہت اچھے شاعر اور سوز تخلص کرتے تھے۔ چند شعر اردو میں بھی کہے ہیں۔ یکدل نے بیاضوں میں ان کی کہی ہوئی مختلف نادر چیزیں درج کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اسلامی افکار و نظریات کا پرتو نمایاں ہے۔ راجہ دینا ناتھ سے زیادہ قابلِ توجہ مولوی احمد بخش یکدل کے لائق شاگرد اور راجہ دینا ناتھ سوز کے بیٹے دیوان امر ناتھ اکبری ہیں۔

مولوی احمد بخش یکدل نے امر ناتھ اکبری کی تربیت بالکل اپنی حقیقی اولاد کی طرح کی اور کوشش کی کہ اسے اپنی شخصیت کا تمام روپ دے دیں۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ چنانچہ امر ناتھ اکبری استاد کے رنگ میں ایسے رنگے کہ اسلوبِ تحریر تو ایک طرف ان کے اور مولوی یکدل کے طرزِ تحریر یعنی لکھائی میں بھی زیادہ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ رہی افکار و نظریات کی بات تو امر ناتھ اکبری کی کوئی تصنیف بھی اٹھا کر دیکھ لیں اگر اس کا نام سامنے نہ ہو تو کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ کسی غیر مسلم کی تحریر ہے۔ اس جگہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر اس نکتے کی قدرے وضاحت کر دی جائے۔

دیوان امر ناتھ اکبری، راجہ دینا ناتھ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ سمت ۱۸۷۹ بمطابق ۲۳-۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ایک سال کے تھے کہ ماں کو موت نے آلیا اور انہیں دایہ کی گود میں دے دیا گیا۔ راجہ دینا ناتھ نے دوسری شادی کر لی۔ ۱۸۲۶ء کے قریب اکبری کو مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ انہیں علومِ عقلیہ اور نقلیہ سے سرفراز کریں۔ اکبری بچپن میں ذہنی انقباض کا شکار ہونے کے باوجود، جو انہیں سوتیلی ماں کے سبب گھر سے ملا تھا، بے حد ذہین، زود فہم تھے۔ استاد کی خاص توجہ نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ گیارہ سال کی عمر میں اکبری نے ایک کتاب اپنے استاد زادے مولوی نور احمد چشتی کے پاسِ خاطر سے لاہور کے باغات کے بارے میں لکھی جس کا نام "روضۃ الازہار" رکھا۔ اس

کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بندہ راقم در عہد یازدہ سالگی بپاس مخدوم زادۂ برحق مقبول اللہ الصمد مولوی نور احمد چشتی لمرحم اللہ تعالیٰ کتابی موسوم بروضۃ الازہار مدون ساختہ"[۶]

۳۵۔ ۱۸۳۴ء میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور فتح کیا تو فتح نامہ لکھنے کی خدمت اکبری کو سونپی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بارہ سال کی عمر میں ہی ان کی انشا پردازی دربار تک متعارف ہو چکی تھی۔ مولوی احمد بخش یکدل کو بحیثیت معلّم یا استاد اس سے زیادہ اور کیا خراجِ تحسین پیش کیا جا سکتا ہے۔ اکبری کا انتقال بھی مولوی یکدل کے ساتھ ہی ۱۸۶۷ء میں ہوا۔

اس سال کے ہیضے نے مولوی یکدل کے دو بیٹوں کی جان لی۔ ایک مولوی نور احمد کی جو مولوی یکدل کے صلبی بیٹے تھے اور دوسری امرناتھ اکبری کی جو مولوی یکدل کے روحانی بیٹے تھے۔

اکبری کے آثارِ علمی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی یکدل سب سے پہلے اپنے شاگردوں کو، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اسلامی تعلیمات کا درس دیتے تھے۔ امرناتھ اکبری کو تو قرآن پاک بڑی محنت اور احتیاط سے پڑھایا گیا تھا۔ ممکن ہے انھوں نے مولوی نور احمد چشتی کے ہمراہ ہی پڑھا ہو یا ان سے بھی پہلے کیونکہ اکبری، مولوی نور احمد سے عمر میں کچھ سال بڑے تھے۔ ان کی قرآن خوانی کا ثبوت ان کی تصنیف ظفر نامہ رنجیت سنگھ کی نثر سے مہیا ہوتا ہے۔ ان کے نثری اسلوب میں قرآنی آیات اور احادیث، نیز مشائخِ اسلام کے عربی اقوال کی کثرت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اکبری قرآنی آیات کی سند کے بغیر بات مکمل نہیں کر سکتے۔ کتاب مذکور سے چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

۱۔ "و مستردان آن دولت را در زوایای گمنامی متواری سازد۔ تا جز او بخداوند نگیرند و سوائے ذاتِ بے مثال او بمسجودی نپذیرند: آیۃ؛

تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء۔"

۲۔ و نو بخانۂ الٰہی بخش کیدان در گوش متحصنان آیۃ:

اذا زلزلت الارض زلزالها برخواند"۔[۸]

۳۔ ااہتزجہان صعود از آسمان زدبان ادخلوا فیہا نزول شد"۔[۹]

۴۔ وچون ازعالم سماوی سپاه انزل اللہ جنوداً لم تروھا عاشیہ کش رکاب ظفر انتساب مابود"۔[۱۰]

۵۔ تزلزل کوہ بصدمات سواران بلاجوش آیہ: وامطرنا علیہم حجارۃ بگوش عالمیان میرسانید"۔[۱۱]

ایسی لاتعداد مثالیں ظفرنامہ رنجیت سنگھ کی نثر میں دکھائی دیتی ہیں، جن سے لکھنے والے کی افتادِ طبع اور روشِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

دیوانِ اکبری (اردو و فارسی) شاعر کی وفات کے چھ سال بعد ۱۹۰۳ء میں مطبع کوہِ نور لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں بھی اکبری اپنی شخصیت کی بھرپور عکاسی کر رہے ہیں۔ فکرِ اسلامی کی چھاپ ہر غزل، قصیدے اور مثنوی پر موجود ہے۔ اکبری نے فارسی میں حافظ شیرازی، سعدی شیرازی، نظیری اور غالب کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ غالب سے اس قدر متاثر ہے کہ اگر اسے غالب کا مقلد کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ جن اشعار میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

خوش است اکبری این شعر غالبؔ دہلی
دریں جناب باداب و انکسار بیا

از غالبِ دہلی بہ خوش است اکبری این شعر
اے مردمِ کلکتہ بہ وطنز روا نیست

غالب کند بطرز نظیری تلاشِ شعر
این اکبریؔ فریفتۂ عزو جاہ کیست

مسلّم است بنزدیک اکبریؔ غالب
اگرچہ داد سخن مردک حزیں ندید

اے اکبریؔ ز شعر خود آں غالبِ دہلی
ایں سینۂ صد چاک مرا بہرِ رفو برد

اردو میں جن شاعروں سے زیادہ متاثر ہیں اور جن کی زمینیں انہیں دعوتِ تقلید دیتی ہیں، ان میں مولوی بیکدل، مظہر حسن مظہر، بہادر شاہ ظفر، امام بخش ناسخ اور میرزا خاور قابلِ ذکر ہیں۔ ظفر کی زمینوں میں انہوں نے سب سے زیادہ غزلیں لکھی ہیں:

اکبریؔ شعرِ ظفر نے یہ دکھایا ہے اثر
دل میں سو زخم ہے تن پر کوئی آثار نہیں

ہے اکبریؔ کو طرزِ ظفر آج یہ پسند
گل کی چمن میں بادِ صبا سے بگڑ گئی

اکبریؔ ناسخ ہے شاعر، ہوں میں اس کا معتقد
بزمِ دانا میں بھلا کیا حرفِ ناداں سبز ہو

بہادر شاہ ظفر سے اکبری کی عقیدت بھی زیادہ تر مولوی بیکدل کی وجہ سے تھی کیونکہ بیکدل، بہادر شاہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اکبری کے دیوان کی پہلی غزل فارسی میں ہے جس کا مطلع ہے:

الا یا طالب الباقی دع الشہوات ابطلھا
بمستی ہا برادر سر گذر از بندِ مشکلھا

اردو کے چند اشعار قابلِ توجہ ہیں:

یادِ وحدت میں تعلق کا جو پردہ اٹھا
صاف ہستی کا ہمیں آپ ہی دھوکا اٹھا

انساں کو حق نے نور کا مظہر بنا دیا
اک مشتِ خاک تھا جسے جوہر بنا دیا

یدِ بیضا کی قسم اے خطِ گلزار قدم
مخزنِ فیض ہے یاں مطلع انوار قدم
بیعتِ حضرتِ موسیٰ نے دکھایا یہ اثر
شجرِ طور کا لیتا ہے ہر اک خار قدم
شوق سے غرفہ نشینانِ جہاں کہتے ہیں
نظر آویں ہمیں یارب سرِ بازار قدم

قیس کی روح کا ہے آج جو عزمِ پرواز
ناقۂ لیلیٰ کو کیوں نجد میں ٹھلاتے ہو

مقدمِ یوسف سے ہے بیت الحزن بیت الشرف
گلرخانِ سبز خط سے وقت زنداں سبز ہو

خدا سے ڈر کہ میری آبرو کا تو نہ ہو دشمن
میں ہوں اک بلبلہ اور زندگانی میری دم بھر ہے

ان اشعار کے مطالعے سے جہاں اکبری کی ذہنی ساخت کا پتہ چلتا ہے وہاں چشتی خاندان کے ادبی اور تہذیبی اثرات کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔

مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقاتِ چشتی کا خاکہ بنا کر اہلِ علم اور اہلِ تاریخ کو ایک نیا موضوع دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ برصغیر میں دو محقق تقریباً ایک وقت میں ایک ہی طرح کا مواد اکٹھا کر رہے تھے۔ دونوں کے درمیان بعد مکانی تھا اور دونوں ایک دوسرے کے طریقِ کار اور نوعیتِ کار سے ناواقف تھے۔ میری مراد سر سید احمد خان اور مولوی نور احمد چشتی سے ہے۔ مقدم الذکر نے آثار الصنادید اور موخر الذکر نے تحقیقاتِ چشتی مرتب کی لیکن مولوی نور احمد کو عمر کے لحاظ سے سر سید پر تقدم حاصل ہے، گویا تحقیقاتِ چشتی کا کام اردو میں آثار شناسی کے اوّلین کاموں میں سے ہے۔ اس کے اثرات بے شمار تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ تحقیقاتِ چشتی کے بعد محققین کو اندازہ ہوا کہ برصغیر کی تہذیبی تاریخ میں آثار شناسی اور خاص طور پر اہل اللہ کے آثار اور اسلامی عمارات بالخصوص مساجد کے حوالے سے کام کرنا بےحد ضروری ہے۔ چنانچہ تحقیقاتِ چشتی کے بعد شائع ہونے والی کتابیں مثلاً تاریخ مخزنِ پنجاب از مفتی غلام سرور لاہوری اور تاریخِ لاہور از کنہیا لال ہندی، مولوی نور احمد چشتی کی روشِ کار کی پیروی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مولوی محرم علی چشتی کی تہذیبی اور ادبی خدمات اور ان کے اثرات رفیقِ ہند کے حوالے سے پہچانے جائیں گے۔ انہوں نے رفیقِ ہند کو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت، ادب اور دینی نظریات کا نمائندہ بنا دیا۔ انگریزوں کے سامنے نہ جھکنا انہیں والد کی طرف سے ورثے میں ملا تھا لہٰذا انہوں نے صحت مند تنقید کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ پچھلے باب میں رفیقِ ہند کے حوالے سے یہ تمام باتیں واضح کی جا چکی ہیں۔ مولوی محرم علی چشتی دین کے سچے عاشق تھے۔ انہوں نے دین کی سربلندی کے خلاف ہر حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پوری قوم کو ہمنوا بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قید کیے جانے پر صدہا مسلمان گڑگڑا کر خدا کے حضور ان کی رہائی کی دعائیں مانگتے تھے۔ قید خانے میں ان کی اتری ہوئی تصویریں کئی گنا قیمت ادا کر کے حاصل کرتے تھے لیکن اربابِ اقتدار یعنی انگریزوں کو مولوی محرم علی

ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مولوی محرم علی چشتی نے رفیقِ ہند کے ذریعے تحریک شروع کی اور اس کے نتیجے میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ مسلمان طلبا کے لیے وظائف مقرر ہوئے۔ مساجد واگزار ہوئیں۔ غرضیکہ جو کچھ رفیقِ ہند یا مولوی محرم علی چشتی نے چاہا وہی ہوا لیکن مولوی محرم علی چشتی کو کوئی خطاب پیش نہ ہوا۔ اور شاید اگر پیش بھی ہوتا تو وہ لینے سے پہلے غور و فکر ضرور کرتے، کیونکہ ان کا مشن حصولِ خطاب نہیں تھا بلکہ مسلمان قومیت کا تہذیبی تعارف تھا جسے انگریز حاکم اقتدار کے نشے میں نظرانداز کر رہا تھا۔ مولوی محرم علی نے حق گوئی اور صداقت کی جو روایت قائم کی وہ دنیائے صحافت میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

ان کے فرزند مولوی محمد ابراہیم علی چشتی بھی کالج سے فارغ ہو کر باپ کے نقشِ قدم پر چلے۔ انہوں نے پاکستان میں نظامِ اسلام کو رائج کرنے اور اس کے تمدنی نقوش واضح کرنے میں بہت پیش قدمی کی۔ وہ زندگی بھر مجرّد رہے اور عمرِ عزیز کا ایک ایک لمحہ قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ مولوی ابراہیم علی چشتی کو ان کے جاں نثار دوست زندہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ دوست فکری سفر میں ہمیشہ ان کے ساتھ تھے اور آج بھی ان کے افکار کو لے کر قومی فلاح کے راستوں پر گامزن ہیں۔

حواشی ــــ باب ششم

۱۔ پیر کمال لاہوری: تحائفِ قدسیہ (خطی) مملوکہ راقم الحروف

۲۔ مولوی نور احمد چشتی: تحقیقاتِ چشتی، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۲۳

۳۔ امرناتھ اکبری: ظفر نامہ رنجیت سنگھ: مرتبہ پروفیسر سیتا رام کوہلی، لاہور ۱۹۲۸ء، ص ۴۷

۴۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی: بیاضِ یکدل نمبر ۱۷ ف ۴۲۴

۵۔ لاہور میں ان کی سرائے رتن چند مشہور ہے ساس سرائے کے گرد باغ تو ختم ہو گیا۔ سرائے کا کچھ حصہ میو ہسپتال کے سامنے موجود ہے جس میں کچھ عرصہ پہلے نمک منڈی بنی ہوئی تھی۔

۶۔ امرناتھ اکبری؛ دیوان: ظفر نامہ رنجیت سنگھ، لاہور ۱۹۲۸ء، ص ۲۱۲

۷۔ ایضاً: ص ۷ (مقدمہ)

۸۔ ایضاً: ص ۱۰۲

۹۔ ایضاً: ص ۱۱۵

۱۰۔ ایضاً: ص ۱۲۵

۱۱۔ ایضاً: ص ۱۲۱

ماخذ ومصادر

ا: چشتی خاندان کی تصانیف اور دستاویزات

احمد بخش یکدل، مولوی چشتی : مخطوطات

۱۔ تحفۂ یکدل : بخطِ مصنف ۔ مکتوبہ ۱۸۶۱ء ۔ مملوکہ راقم الحروف

۲۔ رسالہ شمسیہ : مسودہ فارسی، بخطِ مصنف ۔ ” ”

۳۔ رسالہ شمسیہ : ” اردو مع دیباچہ ۔ بخطِ مصنف ” ”

۴۔ واسع باری (خطی) مکتوبہ شودت نرائن پنڈت ۔ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور : ذخیرۂ شیرانی

۵۔ سوانح عمری حضرت مخدوم علی ہجویری : بخطِ مصنف ۔ مملوکہ راقم الحروف

۶۔ دیباچہ دیوان سبحان اللہ حقیر : بخطِ یکدل ۔ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

۷۔ متفرق اوراق : بخطِ یکدل ۔ مملوکہ راقم الحروف

۸۔ بیاض کلامِ اردو ۔ ” ” ۔ مملوکہ کتاب خانہ شخصی راقم الحروف

۹۔ رسالہ چہار خانوادہ ۔ ” ” ۔ بپاس خاطر فقیر کرم بخش نوشاہی ۔ مملوکہ کتاب خانہ راقم الحروف

۱۰۔ احوالِ افغانستان : بخطِ مصنف ۔ مملوکہ راقم الحروف

۱۱۔ انشای یکدل : ” ” ”

۱۲۔ بیاضِ اشعار : بخطِ مصنف ۔ مکتوبہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء ۔ مملوکہ راقم الحروف

۱۳۔ بیاض یکدل (روزنامچے) بتفصیل ذیل ۔ مملوکہ پروفیسر قرۃ العین چشتی

بیاض نمبر۱	۱۸۲۱ء تا ۱۸۳۳ء
" نمبر۲	۱۸۳۳ء تا ۱۸۳۵ء
" نمبر۳	۱۸۳۵ء تا ۱۸۳۷ء
" نمبر۴	۱۸۳۷ء تا ۱۸۳۸ء
" نمبر۵	۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۰ء
" نمبر۶	۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۲ء
" نمبر۷	۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۳ء
" نمبر۸	۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۴ء
" نمبر۹	۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۵ء
" نمبر۱۰	۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۶ء
" نمبر۱۱	۱۸۴۶ء تا ۱۸۴۷ء
" نمبر۱۲	۱۸۴۷ء تا ۱۸۴۸ء
" نمبر۱۳	۱۸۴۸ء تا ۱۸۴۹ء
" نمبر۱۴	۱۸۴۹ء
" نمبر۱۵	۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۰ء
" نمبر۱۶	۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۱ء
" نمبر۱۷	۱۸۵۲ء
" نمبر۱۸	۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۴ء
" نمبر۱۹	۱۸۵۷ء (تلف کردی گئی)

بیاض نمبر ۲۰   ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء

۱۴۔ مکتوباتِ یکدل : بخطِ یکدل ۔ مملوکہ راقم الحروف

۱۵۔ گلستانِ سعدی مع روزنامچہ ۔ بخطِ یکدل ۔ مملوکہ نیشنل میوزیم کراچی

۱۶۔ بیاضِ غزلیاتِ اردو : بخطِ مولوی محمد علی پُر دل چشتی فرزند یکدل ۔ مملوکہ راقم الحروف

مولوی نور احمد چشتی : مخطوطات و مطبوعات

۱۷۔ نور النساء : بخطِ مصنف ۔ مملوکہ راقم الحروف

۱۸۔ ندیم الرمل   "   "   "   "

۱۹۔ خیالاتِ دانش   "   "   "   "

۲۰۔ دیوانِ چشتی اردو   "   "   "   مکتوبہ ۱۸۶۴ء

۲۱۔ حمایت الصبیان : ناپید

۲۲۔ ذخیرۃ اللطافت : "

۲۳۔ فال اختر : "

۲۴۔ حل لغاتِ محاورہ "

۲۵۔ رقعہ مولوی نور احمد چشتی ۔ مطبوعہ ناقص الآخر سنہ ندارد

۲۶۔ عجائباتِ چشتی   "   لاہور مصطفائی ۱۸۵۹ء

۲۷۔ تحفہ چشتی   "   لاہور مطبع پنجابی ۱۲۴۷ھ

۲۸۔ مقامِ حیرت (پنجابی)   "   "   "   ۱۸۶۰ء

۲۹۔ یادگارِ چشتی   "   مرتبہ گوہر نوشاہی لاہور ۱۹۷۵ء

۳۰۔ تحقیقاتِ چشتی   "   پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء

مولوی محرم علی چشتی : مطبوعات۔

۳۱۔ شجرات المشائخ	مطبوعہ	نولکشور	۱۹۰۸ء
۳۲۔ قصیدہ الغیاثیہ	"	لاہور، رفاہ عام	۱۳۲۲ھ
۳۳۔ ایک نئی بلت	"	لاہور	سنہ ندارد
۳۴۔ مثنوی بحر الاسرار	"	"	۱۹۰۰ء
۳۵۔ اسرار التصوف	"	"	۱۹۰۳ء
۳۶۔ ارمغانِ چشتی	"	" حمیدیہ سٹیم پریس	۱۹۱۱ء
۳۷۔ اخبار رفیقِ ہند۔ ہفتہ وار لاہور (مکمل فائل)			۱۸۸۴ء

مولوی حامد علی چشتی : مخطوطات

۳۸۔ روزنامچہ حامد علی (فارسی)	نمبر ۱	جولائی ۱۸۹۲ء تا مئی ۱۸۹۳ء
۳۹۔	نمبر ۲	" ۱۸۹۳ء تا جون ۱۸۹۴ء
	نمبر ۳	" ۱۸۹۴ء تا مئی ۱۸۹۵ء
	نمبر ۴	دست یاب نہ ہو سکا
	نمبر ۵	۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۷ء
	نمبر ۶	۱۸۹۷ء تا اپریل ۱۹۰۱ء
	نمبر ۷	اپریل ۱۹۰۱ء تا مئی ۱۹۰۲ء
	نمبر ۸	جون ۱۹۰۲ء تا نومبر ۱۹۰۳ء
	نمبر ۹	جنوری ۱۹۰۴ء تا فروری ۱۹۰۵ء
	نمبر ۱۰	مارچ ۱۹۰۵ء تا مئی ۱۹۰۶ء

نمبر۱۱ جولائی ۱۹۰۶ء تا جون ۱۹۰۷ء

نمبر۱۲ ستمبر ۱۹۰۷ء 〃 دسمبر ۱۹۰۸ء

نمبر۱۳ جنوری ۱۹۰۹ء 〃 جنوری ۱۹۱۰ء

نمبر۱۴ 〃 ۱۹۱۰ء 〃 نومبر ۱۹۱۰ء

نمبر۱۵ نومبر ۱۹۱۱ء 〃 فروری ۱۹۱۲ء

نمبر۱۶ مارچ ۱۹۱۲ء 〃 مارچ ۱۹۱۳ء

نمبر۱۷ 〃 ۱۹۱۳ء 〃 جولائی ۱۹۱۴ء

نمبر۱۸ دستیاب نہ ہوسکا

نمبر۱۹ ستمبر ۱۹۱۵ء تا جولائی ۱۹۱۶ء

مولوی عبدالرشید چشتی : مقالاتِ مطبوعہ و منظومات

۴۰۔ مشمولہ "حیاتِ رشید" لاہور، رفاہ عام پریس ۱۹۰۹ء

مولوی ممتاز علی چشتی: مخطوطات

۴۱۔ روزنامچہ ممتاز (اردو)۔ بخطِ مصنف۔ فوٹوسٹیٹ مملوکہ راقم الحروف

۴۲۔ دیوانِ ممتاز۔ مملوکہ مولوی مسعود علی چشتی

مولوی محمد ابراہیم علی چشتی

۴۳۔ تزکِ ہٹلری (ترجمہ)۔ لاہور، لائٹ پریس

۴۴۔ انگریز کا راج کیوں ختم ہوا (ترجمہ) 〃 〃

۴۵۔ اردو قرآن مجید 〃، دارالخلافت پیسہ اخبار ۱۲۵۸ھ

۴۶۔ پاکستان کے لیے جدید اسلامی دستور — لاہور، لائن پریس

۴۷۔ امت اور سنت — 〃 〃

⊙

ب۔ مخطوطات

۴۸۔ پیر کمال لاہوری : مثنوی تحائفِ قدسیہ۔ تصنیف ۱۱۶۹ھ مملوکہ راقم الحروف

۴۹۔ سوہن لال سوری لالہ : عمدۃ التواریخ۔ بخطِ مصنف 〃 〃

۵۰۔ غلام حسین خورم : مضحکاتِ خورم۔ مخطوطہ نمبر ۲۰۰۶۔ یونیورسٹی لائبریری لاہور

۵۱۔ فقیر سید عزیز الدین : روزنامچہ۔ لاہور پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور، عجائب گھر

۵۲۔ ایضاً : کتاب المراسلات۔ مملوکہ فقیر خانہ لاہور

۵۳۔ غلام محی الدین نوشاہ ثانی : روزنامچہ، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

۵۴۔ نور الدین منور فقیر : دیوانِ منور 〃 〃 نیشنل میوزیم کراچی

۵۵۔ احمد شاہ بٹالوی سید : تاریخ ہندوستان۔ مخزونہ دیال سنگھ لائبریری لاہور

ج۔ مطبوعات

۵۶۔ آزاد، مولانا محمد حسین : مقالاتِ آزاد۔ مرتبہ آغا محمد باقر۔ لاہور ۱۹۶۸ء

۵۷۔ احمد یار مرالوی : رنجیت نامہ 〃 گلونت سنگھ۔ امرتسر

۵۸۔ اعجاز حسین میرزا : حیاتِ رشید — لاہور ۱۹۰۹ء

۵۹۔ اقبال علی، مولوی، سید : سفرنامہ پنجاب — 〃 ۱۹۷۲ء

۶۰۔ اکبر علی، صوفی : سلیم التواریخ — امرتسر ۱۹۱۹ء

۶۱۔ امداد صابری، مولانا : فرنگیوں کا حال — دہلی

۶۲۔ امرناتھ اکبری، دیوان؛ دیوانِ اکبری، لاہور، کوہِ نور ۱۸۷۳ء
۶۳۔ 〃 〃 〃 ؛ ظفرنامہ رنجیت سنگھ، 〃 پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۲ء
۶۴۔ باری علیگ: کمپنی کی حکومت 〃 نیا ادارہ ۱۹۶۹ء
۶۵۔ غلام سرور لاہوری، مفتی: تاریخ مخزنِ پنجاب۔ لکھنؤ، نولکشور ۱۸۷۷ء
۶۶۔ 〃 〃 〃 : گنج تاریخ 〃 〃 ۱۸۷۳ء
۶۷۔ 〃 〃 〃 : خزینۃ الاصفیا 〃 〃 ۱۸۸۸ء
۶۸۔ سنیا رام، کوہلی، پروفیسر: مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ الہ آباد ۱۹۳۳ء
۶۹۔ عبدالرحمن چغتائی: لاہور کا دبستانِ مصوری۔ لاہور ۱۹۷۹ء
۷۰۔ عبدالقدوس: تقویم تاریخی کراچی ۱۹۶۵ء
۷۱۔ عبدالکریم منشی: واقعاتِ درانی لاہور ۱۹۶۳ء
۷۲۔ عتیق صدیقی: صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات علی گڑھ ۱۹۶۲ء
۷۳۔ علی الدین مفتی: عبرت نامہ لاہور ۱۹۶۱ء
۷۴۔ غلام دستگیر نامی: تاریخِ جلیلہ 〃 ۱۹۶۰ء
۷۵۔ فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ لکھنؤ، نولکشور ۱۹۰۶ء
۷۶۔ فوق، محمد الدین: اخبار نویسوں کے حالات۔ لاہور ۱۹۱۲ء
۷۷۔ قادر بخش صابر: تذکرہ گلستانِ سخن 〃
۷۸۔ کنہیا لال ہندی: تاریخِ لاہور 〃 ۱۸۸۴ء
۷۹۔ 〃 〃 : تاریخِ پنجاب 〃 وکٹوریہ پریس ۱۸۸۱ء
۸۰۔ لیپل گرفن، سر: رولرز آف انڈیا (رنجیت سنگھ) حیدر آباد (بھارت) ۱۹۲۲ء
اردو ترجمہ: نظیر حسین فاروقی
۸۱۔ محمد لطیف، سید: تاریخ پنجاب لاہور مطبع پنجابی ۱۸۸۸ء

۸۲۔ محمود شیرازی، حافظ : پنجاب میں اردو ؛ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی : لاہور ۱۹۷۲ء

۸۳۔ وکیلی فوفلزئی : درۃ الزمان کابل (افغانستان) ۱۸۸۸ء

د۔ مقالات و مقدمات

۸۴۔ سیتا رام کوہلی : مقدمہ ظفر نامہ رنجیت سنگھ لاہور ۱۹۲۸ء

۸۵۔ گوہر نوشاہی : اردو شاعری میں لاہور کا حصہ پنجاب یونیورسٹی ،، ۱۹۶۵ء

۸۶۔ ،، ،، : مقدمہ یادگارِ چشتی ،، ۱۹۷۵ء

۸۷۔ ممتاز اختر مرزا (ممتاز گوہر) : پنجاب میں اردو

ادب کا ارتقاء۔ ،، ،، ،، ۱۹۷۸ء

۸۸۔ ،، ،، : عجائباتِ چشتی اور اس کا مصنف ۔ قومی زبان۔ کراچی ۱۸۷۸ء

ہ۔ اخبارات و جرائد

۸۹۔ سفیرِ ہند امرتسر ۱۸۷۸ء

۹۰۔ کوہِ نور لاہور ۱۸۵۲ء۔ ۱۸۵۵ء

۹۱۔ رسالہ انجمن اشاعت (انجمن پنجاب) ۱۸۷۰ء

۹۲۔ رفیقِ ہند لاہور ۱۸۸۴-۱۸۸۵-۱۸۸۶ء

و۔ انگریزی مطبوعات

93. Buckland, C.E. Dictionary of Indian Biography (1779-1869) London 1878.

94. Cunningham: History of Sikhs - Culcutta 1904.

95. Elsmie, S.R. Thirty five years in the Punjab, Lahore, Al-Biruni, 1975.

96. C. Aitchison: Lord Lawrence, London

97. Garrett, Lt. Col. Events at the Court of Ranjet Singh. 1911-1817, Lahore 1935.

98. Ibbetson: Punjab Casts, Lahore 1914.

99. James Burgess: The Chronology of Modern India, Lahore, 1975.

100. Khazan Singh, Hist. and Philosophy of Sikh Religion, Lahore 1911.

101. Mohammad Baqir, Dr. Lahore Past and Present, Lahore, Punjab University 1952.

102. M. Latif Syed: History of the Punjab, Lahore. 1964.

103. Nazir A. Chaudhary: Development of Urdu literature as official language in Punjab 1849-1974. Lahore 1977.

ضمائم

انتخاب از: تحفۂ یکدل تصنیف مولوی یکدل چشتی!

شرح احوال مؤلف

○

یکدل شده ام چو غنچه مشهور — از خاکِ مقدسِ لهانور
آجو دهنم آمده ز اجداد — مولد منشا که باد آباد
زان رو که پُرَ از تبار چشت است — پنجاب زمین همه بهشت است
شاداب زمینِ او ز راوی! — از قصه سلسبیل راوی
خضرش او به کمال سازد — از آبِ حیوان خیال سازد
شیخ من داب و فخرِ آدم — فرزندِ فرید و فردِ عالم
آزاد وهماے دل بدامش — ز اخلاق حسن، حسین نامش
چون دولت عشق شد گرمیش — زد سکه فلک بنام نامیش
سالی بکعبه اندرون خفت — در دردِ حسین رفتم او گفت
شد کعبه ز مقدمش چون آباد — سالش شد رحمت خدا باد
گیرم که چراغِ چشتیانم — نو باوۂ باغ چشتیانم
فخرِ دو جهان ز فخر دینم — فخر الشعراء کل نگینم
اندوخت دل من از شکر گنج — از گنجِ شکر بگنج در گنج
نیٔ خارِ نهالِ خاندانم — من دودِ چراغِ دودمانم!
از قافله جوق جوق بگذشت — عمرم همه در فسوق بگذشت

لرزم ز کلام شیخ گنجه | از شوخی خود نموده رنجه
گر فیض سخن بنام او گشت | در شعر فلک بکام او گشت
اقرار بقادر الکلامیست | لیکن نه ز انبیا نظامیست
اینجا لرزند چون اولوالعزم | او کیست، اگر ز مرسلین بزم
رحمت بروان شیخ شیراز | رضوان بجان شیخ شیراز
از پای دو چشم کن ببستان | سیری و نگر سوی گلستان
من بندهٔ حضرت کریمم | پروردهٔ نعمت قدیمم
گر بی هنرم و گر هنرمند | لطفست امیدم از خداوند
تا آنکه بضاعتی ندارم | سرمایهٔ طاعتی ندارم
او چارهٔ کار بنده داند | چون هیچ (×) دستیش نماند (کذا)
سعدی ره کعبهٔ رضا گیر | این مرد خدا ره خدا گیر
بدبخت کسی که سر بتابد | این درگه در دگر نیابد
بشنو سخنم ز روی مردی | من چشتی و شیخ سهروردی
نعمانیم او ز شافعی بود | پیغاره مزن ندا روست سود
شیراز مقام او بسا دور | من هندی و مولدم لهانور
در سکر کلام گه نمودی | آزرده نه اهل درد بسودی
در یاد خدا اگرچه محو است | از سهو نگفت بلکه صحو است
یکدل تو ازین فسانه بس کن | بنده شو و ترک این هوس کن
من نامه خود سیاه کردم | من عمر همه تباه کردم
خسرو که ز دهلیم چه پیر است | چه خواجه نظام دستگیر است
بابای مرا چو پیر داند | دانم که بنور ریم نشاند

من بر سر خاک او رسیدم چون ذره بمهر او طپیدم
او در من خسته چشم وا کرد از گنبد خود برون سر آورد
او طوطی هند نام من کرد او دست مرا به پیر بسپرد
این قصه ای بر شه بهادر از بحر ملوک بی بهادر
گفتند که آمد از لهانور چشتی یکدل فقیر مشهور
او کرد بمن عنایت خویش داده شرف از ولایت خویش
هر خلعت خاص آمود ! از فیل و فرس عنایت افزود !
بارید بمن ز بحر جوشی مانع شده از گلیم پوشی !
چون دید که این فقیر هندی است شوریده و ناکی برندی است!
آزادگیش بدل نشسته از بند رسوم باز رسته
بابی ز توجهات خود خواند در خلوت خاص خویش بنشاند
در سینهٔ من چو دست آویخت آب تقدیس بر دلم ریخت
از حالت و وجد خود خبر داد افتاد هر آنچه بر من افتاد
افتاد چو شور وجد در هند پیچید بخویشتن شیخ سرهند
نقاره وجد شاه دارا ! بگذشت ز کابل و بخارا !
از حالت درد مند بی درد داند چه که کوفت آهن سرد
دانی چو سماع را برنده ! سازی دل راز خویش زنده !
از حلت و حرمت و اباحت تا نیز دلی به بین براحت
فسق است بظاهر و بباطن حکمش بوجود بشنو از من !
بر دل اگرت حلال باشد مشعر بوجود و حال باشد
بشنو مگر اندکی و گه گاه می باش ز حال شرع آگاه

یکدل نه ذرهِ رسوم بر خیز — تن زن زفسادِ علم بگریز
دیدی که فلک چه بازیٔ کرد — بر خلق چه ترکتازیٔ کرد
برخاسته رسمِ دینداری — بنشست شرع بسوگواری
طی گشت بساطِ گورگانی — مهمان گرفت میزبانی
شد نوع دگر جهان ز احوال — بدتر شده میرود بهرحال
زاغ و زغن کند همائی — بط ماند به بحر ز آشنائی
مسّاح همی کند مسیحی — هر بی نمکی کند ملیحی
جبران شده دم نبایدم زد — قعر است قدم بنایدم زد

(ورق ۸۳ تا ۸۶)

فصل

"چون احمد شاه درّانی در سنه یکهزار و یکصد و شصت و سه بهمرکابی فتح وظفر از دریای اباسین که نصاری انڈس باداِل هندی گویند به فی‌ها پایاب گذشته در شاهدره رسید۔ و میر معین الملک راجه کوڑامل سپه سالار خود را از ملتان طلب کرده حکم مقابلت در داد و پیامی بشاهجهان آباد نوشت و هنگامه حرب اشتغال نمود قصوریان اندرونِ شهر لاهور که بپاسبانی مامور بودند در هتک استاد شرفا قصوری نکردند و راجه کوڑامل برفقا و جر نقار شاهی را شکسته بر لب راوی رسانید و احمد شاه خود بر میمنه رسیده بهکاری خان معزول از میسره کریخته نزد معین الملک رسید۔ و از آنجا کوڑامل بگولی بندوق بیرون لاهوری دروازه بیفتاد و جان بداد۔ میر معین الملک از اینواقعه دهشت و پا دگم کرده بر خود لرزیده مایوس گشت و احمد شاه در گذر چوک نخاس متصل مزار حضرت شیخ کاکو چشتی شهید پزه موج دریا فرزند گنجشکر

رحمہم اللہ برلب مسجد ارادتخان کہ بلنداست نشستہ و متصل مزار شیخ مغفور از مغارق مو لبسران دو منار کلان ساختہ مشاہدہ تا صیل کفاری نمود کہ ناگاہ میر معین الملک باجمعی از خانہ زادان بجواہرات گرانبہا یک کروڑ روپیہ و سیصد حلقہ کمان لاہوری و پانصد بندوق شائستہ و دو صد شمشیر ایرانی و بیست و یک راس اسپ عراقی و یازدہ زنجیر فیل زیر مسجد باامرا دولت مجرا کرد۔

(ورق ۴۴)

بود و باش

"چون مردم پنجاب از ابتدائے سنہ یکہزار و یکصد و پنجاہ و ہشت کہ اواخر محمد شاہ بادشاہ و نواب زکریا خان ناظم لاہور و ملتان بود الی سنہ یکہزار و دو صد و پانزدہ گرفتارِ بلاءِ حوادثِ مولبسرانِ قطاع الطریق بود۔ از دین متین ناواقف گردیدہ و از احکام صلوٰۃ و صوم و ارکانِ ایمان و شنش کلمہ نیز عاری شدہ بودند۔ در این حکومت اطفال بعلّتِ مشایخہ و جوانان بشرب شراب و زنا افتادند و چون رنجیت از طفلی در ابنگی مبتلا بود، خوشحال نامی را بہمیں خدمت مقرب بارگاہ ساخت۔ جمورا نام نیز بہمیں عادت بخود گرفتند و دہان نامی را کہ کوہی بود از اولاد رنجیت سنگھ دیو و سوچیت و گلاب ہر دو برادرانش را ممتاز ساختہ خدمت شبانہ باو تفویض نمودہ و بوٹہ نامی سقای را در اواخرِ عمر سوار کردہ لذایذ جسانی می گرفت"۔

(ورق ۱۰۲)

"رنجیت از آنجا کہ ہمتِ عالی و فوجی جان بناموس دہ ہمراہ داشت۔ در اجتماع مولبسران پرداخت و ہر یکی را بخلعت ثمین و حلقہ ہای طلای گوش و دست و تسبیح ہای

مروارید واسپ های زرّین ستام ایرانی وعده ها بخلف کرد ..... چون موبسران لاهور را که در دوازده کروه الی اچهره و باغبانپوره و انارکلی و میدان میان میر و گنج آباد بود، ویران مطلق و بیچراغ کردند و محله های کهی سوداگران که وجه زکوٰة را بموجب حساب چهل یکی از بدنیتی و بدمعاملگی در طشت های از درست پر کرده بالای آن برنج پخته انداخته درویشان را طلب کرده ملک میکردند، چون قبول نمی شدند ز قیمت آن پرسیده مضاعف میدادند که بخانهٔ ما بکار آید، شما نقد بگیرند. موبسران آن حویلی ها را آتش دند. همه سوداگران مع عیال و اطفال بر سقف ها سوختند و مال واموال شان همه تاراج گردید و مغلیه جلاوطن گردیده جریده بی زاد در اجلهٔ هندوستان و بخارا و بلخ سر نهادند، همه ساکنین، لاهور گروهی بشاهجهان آباد و گروهی در لکهنؤ و دکن و حرمین الشریفین و کابل و پشاور و قندهار منتشر گشتند". (ورق ۱۰۰)

"رنجیت بموجب اشعار مراسلات محمد عاشق از اولاد عبدالله صاحب انواع فقه و محمد سلیم عالم متورع و میر امیر بخش مشهور ننهو شاه از رؤسای لاهور و شمر و مهر محکم از قوم باغبان نوکوٹ که بواب ابواب لاهور و داروغه مستقل هر سه حاکم بود، بافوجی از نهنگان خونخوار پانزدهم ماه صفر سنه یکهزار و دوصد و پانزده و نیز پانزدهم خورداد ماه الٰهی سنه یکهزار و هشتصد و پنجاه و شش بکرماجیت از لوهاری دروازه داخل و باشاره رؤسا هر سه حاکم گریان از قلعه مبارک بر آمده فرار کردند" و رنجیت خود در خدمت محمد عاشق و محمد سلیم شتافته انواع تسکین در مین مرحمت گشته، مهر محکم را از حلقه طلاء و جاگیر نوکوٹ وغیره راضی ساخته در ترمیم قلعه و فصیل شهر و شالامار که تمام منهدم شده بود، همت گماشت. مردم لاهور از اهل کسب را که از مدت مدید در بیکاری و قرضداری مضمحل شده نفس شماری می کردند بامانی تازه در قالب دمید و

شبانگاه که بنوبت در هر محله بندوق بدست بوده شب بسحر آورده از خوف دزدان روز نمی آسودند در مهد غفلت باستراحت پرداختند۔ رنجیت فیل سواره بعد هر هفته بسیر اسواق صره های ده ہزار روپیه بدست بر آمده بر عایا می انداخت و هر یکی را بلباس سفید و عمارات بیوت و دکاکین باسلوب خوش مو کد می شد۔ و تمام دزدان مو بسر چوق در چوق آمده نوکر شده باسپ و سلاح و دوشاله گرانمند و اسپِ ولایتی و حلقه طلا ممتاز گردیده باعثِ امن و امان خلق اللّٰہ شدند و ترتیبِ دفتر بوضع ولایت پسندیده هر یکی از اهل قلم را بقلمدانهای سیمین و خلعتِ ثمین و مشاهره کثیر ارجمند ساخت۔ جمله اهلِ پیشه سرگرم کار بخوش پوشی و گرم جوشی و عشرتِ لیل و نهار متعود شده شکرانه ها بدرگاه کردگار گزاردند"۔ (ورق ۱۰۱)۔

کشمیر

"کشمیر بادشاهان را گلی است عشرت فزا و درویشانرا خلوت کده ایست دلکشا و چمن های خوش و آبشار های دلکش چندانکه نظر کار کند سبزه ایست و رد آبهار وان و گل سرخ و بنفشه و نرگسِ خود رو صحرا صحرا گلهای انواع و ریاحینِ اقسام ازان بیشتر که در شمار در آید۔ بهترین شگوفه بادام و شفتالو است بیرون کوهستان۔ ابتدای شگوفه وغیره گلها در اسفند آرند ماهِ الٰهی میشود۔ و در ملکِ کشمیر از اواخرِ فروردین در باغات و شهر انجام شگوفه بآغاز یاسمن کبود پیوسته است۔ و عماراتِ کشمیر همه از چوب است۔ دو آستانه، سه آستانه، چهار آستانه میساز دو بامش خاکپوش کرده بالا لاله چوغاسو می نشانند و سال بسال در موسم بهاری شگفته و بغایت خوشنما است۔ و این تصرف مخصوص اهلِ کشمیر است۔ و یاسمن کبود در باغات فراوانست و یاسمن سپید که اهلِ هند چنبیلی گویند بغایت خوشبو می شود۔ و قسم دیگر صندلی رنگ است۔ آن نیز بغایت خوشبو و این مخصوص کشمیر است۔ گل سرخ چند قسم بنظر

در آمده لیکن بسیار خوشبو و سرخ و اعلی و دیگر صندلی است۔ رنگ و بولیش در غایت لطافت و نزاکت از عالم گل سرخ و بوتراش نیز بگلِ سرخ مشابه و گلِ سوسن دو قسم می باشد۔ آنچه در باغ است بسیار بالیده و سه رنگ و قسم دیگر صحرائی، اگرچه کم رنگ تر است غالباً خوشبوی گل جعفری کلان خوب می شود و بولیش از دماغ او می آید۔ بوتراش از قامتِ آدمی می گزرد لیکن در بعضی جا سالها وقتی که بکمال رسد و گل بیگردد ء گرمی پیدا می شود و برگلش پرده از عالم عنکبوت می تند و صنائع می سازد ۔ مرتبه اش را خشک می کنند و گلها که در ییلاق کشمیر بنظر در آمده از شمار بیرون است۔ آنچه نادر العصری استاد منصور نقاش شبیه کشیده از یکصد گل متجاوز است۔"

(ورق ۱۶۱)

انتخاب از بیاضِ یکدل

(۰)

"وچون سرشتِ مرا از غم کرده اند، از عهد صبا که مادرم در هجر پدرم که روانهٔ پشاور بودند و با مرزائی خان ناظم کابل در کابل و فضل احمد پیرزادهٔ نقشبندی مجددی پیر ابدالیان صحبت داشته و چیزے آورده یادرم مرا بمکتب میان فضل الله از قوم خوجه فرستادے و او در خانهٔ بھوانیداس کلال و بشن سنگھ کلال نشستے هر بھگت که مرده و دھرم سنگھ و جیت سنگھ و نهال سنگھ و گلاب سنگھ وغیرهم بخواندے من غریب ترین مردم و نیز مسلمان بودم اما میان فضل الله مرحوم بحرمتِ جدّم حرمت کردے و قرآن شریف. بر قرآنِ غلام محمد پدرِ غلام علی بن دوست محمد خوانده شد مادرم بمحنت و مشقت سه روپیه را قرآن شریف از امام بخش حافظ بن مولوی لطف الله خطاط بن عبد الهادی گرفته داد و آن تا حال موجود است. مرا چیزے می آمد و چیزے نمی آمد سخت لاچار از ذهن نارسا بودم و مادرم برائے خواندن من دعاها کردے و سر برهنه نمودے و مرا چون مرض آمدے جاروب بوئے سر در پاخانه از دیوانگی دادے۔ بیگم بی بی و حبیب الله و قادر بخش و رکھی وغیرهٔ خواهران و برادران شدند اما هیچ کسے نماند الا من چون مادرم فقیره بنتِ عصام الدین بن عصمت الله بن محمد رضا و اکنون برادر مادر من حاجی امام الدین که بجدّه بلیست و پنجکره وهی مکّهٔ معظمه مدفون است و پسرانِ او محمد مکّی و حاجی احمد موجود اند زنده باشند و مادرِ مرا رحمت النساء بنت جیوا بود و مادرِ مادرِ من قرآن خوان و مادرم صابره و محنت کشیده و سخیه و کریمه و رحیمه و خاشعه بوده است بر من عاشقه بود. مرا پرورش داد من او را در آسیاسای شریک

شدم دو دہفدہ ساگی مرابدختر محمد بخش صحاف بن رحمۃ اللہ بن جا محمد بن رزق اللہ
دامن چاک کرد او با من بیست سال زیستہ دختران و فرزندان برآوردہ عطائے حسین
و عطاء الحق و غلام محی الدین و فاطمہ و امۃ الزہرا آمدند وچون امۃ البتول جیاں بی بی
قرآن خوان و صالحہ کو خدا ہمفتی خانہ شد اکنون از آن باغ گل رعنا نور چشم فلذۂ کبدی
سرمایۂ حیات مستعار مقبول اللہ احمد برخوردار نور احمد چشتی طال عمرہ و زاد قدرہ و غفر
ذنوبہ و ستر عیوبہ و حرسہ اللہ تعالیٰ من جمیع البلیات و الآفات سال بیستم دارد کہ
ہفتم ذوی الحج ۱۲۴۴ روز چہارشنبہ ولادتِ اوست الٰہی بعمر طبعی و صحت و اتفاق
برادران و سنتِ سنیہ رسول علیہ السلام سلامت بادو او را اللہ تعالیٰ محتاج نکناد و من
از وے راضی ام خدا از وے راضی باد و آنچہ از وے بمن رسیدہ بفحوائے خیرہٖ و شرہٖ
من اللہ تعالیٰ آن خیر و شر را فعل حق میدانم پس اگر بر وے برنجم بر فعل حق انکار کردہ
باشم کہ اللہ تعالیٰ بر ہمہ چیز قادر است الٰہی تعالیٰ او را راہ ہدایت و صحبتِ شرفاد
علماء کرامت کناد بالنون و الصاد و بشاہ کربلا و ابغداد و النبی و آلہ الامجاد آمین آمین
آمین یا رب العلمین در مکتب لاہوری منڈی در ہفدہ سالگی بطفلان چہ پڑھ گان ہندو
نژاد تعلیم دادہ ترجمہ نویسی و کتابت و شعر و سخن و شور رشے در دل از آن آفتاب منظر
در دلم پیدا می آمد شدہ شدہ بمالیخولیا کشید من دامنِ قرآن شریف مستحکم گرفتہ غلامی
درگاہ عرشی اشتباہ حضرت قدوۃ اللہ مخدوم علی گنج بخش ہجویری برگزیدم و شام ہر روز
بلاناغہ چہ ابر و چہ صفا و چہ گل و لا و چہ تاریکی و روشنائی و عشا در حرم اقدس خواندہ در
خانہ می آمدم و از ان باز خیر شاہ سید طیب در چوک جھنڈہ فصد ما الجبن و شش ماہ
بادر بخبویہ و اسطو خودوس ۶ ماشہ دو وقتی می فرمود تا اللہ تعالیٰ ببرکتِ قرآن شریف
و حمایتِ جناب ہجویہ و بغداد رحمہا اللہ نجات داد و من گذران خود میکردم و پرورش
بی بی در پیش بود۔ مادرم وفات کرد پانصد روپیہ خرچ کردم و خدمت بیماری ششماہ

کردم او بر من بسیار راضی رفت و برخوردار نوراحمد زائیدۀ او شش ساله بود که مادرش وفات کرد محمد بخش مجلدی با من آنچنان کرد که چگویم مرا ایزدی حمایت نگهداشت چاتم با من جان داده و مجلدی او را معشوقۀ من قرار داده آخر گذشت آنچه گذشت سخت حیران شدم بعد از آن زنی عظیمۃ النساء نام مرحومه والدۀ برخوردار محمد علی طال عمره در حبالۀ نکاح من آمد و باز چون آن زن وفات بعد از دو سال کرد بیگم نام از موچی دروازه آوردم و بازالحال بخانه در بی بی مادر برخوردار محمود علی طال عمره اکنون دو سال است که الله تعالیٰ تقصیر معاف کرده من از خانه خرابی آزار سخت برداشتم اما حمایت ایزدی بود از لاهوری منڈی بیست سال است که برخاسته آمدم و تعلیم امرناته کردم و باز بدری و پران پسران کدارگرو باز سفر شاهجهان آباد و باز آن کدارو با من بدی ها کرد و امرناته شورشیه در زبد و دیگر گونه شد و او را مرض واهمه و وسواس و فقیری و آزادگی دامن گرفت و بعد از آن من خانه نشین شدم و شادی برخورداران نصیب من شد''۔

روز محرم شریف ۱۲۵۰ھ یعنی دهم رتن سنگھ که عدالت لاهور تعلق او ست بحال مسلمانان سخت آزار رسانیده که سبیل های لاهور را تاراج نموده و مردم مسلمین را زد و کوفت آنقدر شده که بعض را جان هم رفته باشند۔ و مصادر بسیار رفته و گامی شاه نیز تعزیه تیار کرده بود مثل سابق او را گرفتار برده تعزیه اندرون قلعه طلبانده و او را آنچنان زد و کوفت شده که خاطر او را مشوش ساخته حق تعالیٰ امان بدهد مردم لاهور را شربت که تیار بود، سبوچه ها را و خم ها را شکستانیدند و سخت شورش در لاهور افتاد۔ روز دوم مسیح الدین قاضی ضامن شده، والا نه رنجیت سنگھ حکم داده بود که چون منادی کرده بودم و حکم عدولی کرده او را در خار و خسک انداخته معه تعزیه بسوزانند''۔

عید در لاهور:

"چون درین روز با سرکار والا کوتلي را تنجیم بر اوقات اقبال نموده رونق افزاي کوهستان بودند، مردم راود لاهور عید الضحی نیز بخوبی شده بود، کاکلیان هرچند نکاهش در تنگناي تعصب نمودند، اما پیشرفت نشد"۔

گرانی در لاهور:

"در لاهور از بسکه باران بالکل نشده گرانی غلّه شد ۔ سیزده آثار شده بود، اما حاکمِ وقت بشدت شانزده آثار حکم داد ۔ مرد و زن بسیار خراب می شدند"۔
"جاي پریشاني آدم ها متعین کنانید که سوای پنج آثار برنج شخصی را یکدانه فی روپیه نرسد، مردم که خو کرده یک من یکمن نیم برنج و دوازده آثار پخته روغن زرد بودند بجان آمدند، تمام دیهات پنجاب و لاهور و اطرافِ سر و کشمیر (ویران) شده و گرانی غلّه بدرجه ده آثار گندم رسید و بموجب ارشادِ سرکار در لاهور منادی بیست آثار شد"۔

سیلابِ شدید:

"چون درین ماه سیلاب بدرجه کمال رسیده، آزاد بسیار بمردم کشتِ کار رسیده ۔ بسیار خانه ها را بسیلاب ویرانی رو داده و بسیاری را آب به بیخ داده و مردم مزارعین که در خریف به بلای امسال باران گرفتار بودند بلب جانی رسیده بودند ۔ درین ماه که جو ها را بریده خرمن کرده بودند، یک بارگی خرمن شان را آب پاک برد"

وبای سخت در لاهور:

"وبای سخت در لاهور روز پنجشنبه اوّل جمادی الاوّل ۱۲۶۱ھ پنجم جیٹھ ۱۹۰۲ ب

از جانبِ کابل و پیشاور بعد از ہجدہ سال کہ در سمت ۱۸۸٤ افتادہ بود داخل شد، اول ابتدای آن از گرد بادی سخت شد سرخ۔ من ہم دیوانہ وار در کنج خمیدہ نشستم و بہانہ ماندگی بدست گرفتم تا از فاتحہ مردمان امان یافتم۔ و دواسوای پلپل دراز و مرچان سیاہ و اجوائین و ہلیلہ سیاہ و زرد نہ کردم، حائیدہ خوردم۔"

ضعف در حکومت سکھہا:

"امروز از ضعف حکومت معاینہ شد۔ کہ در شہری رفتم و دیدم کہ یک سپاہی سکھ بر اسپ سوار است و دوان می آید۔ مردم ہراسیدند پیش قرلوس او صرہ پنجہزار دینار بود کہ از مچھی ہٹہ از دوش صرافی دو گھری باقی ماندہ برداشت و اسپ دوانید۔ و کسی باو نرسید در چار سوی گمتی نشستہ بودم، بالای چوکی، ہمراہ یکی گفتگو میکردم کہ ناگہان آن سوار گذشت و بدیوار مسجد در خورد و صاف اسپش صدمہ خوردہ، افتادہ باز خیال کردم کہ سوارش مردہ باشد، آن لنگور وضع باز استادہ فی الحال بر اسپ سوار شد، و دستارش ہم نہ بست دو آدم فراہم شدند کہ تیار داری کنند چراکہ تا حال شخص از غوغائیان نرسیدہ بود۔ گفت کہ این بچہ مرا بد چیہ۔ چون مردم دست کردند، سخت گران یافتند گفتند کہ تو از اسپ فرود آمدہ خود بگیر۔ درین اثنا دو بچہ گفتند کہ این دزد است و این صرہ مبالغ است کہ زدہ آوردہ است۔ آن سکھ فی الفور اسپ را عنان گرفت و دوانید و صرہ را باز گذاشت۔ درین اثنا مردم دوان دوان بسیار رسیدند و صرار ادر یافتند و خیلی فرحت اندوز گشتند۔ درین اثنا خدابخش کوتوال رسید ہر چند تا بہاٹی دروازہ دوید سراغش نیافت ۔ مردمان بر ضعف سلطنت خیال کردند و بسیاری تعجب رو داد۔"

آئینہ تاریخ

"یاد دارم کہ چون کشتی مغلیہ و سلطنت چغتائیہ غرق شد و برہم خورد

جد شریف بنده و اجداد تمام شرفا و سادات عظام وعلمای کرام وغیره هر گروه سفید پوشان قلم پرست چه هندو چه مسلمان جامه سوگواری پوشیدند از آنکه مسلط شدند موبسران یعنی سکهان دهقان مزاج، زانوبرهنه و جهتکه خور و آتش زن و دزد۔ شده شده سلطنت شد۔ آن بزرگان بعض روانه شاهجهان آباد و حیدرآباد و لکهنؤ و مکّه و مدینه و مصر و روم و شام و بعض بخراسان و بهاولپور و حیدرآباد و سنده و آنانی که قوت نداشتند و شرفا بودند، در همین لاهور بگوشه نشسته بعضی بافندگی و بعض صله چینی و بعضی معماری و بعض سبد برداری و بعضی معلمی و بعضی تره فروشی و بعضی گدائی دیهات، همین طور خلقی افتاده ماند و حیران و پشیمان تا آنکه دو سه جهان غم از جهان رفتند۔ آن تسلط سکهان برای ایشان عزرائیل شد۔ و چون فرزندان ایشان پدر بدر شدند خوب سکهان کردند۔ "واهگورو کا خالصه۔ واهگورو جی کی فتح" و جهتکه و ندادن اذان و مسماری مساجد و بعده و شنام غنا زیر دهنک اسلام وغیره، بی عزتی و بی حرمتی اماخو کرده زمان و وطن شد۔ بعضی در نوکری این و آن مشغول شدند۔ طوری که اجداد ماخو بمغلیه شده بود، همان طور بسکهان گرفتیم و طوری که آفات آسمانی حکومت سیکهان برای اجداد ما شده بود۔ همان طور آفت جان برای ماحکومت انگریزان شده۔ شب و روز در همین غم می باشیم۔ اما امید که فرزندان ماخو گیر حکومت انگریزان خواهند شد۔ اما مارا غم سکهان ضروری باشد۔ بعد ازان الحال از ابتدای ۱۲۵۰ھ آفت نزول در پنجاب کرده والحال ۱۲۶۳ھ شب و روز زیاده تر است۔ دیده شود که مردم چگونه شوند و احوال خلق چگونه گردد۔ الحال معلوم میشود که دلیپ سنگه را از قلعه معزول و دیناناته اسیر و تیج سنگه نیز گرفتار و چوتره دوکانهای لاهور تمام مسمار در این صورت قیامت در لاهور برپا خواهد شد۔ و آنقدر غلغله خواهد شد که چگونه بعد از آن انگریزان کار بحکمت خواهند کرد۔ و بعد از بند و بست مجاشب

قسمت لاهور شده دیده شود که چگونه شود- الحال هر طرف که انسان برود حکومت انگریزی است - جای فراغت نیست - الّا در ایران و یا در عرب خاص مکّه و مدینه و بغداد و کربلا و نجف اشرف و درین ولایات خواری شد"۔

شهر لاهور عجب رونق داشت	جلوه قدرت حق الحق داشت
ناگهان چشم بدش ویران کرد	جا بجا ساکن او حیران کرد
لولیانش همه ایران آشوب	داده از حسن بجنت جاروب
حسن بی پرده کشتانی ها	ملک دل کرده بویرانی ها
آه من کشته هندو پسران	باز غلمان جنان موبسران
چشم شان فتنه بکشمیر انداخت	در دل یکدل ما تیر انداخت
کوچه و سمت کمانی غماز	گوشه زلف درازی ملناز
عشق و غم هر دو نصیب این شهر	حسن و عشق هر دو رقیب این شهر
یار باین عیسویان ناجنس اند	فرد وضع اند بظاهر انس اند
وعده تا روز قیامت کردی	بسیر فوقیت شان از فردی

انتخاب از تحقیقاتِ چشتی

(عُرس حضرت مادھو لال حسینؒ)

...... چنانچہ آج بتاریخ سلخ جنوری بروز سہ شنبہ (من ۵۹) حضرت کا عرس مبارک بتقریب بسنت تھا اور یہ کمترین بھی آستانہ بوسی کے واسطے مشرف ہوا تھا۔ کیا بیان کروں کہ کس قدر انبوہ، یکہ، بگھی، ہاتھی، گھوڑا کا تھا۔ دہلی دروازہ سے تا شالامار برابر خلق اللہ تھی اور تل پھینکا زمین پہ نہ گرتا تھا۔

آج بندہ کو بھی یہاں سے ایک عزت خداداد حاصل ہوئی اور وہ یہ ہے کہ آگے چند سال سے مجھ روسیاہ ہیچمیرز کو بروز عرس مبارک حضرت پیر علی گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ان کی جناب سے دستار گوہر بار کہ جس کو سروپا کہتے ہیں، ملتا ہے۔ آج اس جناب مستطاب سے بھی فدوی کو معرفت حسن علی شاہ سجادہ نشین دستار بسنتی اس وضع سے عطا ہوئی کہ حضرت سجادہ نشین حضرت کی خانقاہ کی پائنتی کی طرف تشریف فرما ہوئے اور براہِ نوازش اول دعا فرمائی۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرماویں گے اور یقین کلی ہے کہ اس سال میں اگر بخت یاور ہوئے تو ضرور فرزند ارجمند باعمر دراز مجھکو عطا ہوگا۔

الغرض بعد دعا سجادہ نشین صاحب، نذر پیش کردہ فقیر قبول فرمائی اور ہزارہا خلق اللہ میں دستار بسنتی مجھے پہنائی اور میں نے فخرِ دوجہاں سمجھ کر اپنے سر پہ باندھی۔ علاوہ بر آں یہ ایک اور لطف ہوا کہ اس وقت بعد دعا سجادہ نشین صاحب نے حضرت کے خزانۂ موجودہ سے مجھے تبرک اس طرح سے عنایت کیا کہ میں نے اپنا دامن پھیلایا اور انھوں نے پھول اور کوڑیاں وغیرہ ملا ہوا میرے دامن میں ڈالا۔

جب گھر میں آکر دیکھا تو سوائے ریوڑی وگل وغیرہ کے تین آنہ کی کوڑیاں اور پونہ آنہ یعنی تین پیسے ڈبل اس میں سے نکلے۔ اب میرا یہ ارادہ ہے کہ اس کے عوض میں ایک چوانی خریدوں اور گھر میں تبرکاً رکھوں۔ پھر جب مجھے اللہ تعالیٰ فرزند عنایت کریں تو وہ چوانی اس کے زیبِ گلو کروں۔

سبحان اللہ! زہے طالع میرے کہ مجھے اس قدر شرف اور عزت مع دستار حاصل ہوا۔ اس کے شکریہ میں کسی دہن و زبان سے ادا کروں:

اگر ہر موی من گردد زبانی!
وزاں رانم بہر یک داستانی!
نیارم گوہر شکر تو سفتن
سر موی ز احسان تو گفتن

مجھے حسب الارادت خود آج وہ خوشی ہے کہ خدا ہی جانتا ہے۔

شجرۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ

مصنفہ: مولوی نور احمد چشتی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے کہ از گنج خفی در عین اظہار آمدی
باہمہ اسمای حسن خود نمودار آمدی
کردی از اطلاق خود در نقطۂ وحدت ظہور
با لباس میم احمد کار مختار آمدی
حسن مجمل را چو از اعیان مفصل ساختی
کسوتِ شیرِ خدا پوشیدہ کرار آمدی
از تجلی جمال خود حسن بصری شدی
ہم چو عبدالواحد ای واحد باطوار آمدی
از ظہور فضل خود گشتی مسمی با فضل
بر سریر بلخ سلطان جہاں دار آمدی
گہ سدید الدین شدی در عشق از راہ سداد
گہ امین الدین امین راز دلدار آمدی
کسوت دلشاد پوشیدی بصد شان و علو
شام بو اسحٰق را صبح پر انوار آمدی
خود ابو احمد شدی با قدوۂ دنیا و دیں
ناصر حق بو محمد بخت بیدار آمدی

گاه بو یوسف شدی و گاه مودودِ جہاں
با چنیں جلد ملبس گرم بازار آمدی
در طوافِ کعبہ ثانی شدی حاجی شریف
ہم چو عثمان مقتدای حرب ابرار آمدی
از پی ہر مستعین کردی معین الدین لقب
رحمتِ ہندوستاں چوں طور بر نار آمدی
مرکزِ عالم گرفتی در محیط وصل وجود
عین قطب الدین شدہ بر چرخ سیار آمدی
از کمال نور خود ہم چون فرید الدین شدی
صد ہزاراں تلخ کاماں را شکر بار آمدی
نام محبوب الٰہی کردی و با عزّ و ناز
در نظامِ دو جہاں سلطان و سالار آمدی
کردی از رخسار خود روشن چراغ دہلوی
در کمال از علم علامہ گہربار آمدی
در شبستان دو عالم خود سراج الدین شدی
ہمچوں علم الحق بہ علم الدین خبردار آمدی
کسوتِ محمود را چوں کردہ گشتی جلوہ گر
خود جمال الدین شدہ با حسنِ رخسار آمدی
با ہمہ خلق حسن مثل حسن کردی ظہور
واہ واہ شیخ محمد نیک کردار آمدی

از پیٔ احیای دلها کرده ای یحییٰ لقب
قطب وار اندر مدینه قطب پرکار آمدی
بر سرِ کوه طور دل مثل کلیم الله شدی
بر تماشای تجلی محوِ دیدار آمدی
چوں نظام الدین شدی اورنگ زیب معرفت
در نظام سلسله لولوی شهوار آمدی
اے که از فقر اتم کردی لقب فخرِ جهاں
آشکارا رحمتِ عالم پدیدار آمدی
نازنین گردیده ای، همچوں نیاز احمد شدی
واجد و واحد شدی با زیب و بازار آمدی
گه غنی گردیده مسکین نام خود بنهاده ای
از غنا مسکیں نواز و گرم بازار آمدی
با تجلی های شاهی فیض حق گشتی سمر
سجده گاه جن و انس و مور هم مار آمدی
نور احمد را تسابق داده با فضلِ عمیم
خاکِ راهِ چشتیاں کرده با سرار آمدی
با کمالاتِ شیون و جمله اسمای صفات
آخر از فیض اتم مختار سرکار آمدی
نور احمد متحد با قلبِ خود اقرار کرد
فیض للهی چه‌ بُنی در نفحه و نار آمدی

؛

انتخاب از یادگارِ چشتی

○

"مولوی غلام حسین صاحب!"

"اور دہم صفر کو شہر لاہور میں محلہ چابک سواراں، مسجد چینی میں عرس مبارک جناب مولوی غلام حسین صاحب چشتی کا ہوتا ہے۔ یہ مولوی صاحب بڑے معارف آگاہ اور صاحبِ عبادت و ریاضت تھے۔ پچیس برس حضرت نے استراحت نہیں فرمائی اور سید المساکین اور فنافی الحسین تھے۔ صاحبِ رقت ایسے تھے کہ اگر کہیں نام سرورِ دوجہاںؐ یا حسینؑ آجاتا تھا تو عالمِ گریہ میں بے ہوش ہو جاتے تھے اور کرامات ان کی ہزارہا مشہور۔ سب رؤسائے پنجاب ان کو قبلہ و کعبہ جانتے ہیں۔

اس عرس میں نان حلوہ تقسیم ہوتا ہے اور چراغاں خوب روشنی سے ہوتی ہے۔ رؤسا فقرا سب حاضر ہوتے ہیں اور اس روز نذریں بھی چڑھتی ہیں اور گھنٹہ دو گھنٹہ مرثیہ خوانی بھی وہاں ہوتی ہے۔ چونکہ اس حضرت نے ۱۲۶۰ھ یعنی یک ہزار دوصد و شصت سال ہجری میں اپنی وفات پائی ہے لہٰذا خلقت بہ کثرت جمع نہیں ہوتی اور دس گیارہ بجے تک مزائرین سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے!"

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اہم دستاویزات کے عکس

بہادر شاہ ظفر بادشاہ کی طرف سے مولوی احمد بخش یکدل کو خطاب فخر الشعرا کے ساتھ عطا کی گئی مہر کا عکس

عمل: بدرالدین مہر کن!

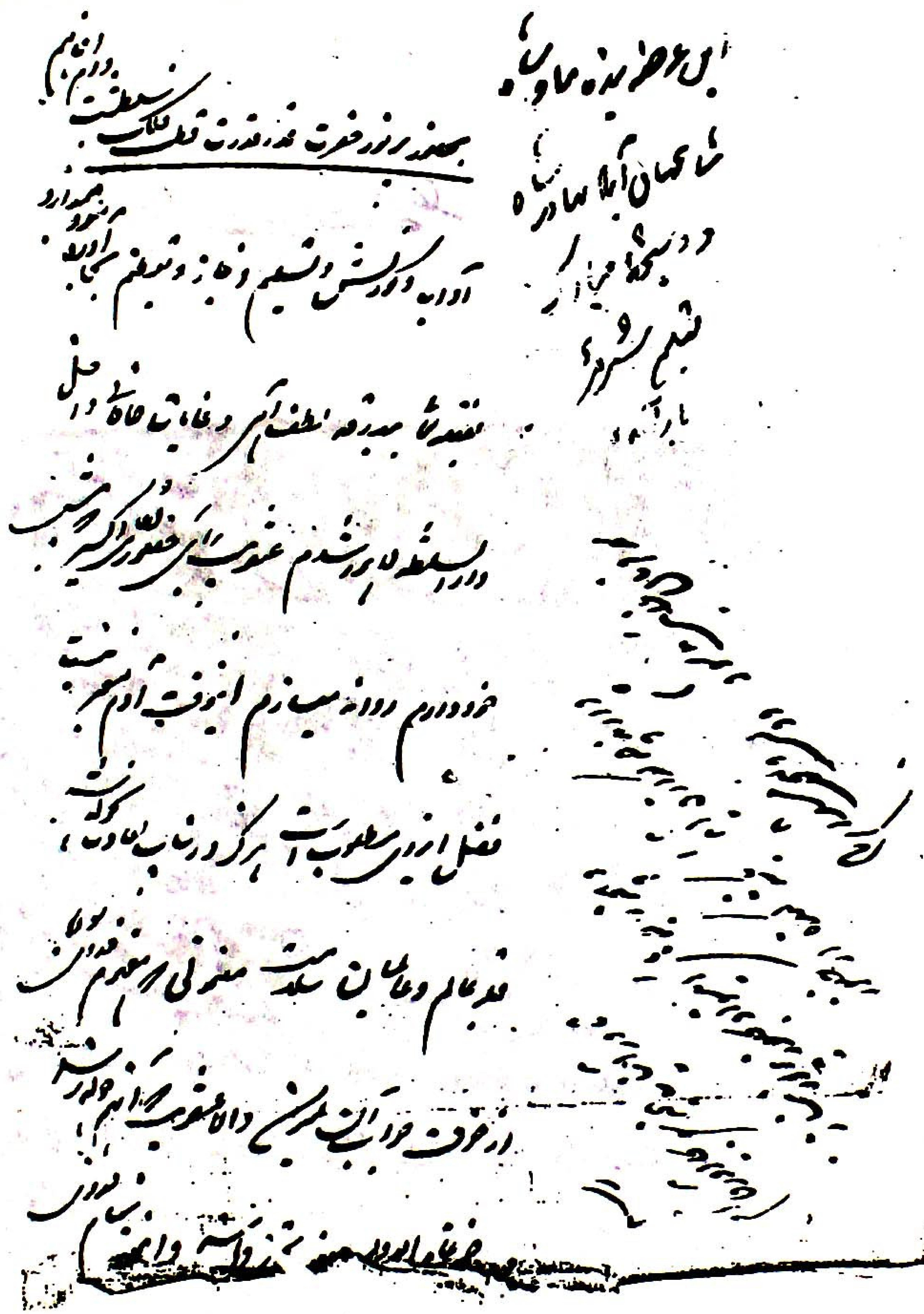

مولوی احمد بخش یکدل چشتی کا خط بہادر شاہ ظفر بادشاہ کے نام

مشق سید زین العابدین

عرضداشت بدرگاه خورشید اشتباه سلطانی و جناب شهنشاهی سلیمانی فقیر احمد بخش میرساند

چون ممالک پنجاب اخبار متعرض شده زحمت دارالسلطنت لاهور گذشته بود و از آنجا [illegible]

تا یکسو بموجب [illegible] و آن [illegible] اخبار ملصق گردید و از آنجا [illegible]

که باز دوار [illegible] از تدبیر [illegible] در آن سرزمین [illegible]

[illegible] حکم [illegible]

[illegible] پابوس [illegible] درآمد [illegible] کار [illegible]

[illegible] داکر [illegible] میشود و باز [illegible]

را امید [illegible]

مکتوب مولوی احمد بخش یکدل بنام بهادر شاه ظفر بادشاه (باب چهارم)

خیالاتِ دانش : مولوی نور احمد چشتی (بخطِ مصنف)

تن گوش گشته طنین طنطنهٔ عظمت صاحب دولتی باین مرتبه رسیده
و زینت تصنیف در بیان اوصاف دین گستر ناظم قسمت
لاهور است توجه جوان بختی که با جداثش اگر اعظم بیلاد طریز
ماضیه بوده ندی دقایق پادشاهی و لصفت الزرای خورده
دانش استفاده نموده ندی فکر صواب انجامش نسخهٔ انیست را
مطابق رقم تقدیر ... به نیرو جوانی و به تدبیر پیر سه نقیر
سمین صاحب بهادر دام اقبالهم ا بعد فقیر بی تزویر راجی الی رحمت الله
الصمد نور احمد متخلص چشتی عفی عنه لاهوری بن مولوی فخر زمان
فضیلت پناه یکدلی آگاه فخر الشعرا مولوی احمد بخش یکدل صاحب
دام القاهم بخدمت مشتاقان نذر برده عرض نموده که تشبیه ایستی
مبیاید که بتاریخ دهم ذی الحجه ۱۲۶۹ سنه یکهزار و دو صد و شصت و نه
هجری مطابق با نوزدهم ماه ستمبر ۱۸۵۳ سنه یکهزار و هشت صد و پنجاه و سه
عیسوی بمکان خود که واقع محله چابک سواران متصل مسجد طلائی

بقیه

منیه نواب بیکبار یخان مرحوم است نشسته بودم مجالس
رنگین که از تصانیف سعادت یار خان مغفور است بدست
میداشتم چون جزوی از آن به جلیسان خود بیان کردم همه دست
استبداد بدامنم زدند که بعد فراغت نسخه نو طیار شود که بدنیا
یادگار بماند همان وقت بروز عید سعید اضحی دیباچه را قلمبند
کردم و شروع به مطلب نموده نام این مزخرفات خیالات
دلکش نهادم و بخدا سپردم امید از مستبصران والا
گهر آنست که چون صیادان بادیه ناکامی آهو گیر نشوند و کذبها
صفا دودع ما کدر خیال دارند وبالله التوفیق وبه نستعین

اری الاحسان عند الحر دینا   وعند النفس منکوسا ذما
کماء المزن فی اصداف در   وفی فم الافاعی صار سما

بیاض یکدل: شماره ۲؛ بخطِ یکدل

بسمه سبحانه و تعالی شانه

بر دانایان خرد و خردوران سخن پوشیده نماند که فقیر احمد چشتی
بندهٔ خداست بیچون و بیچگون جلت آلاؤه و امت احمد است که و ما ارسلناک
الا رحمة للعلمین در شان اوست صلعم و دوستدار چهار یار باصفاست که ابوبکر
و عمر و عثمان و علی است رضی الله عنهم و دوستدار اهل بیت رسول خدا
و فرزندان شبیر خداست و محب دوازده امام است رضی الله عنهم
و مرید غوث الثقلین است محی الدین عبدالقادر جیلانی و خادم درگاه
عرش اشتباه مخدوم علی گنجبخش هجویری رضی الله عنهما

وشاگرد استادی محمد شکسته‌نویس خان ... افغان عثمانی است

سلمه الله تعالی و از عرف خسنی است و فرزند مولوی غلام حسین خسنی است سلمه و دیگر

وی پور مولوی محمد ابراهیم خسنی است ... پور مولوی ضیاء الحق والد من

خسنی وی پور مولوی محمد عالم خان ادرنگ آباد است رحمهم الله تعالی و فقیر کمترین پور الحق خسنی

عمره الله نیز امید رهائی است که برده ذلفقار اهل سنت و جماعت در

محبت اهل بیت رسول خدا درجه فنا دارند معتصم خواهد بود نسبه و دیگر

۱۲۹۹ و امروز که اول غره عاشورا ابن محرم الحرام روز چهارشنبه شب جمعه

دهم ماه جمیله ... در لاهور بنده راقم اجمالی نوشت احوال

دیوانِ چشتی: مولوی نور احمد چشتی؛ بخطِ مصنف

ردیف الجیم الفارسی

دیکھا جو صورتِ نگارِ تیری کو آئینہ دنگ ہے
ہستی ہو یار کی خطِ لب پر نگاہ بیچ

بیت الدعا ذکر یار سے کر کے دل روشن کرو
اخلاص کرنے سے آخر سب کا دل سنگ ہے

کس کی طاقت ہے کہ جو ان تیر ابرو سے بچے
واعظ اس شوخ کا گریبان چاک ہے

رات کو محفل میں تیرے ناز و ادا کی ہے دھوم
یار کا موتی چمن کے بیچ گلشن رنگ ہے

جشن ناسوتی پر خاطر بہار میں سرسبز خط
کس قدر تنگ ہے یہ بادہ گلرنگ ہے

جشن لا کہ مبارک کے دن بھی رنگ رنگ ہے
نور ہو روز تیرا ناز سے جنگ ہے

کوہ غم یار کا اس پہ اٹھا یا ہر گھڑی
تو بھی خندہ ہنس یار کا دل تنگ ہے

جلوہ ابر سیاہ نکلا ہے بادہ کا جام
چاک جانا دل کی پھانسی گیسو رنگ ہے

یار بیٹھے ابرو کی خمدار یہ بادہ کا دھ
شکل شمشیر کی چشتی نظر تنگ ہے

بادہ جو شب چشتی لگ گئی در بار
دل دنیا کا آب یار کی لو رنگ ہے

از کمان ابرو مژہ پئے قتل کس کے ہیں مژگان　　جادو پہ قربان تری مجھ کو ہی منظور ہے

ہی بدلا حال حسرت جان گزا ہجر سے

دیکھو حسرتی کی لطافت سے عبارت رنگین

ردیف الدال المہملہ

احوال بیقراری ان صنم نہ دید　　در گفتگوی حسن خودم ہوں عجب کرشید

سب کام اپنے وار کے ہیں اس کے اختیار　　ہاں کی قید قید حد ہے شدید

گراں ہووہ نہ آیا تو زنہان سے کل شرع　　ہر روز وصل و شرح کا گزرا ہے عید

تدبیر کا ہی بیعت کرسی و عرش فرش سے　　جنت و صلوات کر بدہی سید شہید آخر شہید

دیکھ حال اپنے کا جا تماشا ان خوش ہو کرون　　از فوز ہر معاودہ ہمن ہر شیر ید

مت مار مجکو زلف پریشان دار شوق ہین　　سنگ کشتہ ہر پریشاں کمال از مرت مزید

حسرتی ست ہی ہی تر اصدہ انشا و لکہ

خوش اسنے ہو رسیدان ہی کشش سے جدید

تحفۂ بیدل بخطِ مصنف کا ایک ورق

الی رحمة الله تعالی احمد بخش الذی تخلصه المشهور بیدل ابن غلام حسین بن محمد ابراهیم
الحنفی البخشتی الاورنگ آبادی ثم اللاهوری اللهم نور قلبه بنور معرفتک واشغله باشتغال
جمالک وجلالک وثبته علی صراط المستقیم واحسن الیه والی ابویه ولمن نسب الیه چون بر عمر جوانی
روزگار و سوانح زمان چندی از حالات جلال و جمال و قبض و بسط و احوال شتی کم و بیش
از تحریر طبع نظم و نثری که در بعض اوقات حسب رقم ارتسام یافته بود و از اغراض اشتغال تعطیل
در نسخ صحبت [illegible] دیگر گونه آفات کاتب [illegible] سکر و صحو از سعود است مقارن تدریج بنا بر تهذیب
و تجرید مرتب کرده و معنی بحقیقت اگرچه وقعی ندارد نداشت چه که استحسان صاحب رای کامل
مشغوف [illegible] مرتبه [illegible] خاطر را بنکته غیر اعتداد ندارد ولیکن در اکثر این صنف و صنعت
تتبع کرده به تسمیه اش [illegible] ملامع گرفته و بدین حیثیت وجه از نشئات تبرک اکابر که
الفضل للمتقدم حسب طبع رجحان اش [illegible] از اشیا زبس [illegible] ما عجب که این طرز
بدیع و طور مجدد را اگر عرضه [illegible] تعرض شنید ایشان کرده که هر [illegible] جام
[illegible] ندانم [illegible] کیفیت جوان قطع نظر از تحسین املا که تتبع [illegible]

مساوی هم نیست. و در این مسودات اشتباهات که بعضی بر کراسات متفرقه و بعضی بر ظهر کراریس و حواشی اوراق نوشته شده بسیار بود و بغایت محال کشیده و برخی از اوراق که به مظان اجابت کم مصروف بود مفقود میشد بنابر شوق طالب صرف تصحیح آن دیده لازم آمد لفظ به لفظ هم امید

رسالہ شمسیہ؛ مصنفہ بیکدل کا دیباچہ بخط بیکدل

اسأل الله ان یجعل خاتمته مسک وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون بندہ دولت
مدسی و افتخار العار رکبت راحلة الوہم فی وسع خیالیا بسر نوا صدف شبانان
بدیدہ قبول نظر کنند بیچارہ ان صحف مقال چونکہ دیباچہ اس کتاب کا (مکے نیچے لکھا) بین
تمسع میں تاریخ وار ہی طبع ہو پایا اب بحکم ممدوح شبہ قلم کو مقدار اردو (زبان) میں مہمیز
دیتا ہوں کہ یہ کتاب اسو اسطے قید تدوین میں آئی ہے کہ جو مکان زیارت گاہ دارالسلطنت
لاہور میں اونکا حال ابتدا سے انتہا تک لکھوں اور اس باب میں بہت سی تکلیفیں
اوٹھانی پڑیں گی لیکن تیرا شگفتگی یہ دل آیا ہے کہ لا ای غنچہ فسردہ کبھی بھی ہوا لگے
اور یہ بھی خیال ہوا کہ شاہان سلف کا حال اولاد اونکی تولد اور جلوس اور وفات اور مدفن
کی کیفیت لکھی جاوے اور یہ بھی ہو کہ جو خاندان موبسہ تھی اور خواتین جنہ مکانات کا
مذکور اور عمارات قدیم مسجد اور معابد کا حال مشرح کا کتاب میں آوے تو اس میں
باب بہتری جو تہا باب عجائبات اقوال اور افعال ملکہ کا اور فقیروں کا کہ موجب

تکمیل طبع ہو ترتیب یافتہ [illegible] یہ کتاب نادر نامی باسم گرامی السید شریف فقیر شمس الدین

بخاری تصنیف ہوئی موسوم [illegible] رسالہ شمسیہ معروف ہوئی ناظرین سے التماس ہے کہ مطالعہ کے وقت

خطا اور سہو دیکھیں اور حرف گیری نہ کریں آدمی از سہو و خطا پاک نیست آب روان

بجز خدا کسی نیست والامر بید اللہ

مولوی احمد بخش یکدل کی اردو تصنیف رسالہ شمسیہ کا ایک ورق: بخطِ یکدل

ہاتھی سے اترے میر یکدل دروازہ پر حاضر تھے اور بادشاہ نے آگے بڑھ کر
قدم باہر خیمہ سے رکھا اور بعض فی مرزا نورتن کو در پر استقبال کو
بھیجا شاہ نے خیمہ کی طناب پکڑ کر جس وقت جیسے قدم آگے بڑھ کر
السلام علیکم کہا اور خیر مقدم اور بہت ابھی کہا اور ہاتھ سے
ہاتھ پکڑ کر فرش چبوترہ پر لے گئے اور ایک مسند پر جو بچھا ہوا تھا
بادشاہ نے بہت سی تعظیم اور تکریم بجا لائے سبحان اللہ
عجیب مہمان و عجب میزبان جب محمد شاہ ماہ رخ نے
اس وقت جواہر کو نذر اور درباری نذر دے تو بادشاہ نے
بادشاہ اور سب کو حکم ناصب خلاف کہ یہ تاج جو ہمارے سر پر تھا
آپ کا سر پر رکھ دیں اور یہ تاج جو آپ کے سر پر ہے ہمارے سر پر رکھ دیں
کہ تم ہمارے بھائی ہو اور دستار بدلی اس کا نام ہوتا ہے

لکھتے ہیں محمد شاہ ثانی سبب دوام اپنے اجداد قزلباش سے بہتر ہو کر

بہ حسب کم سنی تھا کہ ایسی باتیں کہ کر گزرا نہ تھا ماندہ شاہزادہ

در پردہ خزانہ

بہت حیدر ایسی حیثیت کی حد محمد شاہ کو کر چکا تھا

مربی بخشی ہے بہادر ایسا داؤ دیا کہ کسی نے فتح کو

دمن میں نہ آیا تھا الغرض دو روزہ بادشاہ سواری سے

داخل قلعہ مبارک کے جہاں آباد ہو گئی بعد قلعہ مبارک کے

اور شہر میں آئین مزید احمد دہ لشکر نوبت جمع

2151